ندیم نامہ

ترتیب دینے والے

محمد طفیل — بشیر موجد

مجلسِ اربابِ فن
لاہور
بہ تعاون
کاروانِ ادب ملتان (صدر)

بار اول ——————— ۱۹۷۶ء

تعداد ——————— ایک ہزار

قیمت ——————— ۵۰ روپے

سید ذاادیب پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر مجلس اربابِ فن رائل پارک لاہور سے شائع کی۔

فہرست

ندیم کی تخلیقات کا انتخاب

نظمیں اور غزلیں

افسانے

فکاہی کالم

حرفِ آغاز

تعریف کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اِس کے باوجود ہم کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ خسّت ہمارا رویّہ ہے اور حق رسی کا ہمارے ہاں رواج نہیں بلکہ حرف گیری ہی حرف گیری ہمارے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اِس اعتبار سے احمد ندیم قاسمی خوش قسمت ہیں کہ اِس کتاب کے ذریعے اِن کے معاصرین بھی اِس تہمت سے بچ گئے۔

خسّت اور حق رسی والے معاملے کو چھوڑیں۔ ایک واقعہ سُنیں۔ سرسیّد احمد خان سے پُوچھا گیا۔ "اگر آپ حضرتِ ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں ہوتے اور موضوع مسئلہ خلافت ہوتا تو آپ دونوں میں سے کِس کے لیے کوشش کرتے؟

سرسیّد کا جواب یہ تھا۔ "مَیں تو اپنے لیے کوشش کرتا" بعینہٖ جب مشہور مصوّر بشیر موجد نے مجھ سے یہ کہا کہ ندیم صاحب پر ایک کتاب مُرتب کردو تو سرسیّد احمد خان میرے پاس آن کے کھڑے ہوگئے۔

اِدھر بڑا پُرا مسئلہ "ادبی خلافت" کا نہ تھا، دوستی کا بھی تھا۔ اِس لیے مَیں نے قدرے تامّل کے ساتھ ہامی بھرلی۔ پھر موجد صاحب نے تصویر کا دُوسرا رُخ دِکھلایا ——

"ایک ماہ کے اندر کتاب مکمل ہونی چاہیئے"

یہ صحیح ہے کہ مَیں آدمی ہوں مگر یہ قطعاً صحیح نہیں ہے کہ مَیں مافوق البشر مخلوق میں سے ہُوں کہ دیار گرد دوں اور مقصود حال، چنانچہ مَیں نے ہکا بکا ہو کے جواب دیا "خاکسار

اتنی قدرت کا مالک نہیں ہے"۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اہلِ قلم کا وہ طبقہ جس سے مجھے کام لینا ہے وہ ایسے معاملات میں لمبی تان کے سوتا ہے اور سوتا ہی رہتا ہے۔

کہہ نہیں سکتا کہ وہ کیا جذبہ تھا۔ ندیم صاحب سے رفاقت کا ؟ یا موحد صاحب سے حذاقت کا ؟ کہ میں سرسری سی رسم کی درخواست گزار کے راضی ہو گیا۔ کاغذی قاصد دوڑا دیئے۔ تعلقات کے اثاثے کو بھی ہمرکاب رکھا۔ بارے الہ آباد سے آواز آئی۔ میں بھی اس سفرِ شوق میں ساتھ دوں گا۔ اسی طرح بمبئی سے بھی، حیدر آباد دکن سے بھی، دلی سے بھی، کراچی سے بھی، اسلام آباد سے بھی، لاہور والوں کا کہنا ہی کیا۔ یہ تو میں دلِ ما روشن دلِ ما شاد کے مصداق، مگر یہ شکوہ سب نے کیا۔ وقت اتنا تنت !

میں جواب میں یہ لکھتا رہا۔ جتنی بھی فرصت ہے۔ اتنے ہی صفحات لکھ ڈالئے اس طرح چند مختصر مضامین کے ساتھ بھرپور مضامین بھی ملے۔ یوں ایک توازن پیدا ہو گیا۔ ہمیں شتابی یوں تھی کہ ہم ندیم صاحب کی خدمت میں یہ کتاب اِنکی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ کتاب رُکی رہی اور ندیم صاحب کی عُمر بڑھتی رہی۔ نہ ہم کتاب جلد چھاپنے پر قادر تھے، نہ ندیم صاحب کی عمر ٹھہرانے پر۔ ہم عجیب مخمصے میں مبتلا رہے۔

یہ کتاب جو ۱۹۶۶ء میں مرتب ہو گئی تھی۔ وہ جا کر چھپی ۱۹۷۶ء میں، یہ وقفہ خاصا طویل ہے۔ اس عرصے میں بہت ساری چیزیں اُتھل پتھل ہوئیں۔ حکومتیں ہی نہیں خیالات بھی۔ چھپے چھپائے ورق سنولا گئے۔ لکھے لکھائے مضمون اُونگھ گئے۔

غرض سرمایہ بھی اٹکا رہا، ہم بھی لٹکے رہے۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی بقراط ٹائپ کی چیز، اس ہدیہ عقیدت پر۔۔۔ "اجی کیا ہے"؟ کی ڈھول ڈال دے۔ مَیں تو ایسے بلیغ فقرے سُننے کا عادی ہُوں۔ ایسے ہی فقروں نے مجھے کہاں سے یہاں تک پہنچایا۔ بہرحال ممدوح سے، اگر مَیں اپنی یاری کا حق ادا نہیں کر سکا تو بھی اس کتاب کے ہر صفحے پر دوستی کی خوشبو ملے گی ضرور!

باقی رہا معاملہ اس مجلس کے روحِ رواں بشیر موجد صاحب کا، وہ تو خوب سرخرو ہُوئے۔ گھپلے میں معاملہ صرف میرا ہے مگر اتنا مَیں بھی جانتا ہُوں کہ یہ دستاویز موجُودہ صُورت میں بھی اپنے اندر زندہ رہنے والی حکمت رکھتی ہے۔ اگر کسی کو شک ہو اور وہ کسی طرح، مرنے کے بعد بھی اس دُنیا میں آسکتا ہو تو وہ آکر دیکھ لے۔ لوگ اِس کتاب کے حوالے دے رہے ہوں گے۔

اِس کتاب میں میرا کوئی مضمون شامل نہیں۔ ایسے نادر موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھانے والے کو خلل ہے دماغ کا طعنہ بھی دیا جا سکتا ہے مگر میری ایک مجبوری تھی۔ عرصہ ہوا ایک مضمُون لکھا تھا۔ دوبارہ لکھنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ ندیم صاحب بھی وہی ہیں، مَیں بھی وُہی ہُوں۔ جیسے یہ ۱۹۴۵ء میں تھے۔ جُوں کے توں ۱۹۷۶ء میں رکھے ہیں۔ سرِمُو فرق نہ پڑا۔ پہاڑ میں تغیر رونما ہو سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی میں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایسے بندے پر یہ بندہ کیسے مضمُون لکھتا؟

اِس کتاب میں احمد ندیم قاسمی کی نمائندہ تحریروں کا انتخاب بھی ہے۔ اِنتخاب

کا ایک طریق یہ تھا کہ اچھی تحریریں اکٹھی کردی جائیں۔ دوسرا طریق یہ تھا کہ دَور بہ دَور اچھی تخلیقات کا انتخاب کیا جاتا۔ ہم نے دوسرا طریق اپنایا تاکہ ندیم صاحب تک رسائیوں کا سلسلہ آسان ہو جائے۔

احمد ندیم قاسمی کے فن کے بارے میں بات یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کاغذ پر لکھی نہیں ہوتیں مگر پڑھنے والے ایسی تحریروں کو بھی پڑھ لیتے ہیں۔

کیا احمد ندیم قاسمی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ان کی تحریریں متقدّمین کے خیالات و جذبات کی بازگشت نہیں بلکہ صدائیں ہیں آنے والے دِنوں کی۔

سوچا جائے تو یُوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ہر دن پُوری زندگی ہے، اور پُوری زندگی ایک دن، جو ہر صبح کو دُہرایا جاتا ہے۔ مگر سچّے فنکار جیتے تو بے شک ایک ہی دن ہیں مگر اِنکی تحریریں برسوں کی زندگی پاتی ہیں۔

محمد طفیل

۲۳ جون ۱۹۷۶ء

نذر

آج سے چار برس پہلے کا ذکر ہے کہ ہم نے اپنے محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کی پچاسویں سالگرہ کی اطلاع ماسکو، پیکنگ اور تاشقند ریڈیو سے سُنی۔ ان غیر ملکی اداروں نے یہ سالگرہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۶ کو منائی۔ ندیم صاحب کی نظموں اور کہانیوں کے رُوسی اور چینی تراجم شائع ہو چکے ہیں اور وہاں کے قارئین اپنے محبوب مصنّفین کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب اور ہم سب کے لیے شرمناک بات ہے کہ پاکستان کو اپنے جلیل القدر شاعر اور بے نظیر افسانہ نگار کی پچاسویں سالگرہ کی اطلاع چین اور روس سے موصول ہوئی۔ اور وہ بھی محض اتفاق سے، ورنہ اگر پاکستان کا کوئی شخص اس روز اپنے ریڈیو سیٹ کی سُوئی پیکنگ یا تاشقند کی طرف نہ گھماتا تو ہم میں سے کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی کہ پاکستان کی متاعِ عزیز نے اپنی زندگی کی پچاس منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس واقعے کے چند روز بعد مجلسِ اربابِ فن کے اراکین جمع ہوئے اور طے پایا کہ ندیم صاحب کے سلسلے میں ہم پاکستانی بھی اپنا فرض ادا کریں۔ اگر یہ فرض پوری طرح ادا نہ بھی کر سکے تو اپنی فرد گذاشت کی تلافی ہی کا کوئی بندوبست کر لیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ برصغیر

پاک و ہند کے نامور شاعروں، افسانہ نگاروں، فنکاروں، نقادوں اور ندیم کے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے گذارش کی جائے کہ وہ ندیم صاحب کے فکر و فن اور شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ جب ایک معقول مواد جمع ہو جائے تو اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

یہ فرض مجلس نے اپنے ایک رکن جناب طفیل کی نگرانی میں دے دیا۔ دراصل مجلس کا ارادہ یہ تھا کہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو ایک تقریب میں ندیم صاحب کو یہ مجموعہ نذر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سب اہلِ قلم سے عرض کیا گیا کہ وہ عجلت سے کام لیں اور اپنے تاثرات جلد سے جلد قلم بند کر کے ہمارے اس ارادے کو عملی صورت اختیار کرنے میں مدد دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ کے بیشتر مندرجات مختصر ہیں۔ اور ان کی نوعیت تاثراتی زیادہ ہے، تجزیاتی کم۔ افسوس کہ مجلس کی مالی مشکلات مزاحم ہوئیں ورنہ مجموعہ تو مقررہ میعاد کے اندر مکمل ہو گیا تھا۔ گذشتہ چار پانچ برس اسی مزاحمت کو عبور کرنے میں گزر گئے۔ اول تو مجلس کے لیے مجموعے کی اشاعت میں تاخیر بجائے خود تکلیف دہ ہے۔ دوم اس دوران ہم ان اہلِ قلم سے بھی مکرر استدعا نہ کر سکے جو علالت یا مصروفیت کی بنا پر مقررہ میعاد کے اندر کچھ لکھنے سے قاصر تھے۔ اس کے باوجود ندیم کی شاعری، افسانہ نگاری، صحافت، فکاہیہ نویسی اور شخصیت پر جو مواد جمع ہوا ہے وہ مجلس کی رائے میں خاصا وقیع ہے۔ ہم نے اس ملک کے ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے افسانہ نگار کے بارے میں جتنی بھی تحریریں اس مجموعے میں جمع کر دی ہیں، وہ ندیم صاحب کے فکر و فن پر کام کرنے والوں کے لیے آئندہ مشعلِ راہ

ثابت ہوں گی۔

ہم نے ایک بہت ہی اہم کام کا آغاز کر دیا ہے اِس کی تکمیل اُن اہلِ قلم کے ذمّہ ہے جنہیں پاکستان کے اس VERSATILE GENIUS کی عظمت اور ہمہ جہتی تہذیبی اثر آفرینی کا ادراک حاصل ہے۔ اور جن کا قلم تعصّب کی بجائے صداقت کے تابع ہوتا ہے۔

ندیم صاحب جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے افسانہ نویس، اتنے ہی بڑے نقّاد، اِتنے ہی بڑے صحافی، اتنے ہی بڑے مزاح نگار اور شاید اس سے بھی بڑے اِنسان ہیں۔ ایک شخصیت میں اِتنی بہت سی خوبیوں کا جمع ہونا اور ہر خوبی کے اعلیٰ معیاروں کو قائم رکھنا بلکہ اِن معیاروں کو مزید بُلندی پر لے جانا بظاہر خوارق کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ندیم صاحب کے سے نابغۂ روزگار کی فنّی شخصیت کا تنوع اُن کے لیے مضر بھی ثابت ہوا ہے، کہ جو لوگ ان کی شاعری کے قائل ہیں وہ ان کی افسانہ نگاری کو کمتر درجے پر رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں تاکہ ان پر مبالغے کی تہمت نہ لگ جائے۔ جو ان کے افسانوں کو اردو افسانہ نگاری کی معراجِ کمال قرار دیتے ہیں، وہ ان کی شاعری اور مزاح نگاری کی نفی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اِن کی تحریر کو عدم توازن کا اِلزام نہ سہنا پڑے بہت ہی کم ایسے مُنصف مزاج اور معقولیت پسند لوگ ہیں جو ندیم کی فنّی شخصیت کے ہر پہلو کے حُسن و معیار کا اِعتراف کرنے پر تیار ہوں۔ مگر ہمارا یہ محبوب و مقبول فنکار اپنے فن کے بارے میں ہر قسم کے منفی ردِ عمل سے کاملاً بے نیاز اپنی دُھن میں مگن ہے۔

اور پاکستان کے ادب و تہذیب کو مالا مال کیے جا رہا ہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء کو اسکی ۵۵ ویں سالگرہ تھی، مگر وہ تخلیقِ فن میں نوجوانوں کی سی لگن کے ساتھ مصروف ہے۔

"مجلسِ اربابِ فن" ندیم صاحب کی عظمتِ فن اور استقامت کو سلام کرتی ہے اور دست بدعا ہے کہ یہ فنکار آیندہ سالہا سال تک پاکستان کے ادب و فن اور تہذیب و ثقافت پر ابرِ رحمت بن کر چھایا رہے۔

مجلسِ اربابِ فن انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کے نامور اہلِ قلم کی تحریروں کا یہ مجموعہ ندیم صاحب کی خدمت میں نذر کرتی ہے۔

گیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

۲۔ دسمبر ۱۹۷۱ء

پیرو زادہ

"شاہ"

گھر کے صحن میں ایک گول مٹول، سُرخ و سفید بچہ اُچھل کود میں مصروف ہے۔ بھرا بھرا جسم، گھنگھریلے بال، موٹا مگر معصوم ناک نقشہ۔ کبھی اپنی بڑی بہن کو جا کر چھیڑتا ہے اور کبھی اپنے بڑے بھائی کو۔ کبھی امّی کی گود میں دھم سے جا گرتا ہے اور کبھی آپا کی سہیلیوں کے چٹکیاں لیکر بھاگ جاتا ہے۔ جب سب خفا ہونے لگتے ہیں تو دُور ہٹ کر وہ کوئی ایسی چلبلی حرکت کرتا ہے کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔ امّی اس کی بلائیں لینے لگتی ہیں، آپا اس کا مُنہ چُوم لیتی ہیں، بڑا بھائی سینے سے لگا لیتا ہے ——— یہ ہے ہمارا "احمد شاہ" ——— جو آجکل "حضرتِ احمد ندیم قاسمی" کہلاتا ہے اور جسے ہم پیار سے "شاہ" کہتے تھے۔ میں اسے اب بھی "شاہ" ہی کہتا ہُوں اور یہاں بھی "شاہ" ہی کے پیارے نام سے اس کا ذِکر کروں گا۔

ہم ایک بہن اور دو بھائی تھے مگر ہم تینوں کی شخصیت ایک تھی۔ ہم تین الگ الگ جسم تھے مگر ہماری رُوح مشترک تھی۔ اب ہماری آپا اس دُنیا میں موجود نہیں اس لیے آج کل میں اور شاہ ایک نامکمّل ——— دو تہائی رُوح لیے پھرتے ہیں۔ سگے بہن بھائیوں کی اس رُوحانی یکجہتی کا عالم یہ تھا کہ اگر کبھی امّی ہم تینوں میں سے کسی ایک سے خفا ہوتیں تو ہم تینوں بیک وقت اُن سے

دُھم جلتے اور وہ فوراً تینوں کو بیک وقت منانے کا مرحلہ طے کرنے لگتیں ۔ ویسے شاہ ہم سب میں چھوٹا تھا اس لیئے ہم سب کا لاڈلا بھی تھا۔ اِس کی حیثیت گھر میں بھی منفرد تھی اور باہر بھی۔ کبھی لڑکوں میں راجہ بنا بیٹھا ہے اور کبھی لڑکیوں کے جُھرمٹ میں بیٹھا اِن کے ساتھ اپنے گُڈوں کے بیاہ رچا رہا ہے ۔ آپا نے تو شاہ کو باقاعدہ اپنی "چھوٹی بہن" بنا رکھا تھا ۔ دونوں بیٹھے دیر دیر تک گُڑیاں کھیلتے رہتے تھے ۔ ویسے شاہ محلے بھر کے لیئے ایک تحفہ تھا جس کے بغیر نہ لڑکوں کو آرام آتا تھا اور نہ لڑکیوں کو چین ۔ شاید اسی لیئے اس نے شاہ سے ندیم بن جانے کے بعد کہا تھا ——

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

مجھے یاد ہے ۔ ایک بار —— جب شاہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا (اُس وقت اس کی عمر بھی کوئی آٹھ نو برس ہوگی) ہمارے ایک عزیز کی شادی ہوئی ۔ عورتیں ڈھولک ، گھڑا اور تھالی بجا کر گیت گانے لگیں ۔ مرد محلے کی چوپال پر چلے گئے اور بچے مکان کی چھت پر جا بیٹھے۔ ہم بھی چھت پر بیٹھے ان دیہاتی گانوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک مجھے شاہ کا خیال آیا ۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا ۔ ہمارے ابا جی کا اِنتقال ہو چکا تھا۔ اس لیئے میں دس گیارہ برس کی عمر میں بھی کم سے کم شاہ کے سلسلے میں اپنی ذمّہ داری محسوس کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرنا میرا فرض ہے ۔ چنانچہ میں شاہ کو اپنے خاندان کی پوری حویلی میں ، پھر ننھیال میں ، پھر خالاؤں کے ہاں ، پھر چوپال پر اور گلیوں میں ڈھونڈتا پھرا مگر شاہ نہ ملا۔

میری تلاش کی آخری منزل اِن لڑکیوں اور بڑی بوڑھیوں کی "محفلِ سماع" تھی جس کا ذکر کر چکا ہوں میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ لڑکیوں کی ایک ٹولی میں بیٹھا ہے۔ وہ گا رہی ہیں، اور ڈھولک بجا رہی ہیں مگر جونہی ان کے گیت کی روانی ٹوٹنے لگتی ہے وہ شاہ پر جھکتی ہیں اور شاہ انہیں لقمہ دیتا ہے۔ یعنی شاہ کی مدد سے یہ لڑکیاں نئے نئے بول گاتی جاتی ہیں۔ اس دن کے بعد تو شاہ کو باقاعدہ بلاوے آنے لگے۔ ہمارے دیہاتی رواج کے مطابق عورتیں شادی کی تقریب میں رات گئے تک اپنے علاقے کے گیت —— ماہیا، ڈھولا، ٹپہ —— گاتی رہتیں اور جب ان کا مواد ختم ہونے لگتا تو شاہ اِن کے آڑے آتا اور نئے نئے ماہیے اور ٹپّے گھڑ گھڑ کر انہیں تھماتا جاتا۔ لڑکیوں کی جس ٹولی سے شاہ نتھی ہو جاتا، اُس کا مقابل کی ٹولی سے شکست کھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

یہ تھی شاہ کی ابتدائی شاعری جس کے بعض حصے ممکن ہے، اب تک لوک گیتوں کا ایک حصہ بن چکے ہوں —— اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت شاہ کی عمر بھی کوئی آٹھ نو برس تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شاہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور میں میانوالی میں اپنے چچا جان کے پاس جو وہاں مہتمم خزانہ تھے، چلا گیا تھا۔ ابا جی کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپا کی شادی ہو گئی تھی۔ اِدھر میں پانچویں جماعت میں داخلہ لینے کے لیے شاہ سے بھی الگ ہو گیا تو ہر وقت بوکھلایا بوکھلایا پھرتا۔ مجھے اس کی شوخیاں اور شرارتیں یاد آتیں اور میں اپنی بے چینی کو چھپا نہ پاتا۔ چچا جان نے میری تشنگی کو پہچان لیا چنانچہ وہ قریب قریب ہر مہینے مجھے

میانوالی سے اپنے گاؤں انگہ بھیج دیتے تاکہ میں امی اور شاہ اور آپا سے مل آؤں۔ پھر چچا جان کا تبادلہ کیمبل پور ہو گیا۔ اس دوران شاہ نے بھی پرائمری کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۵ء میں کیمبل پور میں مجھ سے آملا۔ یہاں آکر بھی اس کی شوخیوں اور شرارتوں میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ چچا جان سے سنجیدہ بزرگ اور چچی جان کی سی باوقار خاتون بھی شاہ کی معصوم شرارتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ وہیں ہم نے قرآن مجید ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔ وہیں دیگر مذہبی مسائل سے ہمیں روشناس کرایا گیا۔ وہیں ہمارے دلوں میں اعلیٰ پائے کے ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ یہ انہی بزرگوں کا احسان تھا کہ انہوں نے اپنی اس باسلیقہ تعلیم اور ساتھ ہی اپنے عمل سے ہماری نس نس میں اسلام سے محبت کا جذبہ بھر دیا۔ آج کل جب بعض لوگ شاہ کی مذہبیت کو مشکوک قرار دیتے ہیں تو مجھے ان پر ترس آتا ہے کہ وہ کتنے بے خبر ہیں۔

مگر اس کی شوخیوں کی دھار کبھی کند نہ ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں جب اس نے "امروز" میں مزاحیہ کالم "حرف و حکایت" لکھنا شروع کیا تو عام لوگ شاہ کی شخصیت کی سنجیدگی اور وقار سے دھوکا کھا گئے اور اس شبہے کا اظہار کیا گیا کہ یہ شخص مزاح سے کیسے نپٹے گا۔ مگر میں جانتا تھا کہ شاہ کے مزاج کی شوخی کو اظہار کا صحیح ذریعہ ملا ہے اور وہ شاعری اور افسانہ نگاری کی طرح مزاح نویسی میں بھی اپنا لوہا منوائے گا کیونکہ بچپن میں وہ گھر بھر سے اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ مجھ سے پورا ملک متفق ہو گا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

اور شاہ کی شرارتوں کا عالم یہ تھا کہ اُن دنوں کیمبل پور میں مداریوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی مداری ہمارے مکان کے سامنے (کہ وہ ایک فراخ جگہ تھی) بنسری اور ڈگڈگی

بجاتا نظر آتا۔ شاہ جب کیمبل پور آیا تو ہمارے ساتھ اس نے بھی دو تین دن مداریوں کے تماشے دیکھے۔ چوتھے دن جب ہم ایک مداری کی شعبدہ بازی دیکھ کر پلٹے اور اپنے گھر کے صحن میں کرسیوں پہ دراز ہو کر ان شعبدوں پر جرح کرنے لگے تو یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ کرسیوں کے درمیان ایک ننھا مُنا اور ٹھُن متھنا مداری کھڑا ڈگڈگی کی بجائے اپنی سلیٹ بجا رہا ہے اور بنسری کی بجائے اپنے موٹے موٹے مگر نہایت خوبصورتی سے ترشے ہوئے ہونٹوں سے سیٹی بجا رہا ہے۔ نہ جانے اس نے کس طرح منٹوں میں اپنا لباس اُتار کر گھر کے کسی ملازم کا میلا چیکٹ لباس پہن لیا تھا —— اور پھر اس نے صرف مداری کا بہروپ بھرنے پہ ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے ہمیں ہر وہ شعبدہ دکھایا جو مداری نے دکھایا تھا اور ہجوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ حد یہ کہ شاہ نے ایک بڑا سا سلگتا ہوا انگارہ بھی ہتھیلیوں میں لے کر مسل ڈالا اور اس کے بعد سلیٹ بجا بجا کر اور اپنے "چھوٹے چھوٹے بچوں" کا واسطہ دے دے کر ہم سے پیسے مانگنے لگا! اس کی ان نقلوں، شرارتوں اور شعبدوں کی وجہ سے گھر کے ملازموں نے شاہ کا نام "پیر پٹاخہ" رکھ دیا اور جب تک شاہ ان سے جُدا ہو کر کالج نہ چلا گیا۔ وہ اسے "پیر پٹاخہ" ہی کہتے رہے۔

ایک دفعہ ہمارے عم زاد بھائی پیر سید امیر (مرحوم و مغفور) جو کشمیر، سیالکوٹ اور گجرات میں روحانی پیشوا تسلیم کیے جاتے تھے، اپنے گاؤں تشریف لائے۔ ان دنوں ہم بھی موسم گرما کی تعطیلات گزارنے وہیں آئے ہوئے تھے۔ شاہ نے کئی کتّے بھتّوں کے سروں سے ان کے بال نوچے اور انہیں بڑی محنت سے دھاگے میں پرو کر ایک بڑی سی

داڑھی تیار کر لی۔ پھر اس نے یہ "مہندی رنگی" داڑھی مونچھیں اپنے چہرے پر لگائیں، سر پہ بڑا سا پگڑ رکھا، دھوتی باندھی، ہاتھ میں عصا لیا اور برادرم پیر صاحب کے ہاں جا دھمکا۔ اس وقت وہ گھر کی مستورات کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب چار سوا چار فٹ کے اس باریش "بزرگ" نے ایک بارعب "السلام علیکم" کا گولہ داغا، پردہ نشیں مستورات گھبرا کر ادھر اُدھر جا چھپیں، بچے بلبلا اُٹھے اور برادرم پیر صاحب نے ایک ڈنڈا اٹھا لیا اور اس بے چارے ننھے مُنّے بوڑھے کو مارنے دوڑے۔ بوڑھے کے ساتھ پیر صاحب کی تکرار خاصی لمبی ہو گئی اور حیرت ہوتی ہے کہ شاہ نے اس وقت بوڑھے کی سی آواز کیسے بنا لی اور اس میں رعشہ کیسے پیدا کیا اور "اللہ تعالیٰ" کی "عین" کو کس طرح صحیح مخرج سے ادا کرتا رہا! ہم یہ سارا ڈرامہ دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے مگر ساتھ ہی ڈر بھی رہے تھے کہ کہیں برادرم پیر صاحب اپنا ڈنڈا بوڑھے کے سر پر نہ دے ماریں۔ لیکن شاہ ہم سے زیادہ خبردار نکلا۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ اب پیر صاحب کے غصّے کی انتہا نہیں رہی اور ڈنڈا اب پڑنے ہی والا ہے تو اس نے فوراً اپنی داڑھی مونچھوں پر ایک ہاتھ مارا اور وہ صاف ہو گئیں۔ پھر اس نے پگڑ اتارا اور ایک طویل فرشی سلام کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ منظر دیکھ کر برادرم پیر صاحب اتنے ہنسے کہ لوٹ پوٹ ہو کر پلنگ پر جا گرے۔ اس دوران پوری حویلی میں یہ خبر پھیل چکی تھی اس لئے ہماری رشتے کی مائیں بہنیں دوڑی آئیں مگر بوڑھا فرار ہو چکا تھا۔ صرف اس کی داڑھی مونچھیں وہاں پڑی تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر وہ دیر تک ہنستی رہیں۔

شاہ شاید چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ (اور میں آٹھویں میں) جب ایک روز ہم بیٹھے

اپنے اپنے حصّے کا گنّا چوس رہے تھے۔ شاہ نے اپنا گنّا فٹافٹ چوس کر برابر کر دیا۔ اور پھر میرے حصّے کے گنّے میں حصّہ دار بننے کے لئے میرے سر پر سوار ہو گیا۔ اس وقت میرے دائیں ہاتھ میں چھوٹا سا چاقو اور بائیں ہاتھ میں گنّا تھا۔ ممکن ہے میں اسے گنّے کا کچھ حصّہ دے ہی دیتا کیونکہ وہ مجھے گنّے سے کہیں زیادہ میٹھا لگتا تھا، مگر شاید اسے شبہ تھا کہ اس کا مطالبہ میں پورا نہیں کروں گا چنانچہ وہ گنّا چھیننے کے لئے مجھ پر جھپٹا اور میں نے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ بلند کئے تو میرے ہاتھ کا چاقو اس کے پھولے ہوئے سرخ سرخ گال کو ہونٹ سے گردن تک چیرتا ہوا نکل گیا۔ یہ منظر میرے لئے بیحد دل خراش تھا کہ میرا شاہ میرے ہی چاقو سے زخمی ہو کر میرے سامنے لہو لہان کھڑا تھا۔ میں نے اسے فوراً گود میں اٹھا لیا اور روتے ہوئے اس کے خون بھرے گال کو چومنے لگا۔ گنوں کے چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری سرخ ہو گئی۔ شاہ کے گال کے آر پار کٹ جانے سے تو میں پریشان تھا ہی، مگر اس وجہ سے پریشانی دو چند ہو گئی تھی کہ ابھی چچا جان کو پتہ چلے گا تو کیا ہو گا۔ مگر آفرین ہے شاہ پر کہ اس نے چچا جان اور چچی جان کو اتنے بڑے زخم کا پتہ ہی نہ چلنے دیا۔ ہم نے اس کے زخم میں راکھ بھری اور اسے ہدایت کی کہ وہ اپنا ہاتھ اس راکھ پر سے اٹھائے نہیں ورنہ خون پھر جاری ہو جائیگا۔ ہم دن میں تین بار اپنے کمروں سے نکل کر چچا جان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ صبح کو قرآن مجید پڑھنے اور دو بار صبح و شام کھانا کھانے کے لئے۔ اس دوران شاہ اپنا بایاں گال بائیں ہاتھ سے چھپائے رکھتا۔ شروع شروع میں اسے کھانا کھانے میں بہت دقت محسوس ہوئی کیونکہ زخم اکڑ گیا تھا اور وہ پورا منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس راز کو راز رکھا اور جب مہینے بھر کے بعد اس کا زخم بھر گیا اور ایک بار وہ

بے خیالی میں گال پر ہاتھ رکھے بغیر چچی جان کے سامنے جا نکلا تو وہ اس کے منہ پر اتنا لمبا اور ابھرا ہوا سُرخ داغ دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔ اُنہوں نے اس کی وجہ پُوچھی تو شاہ نے فوری طور پر شاید پہلا افسانہ سوچا اور بولا "میں گنا چُوس رہا تھا کہ اس کے ایک چھلکے سے میرا گال کٹ گیا۔ ڈر کے مارے بتایا نہیں کہ چچا جان خفا ہوں گے۔ آپ بھی ان سے کہیئے گا کہ وہ مجھے کچھ نہ کہیں!" اور چچی جان نے اپنا وعدہ پُورا کیا۔ چچا جان شاہ سے یہ پُوچھے بغیر کہ تمہیں یہ زخم کیسے آیا، اسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لئے پھرے کہ اس لڑکے کے گال پر یہ اُبھرا ہُوا زخم کسی طرح غائب ہو جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ زخم کا اُبھار خود بخود کم ہو گیا مگر داغ رہ گیا جو اَب شاہ کی شخصیت کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ بہرحال جن دنوں شاہ اس زخم کو اپنے ہاتھ سے چھُپائے پھرتا تھا، مَیں نے اس کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ایک بار جب میں اس کے زخم پر ویزلین لگا رہا تھا تو اس نے ایک پُرانے شعر کی پیروڈی کی اور بولا :

میرے زخموں پہ مت رکھو مرہم
میرے بھائی کی یہ نشانی ہے

اِس حالت میں بھی اس کی شوخی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اِس واقعے کے بعد جب گرمیوں کی چھٹیاں قریب تھیں تو مجھے خیال آیا کہ گاؤں جاکر ایک "انجمن نوجوانانِ اسلام" بنائیں گے اور اپنے ہمعصروں کو قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھائیں گے اور انہیں نماز روزہ کی طرف راغب کریں گے۔ مَیں نے شاہ سے اِس کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ اسکا "منشور" مَیں تیار کرتا ہوں! اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر شاہ اپنے

ہاتھ میں ایک منظوم منشور لیئے میرے سامنے کھڑا مُسکرا رہا تھا (مجھے بے حد افسوس ہے کہ اسکا مسودہ مجھ سے ضائع ہو گیا ورنہ آج اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ رہتا) اِس منشور میں زبان و بیان کی خامیاں تو یقیناً ہوں گی مگر وزن بالکل درُست تھا۔ قافیے ردیف میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ اور مَیں نے اس انجمن کے مقاصد کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا، وہ سب اس نظم میں بڑی خوبی اور سلاست سے آگیا تھا۔ یہ شاہ کی ابتدائی اُردو شاعری تھی۔

انہی دنوں اس نے دوپہر کو تاریخ خیز افیے کے لیئے ایک دستے کی کاپی خریدی اور شام سے پہلے اس پر پوُرا ناول لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ مَیں شاہ سے صرف دو سال بڑا ہوں، اس لیئے مجھے اس وقت کیا علم تھا کہ شاعر کے ساتھ ہی مستقبل کا ایک بڑا افسانہ نگار بھی پیدا ہو رہا ہے۔

چچا جان کیمبل پوُر سے تبدیل ہو کر شیخوپوُرہ تشریف لے گئے۔ وہاں کالج نہیں تھا اور مَیں انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور میں ایف اے کے دوسرے سال کا طالب علم تھا (شاہ دسویں میں پڑھتا تھا) چنانچہ مَیں تو اِن کے ساتھ شیخوپوُرہ نہ جا سکا۔ مگر شاہ مجھ سے الگ ہو کر شیخوپورے چلا گیا۔ شاید جنوری ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے جب ایک روز چچا جان اپنے کمرہ میں نہایت افسردہ بیٹھے تھے۔ شاہ وہاں سے گزرا تو اُنہوں نے فرمایا کہ بیٹا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج مولانا محمد علی جوہر حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ وہ مسُلمانوں کے کتنے بڑے رہنما تھے اور ان کا وجوُد اسلامیانِ ہند کے لیئے کتنا ضروری تھا؟ چچا جان کو یہ معلوم کر کے تسکین ہوئی کہ شاہ کو مولانا محمد علی جوہر کی اہمیت و عظمت کا مکمل احساس تھا۔ پھر شاہ وہاں سے چلا آیا۔

اپنے کمرے میں جاکر کاغذ قلم اٹھایا اور کوٹھی کی چھت پر آگیا (اس کوٹھی میں آجکل شیخوپورے کا تھانہ ہے) ڈھائی تین گھنٹے بعد وہ نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں تیس چالیس اشعار کا ایک نوحہ تھا جو اس نے چچا جان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسے پڑھ کر دم بخود رہ گئے۔ پھر ضبط نہ کر سکے اور زار زار رونے لگے۔ انہوں نے شاہ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ ان کے لیے یقیناً یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ شاہ جو ان کی ہیبت اور احترام سے ان کے سامنے "جی، جی ہاں" کے سوا کوئی لفظ نہیں بولتا تھا، ایک ایسا مرثیہ کہہ لایا ہے جس کی توقع دسویں جماعت کے ایک طالب علم سے نہیں کی جا سکتی۔ چچا جان کا ذوق شاعری نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھار اردو اور فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے اس لیے وہ شاہ کے لکھے ہوئے اس مرثیے کے جذبہ و احساس کے علاوہ اس کی فنی صحت سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اسی وقت کار گیراج سے نکلوائی اور لاہور تشریف لے گئے۔ دوسرے روز روزنامہ "سیاست" کے سنڈے ایڈیشن کے پہلے صفحے پر شاہ کی یہ نظم کئی رنگوں میں چھپی۔ اس میں شاہ نے اپنا نام "پیرزادہ احمد شاہ احمد" درج کیا تھا۔ بعض شعرا کی طرف سے داد کے خطوط بھی شاہ کو موصول ہوئے (اخبار میں شاہ کے نام کے ساتھ اس کا پورا پتہ بھی درج تھا) مگر سب سے اہم داد علامہ اقبال کی تھی۔ چچا جان، سیالکوٹ میں علامہ اقبالؒ کے ہم مکتب رہ چکے تھے اور علامہ مرحوم سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ ایک روز چچا جان لاہور میں علامہ سے ملنے گئے تو باتوں باتوں میں مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے ساتھ ہی شاہ کی اس نظم کا ذکر بھی آیا اور علامہ مرحوم یہ سن کر حیران رہ گئے کہ یہ نظم چودہ برس کے ایک بچے نے لکھی ہے۔ اور اس میں ایک بھی لفظ کی تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ داد جب





فلم ''[illegible]'' کے سیٹ پر''





ایک مشاعرے میں ندیم، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور قتیل شفائی کے ہمراہ



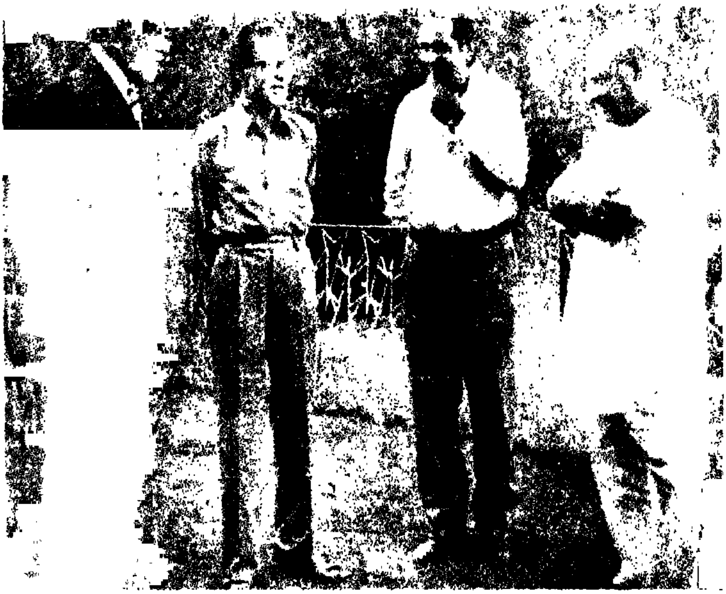
ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں ندیم انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت میں انجمن کی کل پاکستان کانفرنس منعقدہ ۱۹۵۲ء (کراچی) میں سالانہ رپوٹ پڑھ رہے ہیں



خاطر غزنوی ۔ بشیر موجد ۔ احمد فراز ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ فارغ بخاری



احمد ندیم قاسمی



حکیم نبی احمد جمال سویدا - بشیر موحد - احمد ندیم قاسمی - وزیر الحسن عابدی



احمد ندیم قاسمی - ملک محمد جعفر - جوش ملیح آبادی



ندیم، پاکستانی مدیران جرائد کے وفد کے ہمراہ پیکنک میں — بائیں سے چوتھے نمبر پر



ندیم اپنے گاؤں کی چوپال پر



ندیم اپنے گاؤں کی چوپال پر



ندیم — ۱۹۳۱ء میں



احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض کے ساتھ



[illegible] ملکی تہذیبی ادارے کی نمائندہ خاتون کے ساتھ



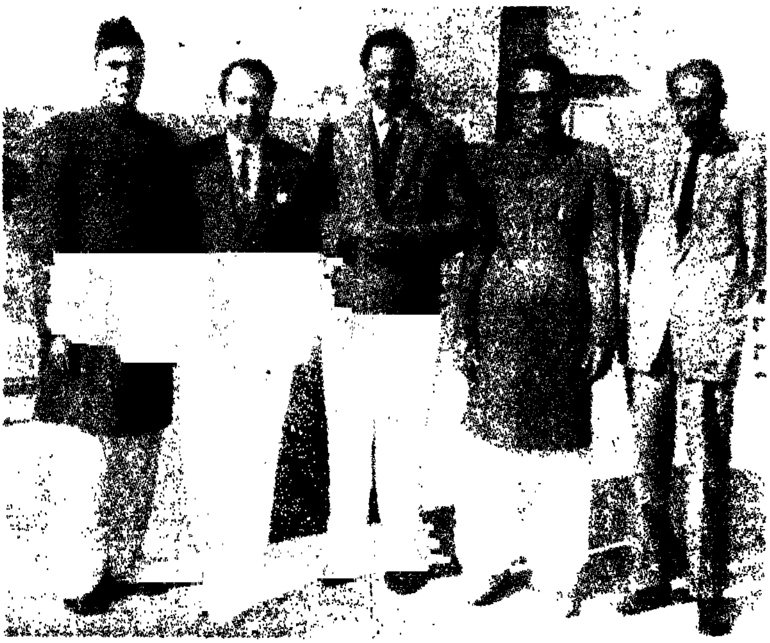
دائیں سے بائیں : ندیم کے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش ندیم کے بھانجے ظہیر بابر اور



ندیم — ۱۹۴۸ء میں



فیض احمد فیض - خالد احمد - احمد ندیم قاسمی - امجد اسلام امجد - حفیظ جالندھری



اپندر راعی - احمد ندیم قاسمی - بشیر موجد - قتیل شفائی - عالم علی سید



احمد ندیم قاسمی - مشہور فوٹو گرافر جے قاسم



احمد ندیم قاسمی - حبیب اشعر (مرحوم) — بیشر موجد



احسان دانش - محمد طفیل (مدیر نقوش) احمد ندیم قاسمی



احمد ندیم قاسمی - استاد اللہ بخش - احسان دانش - بشیر موجد



محمد طفیل۔ استاد اللہ بخش۔ احمد ندیم قاسمی۔ احسان دانش۔ بشیر موجد۔ عالم علی سود



احمد ندیم قاسمی - مرزا ادیب - احسان دانش - محمد طفیل (مدیر نقوش)



احمد ندیم قاسمی- جسٹس ایس اے رحمان۔ پروفیسر وقار عظیم



ہاجرہ مسرور ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ محمد طفیل ۔ خدیجہ مستور ۔ احسان دانش



محمد طفیل - بشیر موجد - احمد ندیم قاسمی - استاد اللہ بخش



احمد فراز ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ یوسف بچ



بیٹھے ہوئے - خدیجہ مستور - محمد طفیل - حفیظ جالندھری - احسان دانش - ہاجرہ مسرور
کھڑے ہوئے - ظہیر بابر - بشیر موجد - مرزا ادیب - احمد ندیم قاسمی - عالم علی سید



احمد ندیم قاسمی ۔ احسان دانش اور مایہ ناز مصور استاد اللہ بخش



احمد ندیم قاسمی اپنے بچوں ناہید، نشاط، اور نعمان کے ساتھ



ستشاہ تک پہنچی تو ظاہر ہے، اس عمر میں اتنی بڑی حوصلہ افزائی کی وہ توقع ہی کہاں رکھتا تھا! چنانچہ اب وہ شعر کہنے کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوگیا۔

شاہ کے میٹرک اور میرے ایف اے پاس کرنے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر ہمیں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں بھیج دیا گیا۔ دراصل نواب بہاول پور عرصے سے کوشاں تھے کہ چچا جان ریاست کے مشیر مال کی حیثیت سے بہاول پور تشریف لے آئیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کا یہی ارادہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمیں پہلے ہی سے بہاول پور بھجوا دیا تاکہ بعد میں دقت نہ ہو۔ وہاں شاہ نے نہ صرف مباحثوں اور ڈراموں میں نام پیدا کیا بلکہ اچھے کھلاڑیوں میں بھی شمار ہونے لگا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ شاہ والی بال کا ایک عمدہ کھلاڑی ہے۔ وہ سنٹر میں کھیلتا تھا اور میں "نٹ" پر، اس لیے میری "والی" سے اس کی عینک کے پرخچے کئی بار اُڑے ہیں۔ میں ۱۹۳۳ء میں بی اے کے بعد اپنے گاؤں آگیا۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے جب چچا جان شیخوپورے سے ریٹائر ہو کر گاؤں تشریف لے آئے، مگر دراصل انہوں نے والیِ بہاولپور کی پیشکش منظور کرلی تھی۔ چند روز کے لیے بہاول پور گئے۔ وہاں اس زمانے کے شیخ الجامعہ عباسیہ کے ہاں قیام فرمایا۔ پھر ایک دن ہوسٹل میں شاہ کے پاس بھی ٹھہرے۔

امیر بہاول پور سے ملاقات کے بعد دس روز کے لیے سفر کی تیاری کرنے گاؤں واپس آئے مگر انہی دنوں ایک صبح کو نماز کے بعد انہیں زندگی میں پہلی بار دل کا دورہ پڑا، اور وہ انتقال فرما گئے۔ ہماری زندگیوں کے اس مینارۂ نور کے بجھ جانے سے ہماری دنیا پہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ شاہ بہاول پور میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس سانحے کی خبر سُنی تو وہ فوراً

گاؤں پہنچا اور نئے حالات کے پیش نظر تعلیم ترک کرنے پر تُل گیا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو پرائیویٹ طور پر مکمل کریگا، مگر ان حالات کا جوانمردانہ مقابلہ کرے گا۔ لیکن میں نے اسے سمجھا بجھا کر واپس بہاول پور بھیج دیا تاکہ گریجوایشن مکمل کرے۔ آخر ۱۹۴۳ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد وہ میرے پاس آگیا۔ اِنہی دنوں مجھے لاہور میں ایک ملازمت مل گئی۔ مَیں لاہور آیا تو شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔

مگر مَیں چاہتا تھا کہ شاہ کو جوانی اور تازگی کے اس دَور میں ذرا سی بھی پریشانی نہ ہو۔ اسی لیئے مَیں نے اسے روزی کمانے کے دھندوں سے بے خبر رکھا۔ خود جو مِلا، کھا لیا لیکن شاہ کے لیئے اس کی خواہش کے مطابق خوراک مہیا کی۔ اپنے لیئے کپڑے سلواتا تو شاہ کو اجازت تھی کہ وہ ان میں سے اپنی پسند کے مطابق جو کپڑے چاہے اُٹھا لے۔ اس نے جس چیز کی بھی خواہش کی، یا اشارتاً بھی اس کا ذکر کیا، وہ اِس کے لیئے بہم پہنچانا میرا فرض تھا۔ مَیں نے اسے موقعہ ہی نہ دیا کہ اِسے اپنے سرپرست چچا جان کے بچھڑنے کے بعد کی المناک صُورتِ حال کا احساس ہو۔ مگر وہ شاعر اور فن کار تھا اور ان لوگوں کے احساس کی سطح اتنی ذکی الحس ہوتی ہے کہ وہ تو شاخ سے پتے کے ٹوٹ کر گرنے تک کا شدید تاثر قبول کرتے ہیں، چنانچہ شاہ تاڑ گیا کہ اگرچہ مجھے ہر قسم کی آسائش میسر ہے مگر لالہ (شاہ مجھے لالہ کہتا ہے) پر جو اندھا دھند بوجھ ہے اسے کسی حد تک تو کم کرنا چاہیئے۔

مَیں جانتا تھا کہ یہ ہم سب کے لاڈوں اور نازوں کا پلا ہوا شاہ کسی کے ماتحت رہ کر کام نہیں کر سکے گا۔ واضح رہے کہ ہمارے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہیں تھا بلکہ اسے بلا کا خوددار بنا دیا تھا۔

لاڈ سلیقے کا ہو تو اسی قسم کا مثبت ردِّعمل ہوتا ہے۔ مَیں نے اسے سمجھایا کہ تو ملازمت میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ماتحتی کی جو روایات ہمارے ہاں رائج ہیں، وہ ایک خوددار انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ لیکن وہ نہ مانا۔ شدید بیروزگاری کا زمانہ تھا۔ بی اے اور ایم اے پاس نوجوان بھٹکتے پھرتے تھے۔ اس لیے بڑی مشکلوں کے بعد اسے الکشن آفس میں محرری کی آسامی ملی۔ نئی نئی اصلاحات نافذ ہوئی تھیں۔ رائے دہندوں کی فہرستیں بن رہی تھیں۔ شاہ اِس دفتر میں ایک پٹواری کے ماتحت دوسرے ساتھی کریجویٹوں کے ہمراہ یہ فہرستیں مرتب کرنے لگا۔ مَیں نے ایک بار اس کے دفتر کا منظر دیکھا کہ وہ اور اس کے ساتھی چٹائیوں پر بیٹھے فلاں ولد فلاں، ذات فلاں، پیشہ فلاں کی رٹ لگا رہے ہیں اور ان کے افسر یعنی پٹواری صاحب قریب ہی ایک کھری چارپائی پر بیٹھے اِن کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اِن دنوں مجھے وہ کچھ افسردہ افسردہ نظر آتا تھا اور میرے لیے اس کی یہ کیفیت سوہانِ روح تھی۔ اس کی عُمر بیس اکیس سال تھی۔ خوب تنومند جوان تھا۔ پھر وہ شاعر تھا اس لیے مَیں نے نتیجہ نکالا کہ وہ اپنے دفتر کے ماحول سے ناخوش ہے اور اسے یہ ترتیب ناپسند ہے کہ مڈل پاس پٹواری چارپائی پر براجمان ہے اور بی اے پاس شاہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ مَیں نے شاہ سے اس کا ذکر کیا تو اِس نے باقاعدہ بُرا مانا۔ بولا "مجھے کسی بھی حیثیت میں کام کرنے سے عار نہیں ہے۔ بس دفتر کا ماحول ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر وقت بوجھ بنا رہتا ہے" مَیں نے اسے ملازمت چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ دُوسرے دن پٹواری نے اسے گلاب سنگھ پریس سے دوات میں روشنائی لانے کو کہا۔ یہ کام اس کے فرائض میں داخل نہیں تھا۔ اِس لئے اس کی خوب

اُس نے دوات بھرلانے کی بجائے استعفےٰ لکھا اور چپڑاسی کے ہاتھ استعفےٰ کو بھجوا کر میرے پاس چلا آیا۔ اس نے یہ ملازمت بھی کوئی دو ڈھائی مہینے تک برداشت کی۔

انہی دنوں اس نے رسالہ "تہذیبِ نسواں" کے لیے خواتین کے بعض انگریزی رسالوں کے افسانے اُردو میں منتقل کیے اور شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ انہی دنوں اس نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ایک ہندو بزرگ کے کہنے پر لکھی۔ چار پانچسو صفحات کی یہ کتاب انہی بزرگ کے نام سے شائع ہوئی اور شاہ کو شاید ستّر یا اسّی روپے معاوضہ ملا۔ اُن دنوں اس نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کی سب اردو اور انگریزی کتابیں پڑھ ڈالیں۔

شاید میرا سہارا بننے کے لیے اسے پھر ملازمت کا شوق چرّایا اور ٹیلیفون آپریٹر بن کر اوکاڑہ جا دھمکا۔ وہاں اس نے ایک ہفتہ بھی نہ گزارا۔ مجھے خط لکھا کہ سارا دن کانوں پر خول چڑھے رہتے ہیں، سامنے ٹیلیفونوں کے نمبر پھُدکتے رہتے ہیں۔ بٹن دبتے رہتے ہیں گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں اور کل ایک سیٹھ کا مطلوبہ نمبر پوچھنے میں مجھ سے کچھ تاخیر ہو گئی تو اس نے مجھے گالی دے دی اور مَیں نے جواب میں اسے دس گالیاں تھما دیں (ویسے شاہ کو گالیاں نہیں آتیں۔ اس نے سیٹھ کو یہی بدتمیز یا بدتہذیب یا بدبخت کہا ہو گا۔ اس کے بعد اس کا گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے) اس نے لکھا تھا کہ مَیں اس بیہودہ ملازمت سے تنگ آ گیا ہوں۔ اجازت دیجیے کہ مَیں آپ کے پاس بھاگ آؤں۔ مَیں نے اسے بذریعہ تار بھاگ آنے کی ہدایت کی اور وہ بھاگ آیا اور ٹیلیفون آپریٹروں کے لطیفے سُنا سُنا کر مجھے اتنا ہنسایا کہ بے حال کر دیا۔

اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں لباس، خوراک یا دیگر ضروریاتِ زندگی کے سلسلے میں اسے خود اپنی ذات پر بھی فوقیت دیتا تھا۔ اس کے لیے روزانہ جیب خرچ تک کا بندوبست کر دیتا تھا مگر اسے شاید احساس تھا کہ وہ مجھ پر مستقل بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا یہ احساس غلط تھا کیونکہ میرے نزدیک تو اس کی حیثیت ایک چنبیلی کی سی تھی اور پھولوں کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ مگر میں اس کے احساسات کے سامنے بند کیسے باندھتا۔ آخر جولائی ۱۹۲۹ء میں وہ محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا۔ پہلی تقرری خانیوال (ضلع ملتان) میں ہوئی۔ اس نے ایک سال بظاہر بڑے سکون سے گزار لیا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "چوپال" شائع ہوا۔ میں خوش تھا کہ وہ ملازمت کا عادی ہونے لگا ہے اور اس نے قدم جما لئے تو پھر اطمینان سے بیٹھ کر نظمیں غزلیں اور کہانیاں لکھے گا اور یوں اس کا مقصدِ حیات پورا ہو گا۔ اس دوران بھی روپے وغیرہ کے سلسلے میں وہ مجھ سے مطالبات کرتا رہا اور میں فوراً اس کی فرمائش پوری کرتا تھا تاکہ اسے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہ آنے کہ وہ اکیلا ہے۔ پھر اس کا تبادلہ ملتان ہو گیا۔ وہاں سے اس نے مجھے لکھا کہ خانیوال ریلوے اسٹیشن پر اس حلقے کے شراب افیم اور بھنگ کے سب ٹھیکیدار مجھے الوداع کہنے آئے اور جب گاڑی چلی تو وہ بوڑھے بوڑھے گنجے گنجے، میلے میلے لوگ بھاں بھاں کر کے رونے لگے۔ مجھے ان پر بڑا پیار آیا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ میں ان سے پانی کا ایک گلاس تک پینے کا بھی روادار نہ تھا اور انہیں ان کی غلطیوں پر سزا دینے کی بجائے صرف سرزنش کر دیتا تھا۔ میں نے یہ خط پڑھا تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ شاہ ملازمت کی بجائے انسان دوستی کرے باعث اس لیے ناکام رہے گا، مگر میں خوش

بھی تھا کہ اس گندے ماحول میں بھی اس کی پاکیزہ خیالی برقرار تھی۔

یہ شاید ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے جب اس نے مجھے ملتان سے لکھا کہ لالہ! اسلام جن نشوں سے ہمیں منع کرتا ہے، انہی کے ٹھیکوں کی نگرانی میرے ذمہ ہے۔ پھر مجھے بے حد غریب ـــ نام کی حد تک قلاش لوگوں پہ چھاپے مارنے پڑتے ہیں اور وہ میری وجہ سے چھ چھ مہینے، سال سال بھر کے لیے جیل چلے جاتے ہیں اور ان کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے افیم کی ایک گولی یا بھنگ کا ایک گلاس کیوں فروخت کیا جبکہ اس فروخت کا حق تو صرف حکومت انگلشیہ کو پہنچتا ہے۔ میں ہر چھاپے اور ہر استغاثے اور ہر مقدمے کے فیصلے کے بعد اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے اس وزرخت سے بچائیے اور مجھے مستعفی ہونے کی اجازت دیجئے۔ آج میرے انسپکٹر صاحب نے اپنے کمرے سے مجھے آواز دی۔ میں مصروف تھا۔ سن نہ سکا۔ انہوں نے جلتے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑا انگوٹھے پر چڑھا کر میری طرف پھینکا جو میرے گال پر لگا۔ پلٹ کر میں نے پوچھا کہ یہ جرأت کس نے کی ہے؟ انسپکٹر صاحب نے جواب دیا کہ میرے پکارنے پر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے میں نے آپ پر سگریٹ پھینکا کہ شاید آپ اس طرح متوجہ ہو سکیں۔ میں نے سامنے پڑے ہوئے قلمدان میں سے ایک دوات اُٹھا کر یہ کہتے ہوئے انسپکٹر صاحب کے سینے پر دے ماری کہ جواب عرض ہے۔

ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انسپکٹر صاحب اپنی آلودہ شیروانی کے ساتھ ایکسائز آفیسر کے ہاں پہنچے۔ مجھے بلایا گیا۔ اور میں نے ساری صورت حال بتا کر عرض کیا کہ میں آئندہ بھی ایسی پکار کا یہی جواب دوں گا۔ ایکسائز آفیسر معقول آدمی ہے۔ اس نے انسپکٹر صاحب کو خاصا ڈانٹا

ہے مگر اب مَیں اِس ملازمت میں نہیں رہنا چاہتا۔ میرے لیے مولانا سالک صاحب نے لاہور میں ہفت روزہ "پھُول" اور ہفت روزہ "تہذیب نسواں" کی ادارت کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ بس آپ کی اجازت کا منتظر ہوں ـــــــ ظاہر ہے کہ مَیں نے اسے فوراً اجازت دے دی۔ اس نے مارے خوشی کے اپنا سارا سامان احباب میں تقسیم کر دیا اور ٹین کا ایک کھڑکھڑاتا بکس اٹھائے سیدھا میرے پاس آیا۔ مَیں نے اِس میں صِرف یہ تبدیلی دیکھی کہ اب وہ سگریٹ پینے لگا تھا۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ لاہور میں رہا۔ "پھُول" اور "تہذیب نسواں" کے علاوہ وہ اِس وقت کے مشہور ادبی رسالے "ادبِ لطیف" کا بھی ایڈیٹر ہو گیا۔ اس زمانے میں اس نے خُوب خُوب لکھا اور آخر نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گیا۔ مَیں اور عزیزی ظہیر بابر اسے دیکھنے لاہور آئے تو وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ ان دنوں اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا اور اسے کوئی شدید جذباتی صدمہ پہنچا تھا اور وہ اس قسم کے شعر کہنے لگا تھا کہ ؎

جہاں پناہ، مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

بہرحال۔ وہ شاعر جو کافی عرصے تک سگرٹ بھی مجھ سے چھپ کے پیتا رہا، مجھے کیا بتاتا۔ مَیں ڈاکٹر سے دوائیں لے کر اور سب ادارتیں چھڑوا کر اسے گاؤں لے آیا۔ مگر وہاں علالت کے دوران بھی اس نے ۱۹۴۶ء کا سالنامہ "ادبِ لطیف" مرتب کر ڈالا۔ اس کی آدھی عدالت

توانی کے سینے سے لگ کر ہی ختم ہو گئی اور باقی علالت کو تحریکِ پاکستان اڑا کر لے گئی۔

قائدِ اعظمؒ کی رہنمائی میں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ شاہ حسین نے انسان دوستی اسلام دوستی کے رستے سے حاصل کی ہے۔ اس تحریک کے نظریات سے متفق تھا۔ اسے اختلاف تھا تو صرف یہ کہ اس کی صوبائی قیادت صدفی صد امراء کے ہاتھ میں تھی مگر وہ ایک بڑے مقصد کے لیے اس اختلاف کو پی جانے پر تیار ہو گیا۔ مسلم لیگ کا سبز جھنڈا کاندھے پر رکھا اور اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا جلوس لیے علاقہ سون سکیسر کے گاؤں گاؤں میں گھومنے لگا اور یوں وہ ضلع سرگودھا کے اس کوہستانی علاقے میں ایک "خطرناک" مہم کا لیڈر بن گیا۔ "خطرناک" اس لیے کہ اس وقت یونینسٹ وزارت برسرِ اقتدار تھی اور یہ علاقہ اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ ملک خضر حیات خاں کا حلقہ انتخاب تھا۔ یونینسٹ وزارت اس بات پر تُل گئی تھی کہ چاہے کتنے ہی بیگناہوں کو جیل میں ٹھونس دینا پڑے، وہ یونینسٹ امیدواروں کے مقابلے میں کسی مسلم لیگی کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ ہمارا علاقہ تو ویسے ہی پسماندہ اور راضی برضا قسم کا علاقہ تھا۔ یہاں تو پولیس والے ہر اس شخص کو حوالات میں بند کرنے پر تیار رہتے تھے۔ جو مسلم لیگ اور قائدِ اعظمؒ اور پاکستان کا نام بھی لیتا۔ لیکن شاہ کو نہ تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی ہر طرف سے اٹھتی ہوئی جھنکار خوفزدہ کر سکی اور نہ اپنے خاندان کے بزرگوں کی شدید ناراضی اس کے قدموں کو جکڑ سکی۔ وہ بے دھڑک اس میدان میں کودا۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس دوران اس نے نہ صرف جلوس نکالے اور جلسے کیے بلکہ ان گنت نظمیں لکھیں اور ترانے کہے اور اپنے علاقے کی بولی میں ٹپّے تصنیف کیے۔ لوک گیتوں کی غیر فانی صنف "ماہیا"

تک کو اس نے تحریکِ پاکستان کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔ حد یہ ہے کہ اُن دنوں ہمارے علاقے میں شادی بیاہ کے موقعے پر عشقیہ گیتوں کی بجائے شاہ کے یہی ٹپے اور ماہیے گائے جانے لگے۔ وہ تو بچپن میں گانے والی لڑکیوں میں گھس کے بیٹھ جاتا تھا۔ اور انہیں گیتوں کے نئے نئے بول (کلیوں) کے لقمے دیتا تھا۔ آج اپنے فن کو قیامِ پاکستان اور آزادیِ وطن کے لیے مؤثر طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے لاہور کے اخباروں کو اس علاقے کی سرگرمیوں سے باقاعدہ طور پر آگاہ رکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ یوں سمجھیے کہ یہ اس کی صحافت کا آغاز تھا۔ انہی رپورٹوں سے متاثر ہو کر حمید نظامی مرحوم نے شاہ کو "نوائے وقت" کے ادارے میں شامل ہونے کی بھی دعوت دی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ اخبار کے دفتر میں کرسی پر بیٹھنے سے زیادہ مفید اور کارآمد کام کر رہا ہے۔

یہ علاقہ، جسے امیدوار الیکشن کے موقعے پر بھی نہیں پوچھتے تھے اور اپنا کوئی طرہ دار ساتھی بھیج کر سب ووٹ سمیٹ لے جاتے تھے، اب مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کی توجہ کا مرکز بننے لگا۔ جب اس علاقے میں میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خاں، ملک فیروز خاں نون اور راجہ غضنفر علی خاں (مرحوم) تشریف لائے تو وہ اور ان کے ہمراہ آنے والے معروف اخبار نویس میاں محمد شفیع (م۔ش) اور میر نور احمد گواہ ہیں کہ شاہ اور علاقے کے دوسرے کارکنوں کی وجہ سے ان کے استقبال میں ایک اتنا بڑا جلوس نکلا کہ دیہاتی علاقوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سجے ہوئے اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں اور کسانوں کے انبوہ در انبوہ اور ڈھولوں اور شہنائیوں اور گولوں اور نعروں اور حدِ نظر تک پھڑپھڑاتے ہوئے سبز جھنڈوں کے اس

ایمان افروز اور جرأت آموز منظر کو کون بھول سکتا ہے؟ اس دُور افتادہ وادی میں باقاعدہ پنڈال کے انتظام، اور لاؤڈ اسپیکروں کی فراہمی اور کچی دیواروں پر لگے ہوئے بڑے بڑے اشتہاروں اور خوبصورت اُردو میں لکھے ہوئے طویل وعریض سپاسنامے کو کون فراموش کر سکتا ہے؟ اس منظر کی کیفیت میں کیا بیان کروں گا۔ شاہ سے پوچھیئے کہ جب ہر بڑے جلسے کے موقعے پر علاقے کے صدر مقام نوشہرہ میں جمع ہونے کے لئے مسلمان نوجوانوں اور بوڑھوں اور بچوں کی ٹولیاں سبز جھنڈے اُٹھائے اور شاہ کے لکھے ہوئے ترانے گاتے ہوئے آس پاس کی پہاڑیوں سے اترتی تھیں اور شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سے آتی ہوئی یہ ننھی ننھی ٹکڑیاں نوشہرہ کی عیدگاہ کے "سمندر" کا ایک حصہ بن جاتی تھیں تو شاہ اور اس کے ساتھی کارکنوں کو کیا محسوس ہوتا تھا، اور یونینسٹ لیڈروں اور علاقے میں ان کے ہوا خواہوں پر کیا بیت جاتی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں شاہ کی اس دلیرانہ اور ان تھک جدوجہد کا نقطۂ اوج یہ ہے کہ ہزاروں کے اس ہجوم میں اتنے بڑے بڑے عہدیداروں کی موجودگی میں شاہ نے اپنے نجی ملازم میاں محمدؐ (مرحوم) کی رفاقت میں اپنے ترانے گائے اور اپنی آواز کو میاں محمد کی مترنم آواز میں اس کمال سے لپیٹ کر پیش کیا کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کیونکہ میرا تو اب بھی یہ عالم ہے کہ اگر شاہ اپنے کمرہ میں بیٹھا گنگنا بھی رہا ہو تو میں اس کی منتیں کرتا ہوں کہ وہ اس زیادتی سے باز آجائے۔ ورنہ موسیقی کی دیوی خودکشی کر لے گی۔

یہاں میں شاہ کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ جس انداز سے اس نے اپنے علاقے میں یہ تحریک چلائی وہ نہایت صحت مندانہ انداز تھا۔ اِس میں تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ تواہنی جلسوں کے سلسلے میں جب نوشہرہ آتا تھا تو اپنے عزیز دوست منوہر لال لگا ہی کے ہاں رُکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلے تو علاقہ سون سکیسر کے ہر گاؤں کے مسلمانوں نے اپنے ہاں کے سکھوں اور ہندوؤں کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور انہیں اُن کے اثاثوں سمیت نوشہرہ کے ریفیوجی کیمپ میں پہنچا آئے جہاں سے وہ بخیریت بھارت چلے گئے۔ شاہ کے صحت مند اور انسان پرستانہ نقطۂ نظر نے علاقے میں اسکی غیر موجودگی کے باوجود ایک قابلِ فخر فتح حاصل کی تھی۔

انہی دنوں برادر محترم سجاد سرور نیازی صاحب نے، جو اس وقت پشاور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے۔ شاہ کو پشاور بلوا بھیجا۔ شاہ لاہور واپس جانا چاہتا تھا مگر میرے سمجھانے بجھانے پر وہ مان گیا اور ۱۹۴۷ء کے اواخر میں نیازی صاحب کے پاس چلا گیا۔ ان کی بے پایاں محبت نے شاہ کو مسخر کر لیا۔ ان کے خاندان سے ہمارے دیرینہ تعلقات تھے اس لیے شاہ نے وہاں ایک لمحے کو بھی کوئی اجنبیت محسوس نہ کی اور مارچ ۱۹۴۸ء تک پشاور میں بہت مزے کے اور بھرپور دن گزارے۔ اچھی ملازمت تھی، معقول تنخواہ تھی اور نیازی صاحب کی دلداری تھی۔ ان کے ہاں وہ سُر سنگیت کی سحر کاریوں سے بھی بہرہ یاب ہوا۔ مگر وہ شاہ ہی کیا جو ایک دو سال سے زیادہ ملازمت نبھا سکے۔ چنانچہ وہ حسبِ عادت اُکتا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ نیازی صاحب اسے اجازت نہیں دیں گے اس لیے چھٹی لیکر پشاور سے لاہور آیا اور یہاں سے استعفیٰ داغ دیا۔ دراصل وہ رسالہ "نقوش" جاری کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا اور ۱۹۴۸ء ہی میں یہ رسالہ شاہ اور بہن ہاجرہ مسرور صاحبہ کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ پشاور کے قیام میں وہ لاہور

تا ۱۹۵۵ء "سویرا" بھی مرتب کرتا رہا۔

اس سے آگے کے شاہ کی مصروفیتوں، دلچسپیوں، ہنگامہ آرائیوں، غزل سرائیوں اور افسانہ نوازیوں سے سب لوگ آگاہ ہیں۔ مجھے آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ اُس وقت تک میری ہر چیز شاہ کی تھی۔ کوئی مادی چیز ہم دونوں کی محبت میں روڑا نہیں اٹکا سکتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرا سب کچھ شاہ کے لئے وقف ہو جسے وہ فراخ دلی سے اُڑائے۔ شاہ کی خوشی ہی میری خوشی کی معراج تھی۔ میں نے شاہ سے زندگی بھر یہ نہیں کہا کہ جاؤ اور کچھ کما کے لاؤ۔ وہ تو جب کما کے لا رہا تھا تو جب بھی میں اس کی خدمت سے محرومی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ شاہ نے جب بھی کسی خواہش کا اظہار کیا، اسے پورا کرنے سے مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔ آج شاہ ۵۲ برس کا ادھیڑ عمر آدمی ہے، مگر وہ آج بھی میرا لاڈلا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب امی نے مجھ سے شاہ کی شادی کے بندوبست کی بات کی تو میں نے سوچا کہ میں اس موقعے پر بھی شاہ کو اخراجات کے سلسلے میں کوئی تکلیف نہیں دُوں گا تاکہ میرا یہ مشن پورا ہو کہ شاہ کے دل میں کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آئے کہ وہ اکیلا ہے۔ یہ جو شاہ کے کلام میں تنہائی کا ذکر آجاتا ہے تو یہ اس کی کوئی جذباتی یا نظریاتی یا ذہنی تنہائی ہوگی ورنہ میں نے اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ یہ ساتھ چھوٹ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اگر میں نے شاہ سے عشق کیا ہے تو شاہ نے میری پرستش کی ہے۔ ہمارے درمیان ایک لمحے کو بھی کوئی غلط فہمی کبھی پیدا نہیں ہوئی اور میں آج بھی حیران ہوں کہ جب ہم دونوں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ایک ہیں تو ہم دو الگ الگ وجود کیوں ہیں۔

مَیں نے جون ۱۹۴۸ء کے اواخر میں شاہ کو لاہور سے بُلوا بھیجا۔ وہ گاؤں آیا تو یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ اسے شادی کے لیے بُلوایا گیا ہے اور تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ ۴ جولائی کو اس کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب امّی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں تو جیسے وہ محور ہی ٹوٹ گیا جس کے گرد ہم دونوں گھومتے تھے۔ چار برس بعد آپا بھی امّی سے جا ملیں تو جیسے چار طرف سنّاٹا مسلط ہو گیا۔ شاہ مستقلاً لاہور کا ہو کر رہ گیا۔ مَیں ملازمت کے سلسلے میں یہاں سے وہاں گھومتا پھرا۔ اب ہماری مُلاقات محض اتّفاق سے ہو جاتی ہے۔ مگر میں اب بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے شاہ کو دیکھنے کا وقت نکال ہی لیتا ہُوں۔ اسے دیکھنے میں ذرا سی تاخیر ہو جائے تو مَیں بے انتہا اُداس ہو جاتا ہوں اور پھر میرے کانوں میں آج سے ۲۴ سال پہلے کے شاہ کی آواز آتی ہے: "لالہ! مَیں آپ کے لیے اُداس ہُوں، مجھے سینے سے لگا لیجیے نا" —— اور مَیں فوراً اس کی فرمائش پوری کرتا ہُوں —— مجھ سے اس کا لاڈ آج بھی جاری ہے۔

ناهید ندیم

میرے اباجی

میں اپنے اباجی کے بارے میں سوچوں تو سب سے پہلے اُن کا ہنستا چہرہ سامنے آجاتا ہے اور اُن کے ایک دانت کا وہ سونا دمکنے لگتا ہے جو انہوں نے ایک مصنوعی دانت کے سہارے کے لیے صرف اس لئے لگا رکھا ہے کہ دندان سازی کے لئے میں سونے کے سوا باقی سب چیزوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اباجی کا ابھی صرف ایک دانت مصنوعی ہے، پھر عینک کے پیچھے سے ان کی بادامی، گہری، اداس اور اس لیے خوبصورت آنکھیں جھانکنے لگتی ہیں جیسے کسی بات پر خوش ہونے والوں کا ساتھ دینے کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک مہین مسکراہٹ آجاتی ہے، اور دُکھی لوگوں کے دُکھوں میں شریک ہونے کے لیے اُن کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اُداسی آجاتی ہے - اور ہمارے معاشرے میں دُکھی زیادہ ہیں اس لیے اباجی کی آنکھیں زیادہ تر اداس رہتی ہیں۔

آنکھوں کی اس اداسی سے قطع نظر اباجی پریشان، فکرمند یا اُداس ہوں گے تو مجال ہے جو ظاہر ہونے دیں - یہ الگ بات ہے کہ اُن کے خوبصورت ترشے ہوئے ہونٹوں کے گوشوں کے ذرا سا اندر کو دب جانے سے، ان کی آنکھوں کی بادامی رنگت کچھ گہرا

ہو جانے سے اور اُن کی پیشانی کی شکنوں کے اُبھر آنے سے ان کی اُداسی کا راز فاش ہو جائے۔ ویسے وہ مُسکراتے ہی رہیں گے۔ جب تھک جائیں گے تو پلائی وُڈ کی ایک تختی اُٹھا کر قلم ہاتھ میں تھام لیں گے۔ تب ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کچھ لکھنا چاہتے ہیں چنانچہ ہم اُنہیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔

اگر آپ اباجی کو مسرت اور سکون دینا چاہتے ہیں تو یوں کیجیے کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں فرش سے لیکر چھت تک کتابوں کے مینار کھڑے کر دیجیے۔ نیچے، اُوپر، دائیں بائیں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بکھیر دیجیے۔ جس "پلنگ" پر اباجی کو بیٹھنا ہو اس پر تو صرف اُنکے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ دیجیے اور کتابوں کو بے ترتیبی سے پھیلا دیجیے۔ پھر اباجی کو کمرے میں لے آیئے اس کے بعد دیکھیے کہ وہ کتنے خُوش نظر آئیں گے، جیسے اُنہیں دُنیا میں جنّت مل گئی۔ ان کے چہرے پر ایسا سکون اور اطمینان دکھائی دے گا جیسے انہیں سب پریشانیوں اور اُلجھنوں سے نجات مل گئی ہو۔ وہ کتابوں پر پیار سے ہاتھ رکھ کر بڑی معصومیت سے نگاہیں اٹھا کر کہیں گے "بس! مجھے تو یہی جگہ پسند ہے" اب بھی کبھی کبھار (جب فرصت ملے) تو اپنے پلنگ پر کتابیں، رسالے، خطوط، مسوّدات اور اخبار یُوں پھیلا دیتے ہیں کہ ان کے اپنے بیٹھنے کی جگہ مشکل بچتی ہے۔ تب وہ ہنس ہنس کر کہتے ہیں "کتنا اچھا محسوس ہو رہا ہے" اور پھر ہمیں نصیحت کرتے ہیں "کتابیں خوب پڑھا کرو یہ تمہیں انسانیت سے متعارف کرائیں گی"

اباجی سے ہم ادب کے بارے میں خُوب باتیں کرتے ہیں اس لیئے ہم تینوں بہن بھائی بھی ادب کی طرف مائل ہیں۔ میرا ارادہ ادیب بننے کا ہے اور میری چھوٹی بہن نشاط

اور چھوٹا بھائی نعمان، ماشاءاللہ شاعری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اباجی ہمارے ان ارادوں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ پہلے خوب محنت سے تعلیم حاصل کر لو پھر یہ بھی کر لینا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو زمانہ آ رہا ہے وہ ان پڑھوں کو اور ساتھ ہی بچوں کو ان پڑھ رکھنے والوں کو معاف نہیں کریگا۔

شاید شعر و ادب ہی کے رشتے سے انہیں قلم سے بڑی محبت ہے۔ ان کے پاس قسم قسم کے قلم جمع ہیں۔ لیکن اگر کوئی دوست انہیں نیا قلم پیش کر دے تو یوں خوش ہوتے ہیں۔ جیسے کسی ننھے بچے کی خواہش پر اسے کھلونا دے دیا گیا ہو۔ ایک معصوم سی مسکراہٹ لبوں پر لیئے ہمیں خوش ہو ہو کر بتائیں گے۔ قلم میں روشنائی بھر کر صفحے پر کچھ لکھیں گے (عموماً کوئی شعر ہی لکھیں گے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کا اپنا ہی شعر ہو) پھر ہماری طرف یوں مسکرا کر دیکھیں گے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں "اچھا ہے نا؟"۔

یوں وہ اپنے آپ کو ایک نئے قلم اور ایک نئی پنسل سے خوش کر لیتے ہیں مگر دوسروں کے غم انہیں بہت پریشان رکھتے ہیں۔ البتہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی پریشانی سے ہم پریشان نہ ہوں۔ اسی لیئے ہمیں وہ ہر وقت پیاری پیاری باتوں سے خوش کرینگے چاہے ایسا کرنے میں ان کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جائے۔ ہم بھی تو ان کی باتوں میں کھو جاتے ہیں اور ان کے قیمتی وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بڑے لوگ اپنے گھر میں اہلِ خانہ سے گھل مل کر نہیں رہتے۔ ممکن ہے اس میں سچائی بھی ہو مگر میرے اباجی ایسے نہیں ہیں۔ وہ گھر میں ہمیں فنکار نہیں بلکہ اباجی ہی نظر آتے ہیں، بلکہ

ایک بہترین دوست دکھائی دیتے ہیں۔

باتیں کرتے وقت اُن کا لہجہ بہت نرم اور شوخ ہوتا ہے۔ مگر جب اپنے شعر پڑھتے ہیں۔ تو ان کی آواز میں ان کا پورا کردار آجاتا ہے۔ اس میں عزم بھی ہوتا ہے اور اُداسی بھی۔ احتجاج بھی ہوتا ہے اور فریاد بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شعر پڑھ نہیں رہے ہیں، شعر تخلیق کر رہے ہیں۔ اس وقت اُن کی آواز اور ان کا لہجہ، شعر کے ایک ایک لفظ کے مفہوم کو کھولتا چلا جاتا ہے۔ میں تو جب انہیں شعر پڑھتے سنتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ اتنے بھرپور تاثر کے ساتھ کوئی بھی اپنے شعر نہیں پڑھتا۔ ممکن ہے یوں میں اس لئے سوچتی ہوں کہ یہ میرے ابا جی کی آواز ہے۔

وہ ہمیں جو باتیں سناتے ہیں، وہی باتیں اگر کوئی اور سنائے تو لطف نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے باتیں کرنے کا انداز بے حد رسیلا ہے۔ رُک رُک کر، دایاں ہاتھ ہلا ہلا کر وہ عجیب پیارے پن سے باتیں کرتے ہیں۔ سنا ہے انہیں بہت سے لطیفے یاد ہیں۔ مگر وہ تو ایک معمولی بات بھی یوں کریں گے کہ سننے والوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جائے گا۔ اپنے بچپن کی معصوم شرارتوں کے بیان میں تو وہ باقاعدہ "ایکٹنگ" بھی کرنے لگتے ہیں اور بالکل بچوں کے لہجے میں بچوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں۔ اسی لئے میرا دعوٰی ہے کہ میرے ابا جی ذہنی طور پر کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔

ابا جی، دادی جان کا ذکر انتہائی عقیدت سے کرتے ہیں۔ جب اُن کا ذکر آئے تو یہ موضوع دیر تک چلتا ہے۔ پھر وہ چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش بیٹھ جاتے ہیں اور

دیوار پر نظریں گاڑ دیتے ہیں۔ اس وقت مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ماضی کے دُھوئیں میں غیب سے گئے ہیں۔ وہ پھوپھی جان کو بھی بہت یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی بہنیں ہر کسی کو نصیب نہیں ہوا کرتیں۔ وہ یوں تو ہر انسان کا احترام کرتے ہیں مگر خاص طور پر صنفِ نازک کا جو احترام ان کے دل میں ہے اس کی بُنیاد دادی جان اور پھوپھی جان کی دلربا شخصیتوں میں پوشیدہ ہے۔

ابا جی کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا ہے۔ مگر یہ عجیب پیارا سا غصہ ہوتا ہے کہ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ غُصے کی حالت میں ان کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ وہ غصے کا اظہار ایک آدھ لفظ میں کرتے ہیں اور اس کے بعد اسی کو منانے میں لگ جاتے ہیں جس پر انہیں غصہ آیا ہو۔ فوراً غصے کی حالت میں ان کے ہونٹ ذرا سے کانپتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ شرارت کے موڈ میں ہوں تو جب بھی ان کے ہونٹوں کی لرزش ان کا راز کھول دیتی ہے۔ انہیں دُکھ بھی پہنچے تو ہونٹوں کی ہلکی سی کپکپی ان کی غمازی کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابا جی کا کوئی جذبہ کسی سے چُھپا نہیں رہ سکتا۔ صرف اس وقت ان کے ہونٹ لرزنا بھول جاتے ہیں جب کوئی ان کے مُنہ پر ان کی تعریف کر دے۔ اس وقت وہ اتنے سنجیدہ اور مظلوم نظر آتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں میں نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ پھر کس جرم کی پاداش میں میری تعریف ہو رہی ہے۔ خود کہتے ہیں کہ اپنی تعریف کون پسند نہیں کرتا۔ البتہ تعریف کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ چٹان ذرا مشکل ہی سے اُٹھ پاتی ہے۔

اب اباجی کے بارے میں بعض ننھے مُنّے انکشافات سُن لیجئے ۔ انہیں سب رنگوں سے پیار ہے مگر سبز رنگ غیر معمولی حد تک پسند ہے ۔ جب بھی کوئی چیز لائیں گے وہ یا تو بالکل سبز ہوگی یا اُس میں سبزی کی آمیزش تو ضرور ہوگی ۔ اباجی کو بہت تھوڑا کھانا کھانے کی عادت ہے ۔ خصوصاً رات کو تو بہت کم کھاتے ہیں۔

سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد اوولٹین ملا دُودھ پیتے ہیں ۔ یہ تو ادب کے سبھی قارئین کو معلوم ہوگا کہ انہیں میٹھا بہت پسند ہے ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔ انہیں تو ہر میٹھی چیز سے پیار ہے ۔ میٹھے میٹھے کھانوں سے میٹھے میٹھے انسانوں تک اب بھی میٹھے کی فرمائش کرتے ہیں اور کچھ اس شوق سے جیسے جتنا ملے گا ، وہ سب کا سب کھا جائیں گے ۔ مگر جب میٹھا سامنے آئے گا تو دو چار نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیں گے ۔ شاید اسی کم کھانے کی وجہ سے اِن کی صحت عموماً ٹھیک رہتی ہے ۔ ہاں جب ذرا سے بھی بیمار ہوں تو خوب خوب کراہتے ہیں اور اپنے پیاروں کو ہمہ وقت اپنے پاس بٹھائے رکھنے پر مُصر رہتے ہیں اور صحت یاب ہو جانے پر اپنی ہی اس حرکت پر خوب خوب ہنستے اور ہنساتے ہیں ۔

میں نے آج تک جن مردوں کو دیکھا ہے وہ اپنے کاموں سے بہت حد تک بے نیاز ہوتے ہیں ۔ لیکن اباجی اپنی ایک بیوی ، تین بچّوں اور ایک مُلازم کے باوجُود اکثر اپنے کام خود کر لیتے ہیں ۔ مثلاً جو کپڑے اُتارے ، وہ خود تہ کر کے رکھ دیئے یا ٹانگ دیئے ۔ شیو کی اور شیو کا سامان خود ہی صاف کر کے قرینے سے رکھ دیا ۔ اُن کی اسی عادت کی وجہ سے

ہم سے ان کے کام کرنے میں بعض اوقات کوتاہی ہو جاتی ہے۔ مگر جب ان کا کوئی کام نہ ہو تو ناراض نہیں ہوتے۔ اوّل تو شکایت بھری نظروں سے دیکھ لینا کافی سمجھتے ہیں اور اگر کچھ کہیں گے بھی تو صرف اتنا کہیں گے "یاد ہے میں نے کچھ کہا تھا؟" اور ہمارے لیے ان کے یہ بے ضرر الفاظ بھی کوڑے کا حکم رکھتے ہیں۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ اباجی ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے شعر پڑھوں تو یوں لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ میں نے کہا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گی کہ اباجی میرے پسندیدہ شاعر ہیں (اکثر لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے پسندیدہ شاعر تو تمہارے اباجی ہی ہوں گے) میں نے ابھی کسی شاعر کو اس نظریے سے نہیں پڑھا کہ وہ مجھے پسند ہے یا ناپسند۔ آیندہ بھی ایسا کرنے کا ارادہ نہیں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ہر شاعر اپنی جگہ بڑا ہے۔ میں تو ہر بڑے شاعر کی شاعری یہ سوچ کر پڑھتی ہوں کہ اس نے اس میں اپنا خونِ جگر کھپایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اباجی کے اشعار بھی ندیم کے اشعار سمجھ کر پڑھتی ہوں۔ میرے نزدیک ایک اچھے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کی شاعری پڑھتے اور سنتے ہوئے یوں محسوس ہو:

ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اباجی کی شاعری پڑھتے اور سنتے وقت مجھے ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک وہ بڑے شاعر ہیں۔ میرے یہ چند پسندیدہ شعر پڑھیے اور خود ہی فیصلہ کیجیے کہ ایسا کہتے ہوئے ایک بیٹی اپنے اباجی کو داد دے رہی ہے یا ایک قاری، ایک

شاعر کی عظمت کا اعتراف کر رہا ہے :-

چراغ تھکنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آسکے گا مرے خانۂ تباہ میں تو

○

کشتِ ویراں، ابھی برسات کی رُت باقی ہے
بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی

○

ندیم، فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں
بہ ایں غریب کشی جور ہے غریب نواز

○

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

○

ہر زمانے میں بجھے تو نہیں رہتے خورشید
گردشو، آج مری شب کو سحر کر دیکھو

○

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہوس آفرینی کو
کرن کے رُوپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

○

ٹوٹی ہُوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم، بہار کا نشاں ہے

○

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
مَیں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

○

لفظوں کے سینے شق ہیں، معنی عرق عرق ہیں
مَیں نے کتابِ ہستی کھولی جہاں جہاں سے

○

وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار، ندیمؔ
ہم جو ٹھہرے تو اُفق دُور نکل جائے گا

○

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
مَیں لا رہا ہُوں خود اپنے لہُو سے بھر کے چراغ!

اب میں کیا بتاؤں کہ میرے اباجی میرے لیئے کیا کیا کچھ ہیں۔ وہ ایک عظیم ہستی ہیں ایک قابلِ احترام بزرگ ہیں۔ ایک معصوم اور شریر بچہ ہیں، ایک بہت اچھے انسان ہیں، ایک بہت مخلص دوست ہیں، ایک حساس شوہر ہیں، ایک لافانی شاعر ہیں، ایک بے مثال ادیب ہیں، ایک بے بدل مزاح نویس اور شگفتہ گو ہیں۔ ان کے اوصاف کا احاطہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔

میں سمجھتی ہوں ان کی شخصیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

خود اباجی نے ایک غزل میں کہا ہے:

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

یہ مختصر تاثر لکھتے ہوئے میرا بھی یہی بار بار جی چاہا۔ مگر میں کہاں اور تخلیقِ فن کہاں۔ پھر تخلیقِ فن کی منزل خدا جانے آئے یا نہ آئے۔ مگر میرے لیئے یہی بات عمر بھر فخر کرنے کے لیئے بہت ہے کہ میں ندیم کی بیٹی ہوں۔

ہاجرہ مسرور

ندیم اور غمِ روزگار

"میں ایک ایسے خاندان کا فرد ہوں جو علاقے بھر میں
امیر سمجھا جاتا ہے۔ جو گھر سے باہر موٹر کاروں میں گھومتا
ہے اور گھر کی چار دیواری میں افلاس کی خوفناک ترین
صورت سے دوچار ہوتا ہے" —— ۲۶ جون ۱۹۴۷ء

ننھے احمد شاہ نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں اُن کے لئے ریشم کا پالنا نہ تھا۔ گھٹنوں چلے تو ان کے ننھے ننھے ہاتھوں اور گھٹنوں تلے قالین کے بجائے کچا آنگن تھا۔
مغربی پنجاب کے ضلع سرگودھا کی تحصیل خوشاب میں سرخ بنجر پہاڑوں سے گھرے ہوئے گاؤں انگہ میں احمد شاہ ہی صرف ایسے نہ بچے نہ تھے جنہوں نے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ یہ تو وہ جانا پہچانا ماحول ہے جس میں نہ صرف ایک گاؤں کے بلکہ غریب مشرق کے لاتعداد گھروں کے بچے اسی طرح پلتے بڑھتے ہیں۔ یہ بچے اپنی ماؤں سے ان ریشمی پالنوں کی کہانیاں ضرور سنتے ہیں جن میں پریاں اور شہزادیاں جھولا جھولتی ہیں اور ان قالینوں کا بھی تصور کر سکتے ہیں جن پر بیٹھ کر جادوگر، دیو، اور شہزادے فضا میں اُڑ جاتے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی قابلِ ذکر بات معلوم نہیں

ہوتی۔ لیکن ننھے احمد شاہ کے لئے یہ حقیقت عجیب سی تھی کیونکہ انہوں نے آنکھ کے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہاں پیروں کے علاوہ ان کے اپنے جیسے کئی بچے قالینوں پر گھٹنیاں چلتے اور ریشمی پالنوں میں جھُولتے تھے۔

یہ خاندان آنکھ کے پیروں کا معزز خاندان تھا۔ یہ لوگ دُنیاوی اعتبار سے بہت خوشحال تھے۔ ننھے احمد شاہ کے والد گرامی بھی انہی پیروں کے ایک سگے بھائی تھے۔ اور انہیں چن پیر (چاند پیر) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مگر یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ان چن پیر (چاند پیر) کے گھر میں دولت کی روشنی کے بجائے تنگ دستی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرے خیال میں ننھے احمد شاہ بے حد خوش نصیب تھے جو اس گھر میں پیدا ہوئے۔ کیونکہ اس گھر میں ایک بڑی بہادر اور محترم ماں رہتی تھیں۔ یہ ماں زندگی کی مسدود راہوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہارتیں اور وہ پگڈنڈیاں تلاش کر لیتیں جن پر چل کر اپنے بچوں کی خوشیوں کے پھُول چن لاتیں۔ کیا ہوا جو وہ اپنے بچوں کے لئے ولایتی کھلونے خریدنے کی سکت نہ رکھتی تھیں مگر وہ ان کے کھیلنے کے لئے پُرانی روئی اور چھینٹ کے کپڑوں سے خوبصورت گیند تو بنا سکتی تھیں۔

اسی گھر میں ننھے احمد شاہ سے سات سال بڑی ایک بہن بھی تھیں جن کا دامن پکڑ کر انہوں نے چلنا سیکھا۔ اور یہ تھیں سعیدہ آپا۔ بہنیں تو تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ ان گھروں میں بھی ہوتی ہیں جن کے بھائی دوسروں کی بہنوں کو اغوا کر لیتے ہیں، کنیز بنا کر فروخت کر دیتے ہیں، بازاروں میں بٹھا دیتے ہیں۔ مگر ننھے احمد شاہ کی بہن ایک ایسی غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں جن کے وجُود نے ننھے احمد شاہ کے دل میں بہن کے رشتے سے والہانہ محبت اور احترام کا بیج کچھ اس طرح

بڑہا کہ وہ بڑھ کر چھتنار درخت بن گیا۔ ایک ایسا چھتنار درخت جس کی چھاؤں میں بیٹھی میری جیسی کئی بہنیں فخر کرتی ہیں۔

اس گھر میں ننھے احمد شاہ سے دو ڈھائی سال بڑے بھائی محمد بخش بھی تھے۔ جن کے ساتھ یہ کپڑے کی گیند کھیلے۔ ان کی انگلی پکڑ کر گاؤں کی گلیوں میں سیر کو نکلے اور انہی کے ساتھ تختی بستہ لیکر اسکول گئے۔ یہ بھائی عمر کے اتنے کم فرق کے باوجود عملاً ان کی زندگی کے رہنما بھی تھے اور ہمراہی بھی۔ بھائی جان کا یہ رول اس وقت بھی قائم رہا جب ننھے احمد شاہ احمد ندیم قاسمی بن گئے۔ اور آج بھی قائم ہے جب کہ ندیم بھیا نے پلک جھپکنے میں عمر کے پچاس سال پورے کر لئے ہیں۔

جب احمد شاہ اسکول کی تیسری جماعت میں تھے اور ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی تو والدِ گرامی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ـــــــــ آٹھ سال کی عمر تک تو بچے کے ذہن میں یادوں کا ایک ایسا ذخیرہ ہو جاتا ہے جسے وہ عمر کے کسی حصے میں نہیں بھلا سکتا۔ آٹھ سال کی عمر سے بھی پہلے کی بہت سی یادوں کا ذکر میں نے ندیم بھیا کی زبان سے بارہا سنا ہے۔ ان یادوں میں امی، بھائی جان اور آپا کی میٹھی میٹھی باتیں ہیں۔ ان یادوں میں امی کے کہے ہوئے ماہیوں کی کلیاں ہیں۔ کپڑے کی گیند ہے۔ آپا کی شادی ہے اور گھر سے رخصت ہوتی ہوئی آپا کے آنسوؤں کے موتی ہیں۔ بھائی جان کی معصوم سرپرستی کے تذکرے ہیں، چچا زاد بھائیوں کی محبت کے قصّے ہیں۔ بھائی جان سے پہلی جُدائی کی کیفیت ہے ـــــــ مگر ان یادوں کے ذخیرے میں والدِ گرامی کے سینے کی گرمی، ان کے لبوں کا کوئی بوسہ یا ان کے ہاتھوں کا

دیا ہوا کوئی کھلونا نہیں۔ کم از کم مَیں نے اس کا ذکر ندیم بھیا کی زبان سے کبھی نہیں سُنا۔ یہ تھا ننھے احمد شاہ کے بچپن کا ماحول جسے وہ گھر کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں۔

گاؤں کے اسکول سے چوتھی جماعت پاس کر کے وہ مزید تعلیم کے لئے اپنے شفیق چچا پیر حیدر شاہ اور مہربان چچی کے پاس آ گئے۔ یہ چچا صاحب اس وقت کیمبلپور میں افسر مال تھے۔ یہاں بڑے بھائی محمد بخش اور چچازاد بھائی محمد حیات (مرحوم) پہلے سے موجود تھے۔ پیر حیدر شاہ صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ دنیا میں بہت سے لاولد جوڑے ہیں جو کسی دُوسرے کے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ بھی نہیں پھیر سکتے۔ مگر یہ لاولد جوڑا ایسا تھا جس نے اپنی زندگی کا مقصد اپنے بھتیجوں کی اعلیٰ تعلیم قرار دیا تھا۔ ان کے پاس امیر بھائی کے بیٹے محمد حیات بھی تھے۔ اور غریب بھائی کے بیٹے محمد بخش اور احمد شاہ بھی۔ ان کی زیرِ سرپرستی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کا اس کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہا۔

یہ چچا اور چچی نیکی کی ایک مثال تھے۔ انہوں نے محسن کی طرح نہیں ماں باپ بن کر ان بچوں کو اپنے زیرِ سایہ رکھا۔ یہاں یہ بچے ٹھاٹ سے بنگلے میں رہتے اور موٹر میں گھومتے۔ یہ تھا ندیم بھیا کے گھر اور گھر سے باہر کا ماحول جس کا ذکر خط کے اقتباس میں ہے۔

گھر سے باہر یعنی چچا صاحب کے پاس سال کے دس مہینے وہ ٹھاٹ سے رہتے اور جب گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر یعنی انگہ آتے تو پھر وہی دُنیا ان کے سامنے ہوتی جہاں خاندان کے تقریباً سارے گھروں میں خوشحالی تھی اور ان کے اپنے گھر کی چار دیواری میں جینا اسی طرح دشوار تھا۔ الف لیلیٰ کے ابوالحسن سے بادشاہ نے چند دن دُکھ سکھ کا کھیل کھیلا تھا۔ مگر یہاں زندگی نے

برسوں سے ندیم بھیا سے یہی مذاق جاری رکھا۔

شیخوپورہ سے بھیا نے میٹرک پاس کیا اور پھر صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں مزید تعلیم کے لئے بھیج دیئے گئے۔ اس کالج میں بڑے بھائی اور چچازاد بھائی پہلے سے ان کے منتظر تھے۔

طالب علم ندیم کو کالج میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ کم از کم ان کے کالج کے اُستاد اور دوسرے طلبا ضرور ایسا سمجھتے تھے۔ دو ڈھائی سال وہ اپنے کالج اور ہوسٹل کی دُنیا میں مگن رہے۔ لیکن تھرڈ ایر میں پہنچے تو اچانک ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو کالج اور ہوسٹل کی دُنیا سے باہر بھی قوم کے ہونہار سپوت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ انکشاف کرنے والے بہاولپور کے وہ بڑے بڑے لوگ تھے جو اب اچانک اس ہونہار طالب علم سے ملنے کے لئے ہوسٹل میں پہنچنے لگے تھے۔

اس عزت افزائی سے طالب علم ندیم کو یقین ہو گیا کہ آخر بہاول پور کے بڑے لوگوں کو ان کی ادبی صلاحیتوں کا علم ہو ہی گیا۔ مگر جب اس ہونہار طالب علم کے بڑے بڑے ملاقاتیوں نے ان سے ان کی نظموں کا کوئی ذکر نہ کیا تو سوچا کہ ہو نہ ہو، یہ حضرات ان کی اس زبردست ایکٹنگ سے متاثر ہو گئے ہیں جو انہوں نے کالج کے اسٹیج پر "سہراب" کے رُوپ میں پیش کی تھی ——— بہرحال یہ خوشی سے پھُولے نہ سمائے۔

اچانک ایک دن ان کے چچا صاحب ان کے پاس یہ خوش خبری لائے کہ انہیں ریاست کے مشیر مال کی حیثیت سے تقرری کا پروانہ مل گیا ہے اور اب وہ چند دن کے لیے کسی ضروری کام سے انگہ جا رہے ہیں، واپس آ کر نئے عہدے کا چارج لیں گے۔ —— پتا تھا۔

انگلہ چلے گئے لیکن پھر ان کے بجائے ان کی اچانک موت کی خبر بہاول پور پہنچی۔ روشن مستقبل کے خوابوں میں کھوئے ہوئے نوعمر طالب علم ندیم پر اس خبر سے قیامت گزر گئی۔ مگر اس کے بعد بہاول پور کے کسی بڑے آدمی نے " قوم کے اس سپوت " سے تعزیت کرنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی۔

اب زندگی میں پہلی بار ندیم بھیا کو احساس ہوا کہ 'گھر' اور 'باہر' سمٹ کر ایک ہو چکے ہیں۔ بڑے بھائی اور چچازاد بھائی بی۔اے کر کے کالج سے جا چکے تھے۔ اِن کا اپنا کوئی بھی پاس نہ تھا۔ صرف دوستوں اور استادوں کی تسلیاں اور مشفقانہ تھپکیاں ان کا سہارا تھیں۔ ان سے فرصت پا کر جب وہ کچھ سوچنے کے لئے بیٹھے تو بس یہی سوچ سکے کہ اب میں بی اے نہیں کر سکوں گا۔ بلکہ کوئی نوکری تلاش کروں گا۔ اور یہ بات اُنہوں نے خط میں بڑے بھائی کو لکھ دی۔

بڑے بھائی ان دنوں بہاول پور سے دُور ایک چھوٹی سی جگہ پر ایک اسکول میں برائے نام تنخواہ پر پڑھا رہے تھے۔ یہ ملازمت صرف بی ٹی میں داخلے کی خاطر کی گئی تھی — اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی مایوسی دیکھی تو لکھا کہ نہیں تم بی اے ضرور کرو گے۔ میں اس سلسلے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ بی۔اے کے بغیر تمہیں کوئی معقول ملازمت ہرگز نہیں ملے گی۔

اِدھر بھائی نے ہمت بندھائی اُدھر کالج کے اُستاد پیرزادہ عبدالرشید (مرحوم) نے ہر ممکن طریقے پر اپنے چہیتے شاگرد کے لئے وہ حالات پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے ندیم بھیا نے تعلیم کا بقیہ ایک سال ہوسٹل میں رہ کر مکمل کر لیا۔

اب وہ پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی بی۔اے تھے، اور بقول بڑے بھائی معقول

نوکری کے مستحق۔ اس زمانے میں بی اے پاس کو کلرکی مل جانا خوش نصیبی سمجھی جاتی تھی۔ مگر کلرکی ندیم بھیا کے لئے وہ محبوبۂ طناز ثابت ہوئی جو لاکھ پاپڑ بیلنے پر بھی ان کے ہاتھ نہ آئی۔ گاؤں میں والدہ کے پاس بیٹھے وہ درخواستوں پر درخواستیں بھیجتے رہے لیکن کوئی کام نہ بنا۔ اسی دور میں کسی نے مشورہ دیا کہ میاں تم نے کلرکی کو بھی کوئی ایسی ویسی ملازمت سمجھ رکھا ہے جو صرف بی اے پاس کرنے سے مل جائے گی۔ پہلے ٹائپ رائٹنگ سیکھو اور اگر اللہ توفیق دے تو شارٹ ہینڈ بھی۔ ندیم بھیا کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لئے راولپنڈی ایک عزیز کے ہاں جا پہنچے۔ تین مہینے ٹائپ رائٹنگ سیکھنے کے بعد شارٹ ہینڈ سیکھنا انہیں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنا محسوس ہوا اس لئے اپنی تھکی ہوئی انگلیاں سہلاتے ہوئے پھر گاؤں آکر بیٹھ گئے۔ کیونکہ نوکری اب بھی نہیں ملی تھی۔ گاؤں میں پیسے برائے نام تھے مگر سال کے سال آبائی زمین سے اتنا گندم ضرور آجاتا جس کا خمار ان سے شعر کہلوا لیتا۔ اب شاید یہ صرف لکھنے پڑھنے کے شوق کے ہی ہو رہے۔ لیکن گاؤں میں یہ بات بڑی عجیب سی تھی کہ کوئی شخص نوکری یا کاروبار کرنے کے بجائے گھر کے ایک کونے میں بیٹھا قلم کاغذ سے الجھتا رہے۔

اس بار ایک اور عزیز سامنے آئے اور انہوں نے خاندان کے ایک نوجوان کو محض ادیب رہنے کی ذلت سے بچانے کے لئے مشورہ دیا کہ لاہور چلو۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے اور وہاں نوکریاں بھی بہت ہیں۔ اور ندیم بھیا بڑی سعادت مندی سے لاہور چلے گئے۔

اس دور میں لاہور نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا اندازہ بھی ۲۶ جون ۱۹۳۷ء کے

اس خط کے کچھ اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے جس کا ایک اقتباس میں نے اس مضمون کی ابتدا میں دیا ہے۔

"آج سے دس گیارہ سال ادھر کا ذکر ہے کہ میں لاہور میں ملازمت تلاش کرنے گیا۔ محتاجوں کی طرح دفتر دفتر گیا۔ بیس روپیہ ماہانہ کی ملازمت کے لئے ——— میں گریجوایٹ تھا اور ان دنوں بھی کچھ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ ہر مقام پر مجھے منہ کی کھانا پڑی۔ میری غذا یہ ہوتی تھی کہ صبح کو پیٹ بھر پانی پیا۔ دوپہر کو آدھا نان اور دو پکوڑے تیل میں تلے ہوئے نمک سے۔ شام کو پھر یہی نان اور دو پکوڑے اور قصہ تمام!! ——— ایک روز مجھے بخار ہو گیا۔ میں ایک رشتے دار کے پاس رہتا تھا جس نے بھولے سے بھی میری کوٹھری میں کبھی نہ جھانکا تھا۔ اسے علم تک نہ ہوا اور میں تین روز، پورے تین روز ایک بالکل اندھیرے کمرے میں بھوکا پیاسا تڑپتا رہا اور پھر میں نے مرنے کی ترکیبیں سوچیں۔ دیوار سے سر پھوڑ لوں، باہر نکل کر کسی موٹر کی جھپیٹ میں آجاؤں۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر اپنی گردن رکھ کر اسے کاٹ ڈالوں! مگر میں مر نہ سکا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس بزدلانہ فعل سے محفوظ رہا۔

اچانک ایک ہندو دوستؔ[1] کو میرا خیال آیا۔ وہ روزانہ شام کو مجھے آدھا سیر دودھ دے جاتا۔ بخار ٹوٹا اور میں باہر آیا۔ مجھے ایک جگہ سے قلم کی تھوڑی سی کمائی ملی جس سے میں نے افیون خریدنا چاہی کہ کھا کر لیٹ رہوں اور یہ خرخشے ختم ہوں۔ مگر نہیں میں نے اس روز تین چار فلمیں دیکھیں اور پھر تمام رات سڑکوں پر گھومتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر میں مر جاؤں تو نہ

---

[1]: منوہر لال، جن کے نام ندیم کے افسانوں کا ایک مجموعہ منسوب ہے۔

دُنیا کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ مجھے ——————

میں نہیں مروں گا۔ میں زندہ رہوں گا۔ میں اپنے مقدر کا مقابلہ کروں گا اور اس مقابلے میں لذت پیدا کروں گا۔ اس کے بعد میں لاہور کے باغوں میں پیٹ پر اینٹوں کے ٹکڑے رکھے گھنٹوں لیٹا رہا۔ اِس لئے کہ مجھے دو دو روز فاقوں سے کاٹنا پڑے مگر میں مرا نہیں اس لئے کہ میں نے فطرت اور مشیت سے مقابلے کی قوت پیدا کر لی تھی۔ جب پیٹ پر سے اینٹوں کے ٹکڑے اٹھا کر گھر جانے کی کوشش کرتا تو میرا سر چکرا جاتا۔ میں دھم سے گر جاتا۔ سڑکوں پر سے لوگ ہنستے چہچہاتے گزرتے رہتے تھے اور مجھے بالکل غصہ نہ آتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے یہ ہنسی اور چہچہاہٹ مقدر کے ہاتھوں سے چھیننا تھی۔ میں بے بس نہ تھا۔ آخر میں بھی انسان تھا اور انسان کی قوتیں بیکراں ہیں ——————"

خالی پیٹ، خالی جیب نوجوان ندیم کو جب انسان کی بے کراں قوتوں کا احساس ہوا تو انہوں نے مقدر کے ہاتھوں سے اپنے حصّے کی ہنسی اور چہچہے چھیننے کی کیسی کیسی کوششیں کیں، مگر کون جانے کہ ہنسی اور چہچہے تو بھاری جیب اور بھرے پیٹ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب بھی یہ ہنسی اور چہچہے سکّوں کی مالا پہن کر ان کے قریب آئے تو انہوں نے ان کا سواگت کس لاپروائی سے کیا۔ یہی داستاں میں یہاں دُہرانا چاہتی ہوں۔

ندیم بھیا نے خط میں جن بیس روپے ماہانہ کی ملازمتوں سے محرومی کا ذکر کیا ان میں سے ایک تو انجمن حمایت اسلام کے دفتر میں ایک جونیئر کلرک کی آسامی تھی۔ لاہور پہنچ کر سب سے پہلے جو اطلاع انہیں ملی وہ یہی تھی کہ یہ جگہ خالی ہے۔ انہوں نے فوراً درخواست داغ دی جو

فی البدیہہ نامنظور ہو گئی۔ اس واقعے کا ایک دلچسپ پہلو بھی ہے اور میں نے صرف اسی لیے اس ناکامی کا ذکر کیا ہے کہ یہ دلچسپ پہلو پوری طرح اجاگر ہو جائے ـــــ ہوا یوں کہ جو انجمن ندیم کو اپنے زیر سایہ جونیئر کلرک کی جگہ بھی نہ دے سکی اس نے اس واقعے کے پورے دو سال بعد اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر ان ـــ ب کو بہترین نظم کا طلائی تمغہ عنایت کر دیا۔ (یہ تمغہ آج بھی بھابی کے پاس ایک مقدس تحفے کی طرح محفوظ ہے)۔

نوکری حاصل کرنے کی کوششوں میں متعدد ناکامیوں کے بعد وہ اسی طرف لوٹے جس کا انہوں نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔ ("ان دنوں بھی میں کچھ لکھ پڑھ سکتا تھا")۔ یعنی اب وہ "تہذیبِ نسواں" کے لیے انگریزی کے زنانہ رسائل سے چھانٹے ہوئے افسانوں کا ترجمہ کرنے لگے۔ ان ترجموں کا کچھ معاوضہ مل جاتا تھا۔ (یہ افسانے مترجم کے نام کے بغیر شائع ہوتے تھے) اس کے ساتھ جہاں کہیں ٹائپ کا کام مل جاتا اس سے کچھ روپے کما لیتے۔ مگر یہ "لکھنے پڑھنے" سے حاصل کی ہوئی کمائی تھی۔ کسی کی نوکری نہ تھی۔ اس لیے ان کے ایک خیرخواہ بزرگ سمجھاتے کہ بھائی نوکری ڈھونڈو نوکری۔ نوجوان ندیم کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ وہ قلم کی تھوڑی سی مزدوری کو نوکری پر ترجیح دیتے۔ مگر مجھے اس وقت "دھڑکنیں" کے قطعات اور "جوانی کا جنازہ" جیسے افسانوں کا خیال آیا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شاید اس زمانے میں نوعمری کے کسی شدید روحانی جذبے نے بھی انہیں نوکری کی تلاش پر مجبور کیا ہوگا۔ کیونکہ شہر ہو یا دیہات روحانی جذبہ جب قیدِ شریعت میں آنے کی کوشش کرتا ہے، جذبے کی شدت کے بجائے مستقل آمدنی کی پوچھ ہر جگہ ہوتی ہے۔ (ویسے وہ آج تک ہم بہنوں کے چھیڑنے

اور پُوچھنے پر کچھ قبوے نہیں) چنانچہ ٹائپ رائٹنگ جاننے والے گریجوایٹ ندیم کو آخر نوکری مل گئی۔

اِس نوکری کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اِنڈیا ایکٹ کے تحت جو ریفارمز کمشنرز مقرر ہوئے تھے اِن کے دفتر میں محرر کی معزز آسامی پر موصوف کا تقرر ہو گیا، تنخواہ تھی مبلغ بیس روپے۔ اس رقمِ خطیر کے لیے کام کرنے والے محرر حضرات گریجوایٹ تھے لیکن اُنکا افسر پٹواری تھا۔ محرر چٹائیوں پر بیٹھتے اور پٹواری صاحب چارپائی پر تشریف فرما ہوتے۔ چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے گریجوایٹوں کا کام ووٹروں کی فہرستیں مرتب کرنا تھا۔

بہر حال اس ملازمت سے حاصل کیے ہوئے بیس روپوں سے محرر ندیم کا اپنا سوشل سٹیٹس اِتنا ضرور اونچا ہو گیا تھا کہ بھاٹی گیٹ کے اندر اُونچی مسجد کے سامنے دکانوں پر بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اسی زمانے میں بڑے بھائی بی ٹی میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آ چکے تھے۔

اب دونوں بھائی باقاعدہ گھر والے بن بیٹھے۔ مگر یہ گھر بھی عجیب تھا۔ ندیم بھیا اس گھر کا ایک قصہ بہت خوش ہو کر سُناتے ہیں۔ اس قصے سے اس گھر کی بے سروسامانی کا پُورا پُورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہُوا یہ کہ کالج کے زمانے کے ایک دوست (جو افسر بن چکے تھے) ان سے ملنے آئے گھر دار ہونے کی رعایت سے دوست کی خاطر مدارات لازم تھی۔ اب خاطر کی جائے تو کیسے، چائے سے زیادہ سستی اور اسٹینڈرڈ چیز کے سوا کچھ اور نہ سُوجھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس

زمانے میں لاہور کے ان محلوں میں چائے کی دکانوں کے بجائے لسی کی دکانیں تھیں اور گھر میں چائے بنانا محال۔ وجہ یہ تھی کہ بیس روپے میں مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد چائے کی لت کا دوبارہ اعادہ ناممکن سا تھا اس لئے گھر میں کیتلی اور پیالیوں کی بجائے صرف لوٹا اور گلاس کی حد تک برتن رکھے گئے تھے۔ اب مشکل یہ تھی کہ چائے کا پانی نہ تو لوٹے میں اُبالا جا سکتا تھا نہ گلاس میں۔ خیر سے اس کٹھن وقت میں انہیں اپنا تنور والا یاد آیا جہاں سے یہ اپنا کھانا منگوایا کرتے تھے۔ (یہ تنور والا اپنے تنور کو ہوٹل کہا کرتا تھا) تنور والے کے پاس پہنچے اور اپنی بپتا سنائی تو اس کا دل پگھل گیا۔ چائے بنانے کا اہم کام تو اپنے ذمے نہ لیا مگر کمال مہربانی سے صرف دو آنے وصول کر کے، ایک عدد دھوئیں سے کالی پتیلی ان کے ہاتھ میں تھما دی اور بڑی شفقت سے کہا کہ آپ جا کر پانی اُبالئے، دودھ اور چائے کی پتی ابھی بھجواتا ہوں۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران بڑے بھائی نے ان دوست کو باتوں میں لگائے رکھا۔

چائے کا پانی اُبالنے کے لئے پہلے تو پرانے اخبار کام آئے پھر رسالوں تک نوبت آ گئی بڑی دقت سے پانی ابلنے کا شبہ ہوا تو جھانک کر دیگچی میں دیکھا۔ عجیب نقشہ تھا۔ چائے کی پتی ڈالے بغیر ہی رنگ چوکھا آ گیا تھا۔ بہرحال جلے ہوئے کاغذوں کو نتھار کر الگ کیا اور پھر اسی پانی سے چائے تیار ہو گئی۔ اللہ جانے اتنی لذیذ چائے پی کر ان افسر دوست پر کیا گزری ہو گی مگر یہ ضرور تھا کہ دونوں بھائی اپنی طرف سے کی ہوئی مدارات پر قطعی مطمئن تھے۔ یہ قصہ سوچ کر آج بھی ندیم بھیا بہت محظوظ ہوتے ہیں۔

مگر ندیم شاید ابھی کچھ اور عرصہ دوڑوں کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے اگر "دوات اور

روشنائی" کا چکر دوسری صورت میں ان کے سامنے نہ آتا۔

دوسری صورت بیان کرنے سے قبل دوات اور روشنائی کا پہلا قصہ بھی سن لیجیے۔ نذیر بھیا کہتے ہیں کہ جب والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور گھر میں تنگ دستی اپنی حدوں کو چھونے لگی تو امی کے لاکھ چھپانے کے باوجود ہم بچوں کو بھی احساس ہو گیا کہ زندگی تنگ دلی پر آمادہ ہے اخراجات کھٹک کر پورے کیے جاتے ہیں اور چھوٹا سا نقصان بھی ناقابلِ برداشت ہے لیکن انتہائی احتیاط کے باوجود ایک دن جب میں اسکول سے واپس آ رہا تھا تو راستے میں کھردرے پتھروں سے ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ دوات ٹوٹ گئی، روشنائی بہہ گئی، گھٹنے اور کہنیاں چھل گئیں۔ گھر آ کر میں نے ڈرتے ڈرتے امی کو اس حادثے کی اطلاع دی اور انہیں دوات خریدنے کی فکر سے نجات دلانے کو کہا کہ اب میں قلم سے تختی نہیں لکھوں گا۔ امی نے بڑی لاپروائی اور شفقت سے کہا۔ "اور دوات کی فکر نہ کرو، تختی ضرور لکھو گے" اس کے بعد فوراً ہی امی نے توے سے کالک کھرچی، آنگن میں لگی بیری سے گوند کھرچا اور کھلے منہ کی شیشی میں روشنائی تیار کر دی۔ اس دن یہ دوات اور روشنائی پا کر میں اتنا خوش ہوا کہ اس عمر میں اس سے پہلے اتنی خوشی کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اور آج بھی مجھے اپنے قلم میں وہی روشنائی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ننھے احمد شاہ کو تو ماں نے دوات اور روشنائی مہیا کر دی تھی۔ مگر اس دن محمد ندیم کے سامنے خالی دوات رکھی تھی جس میں روشنائی بھرے بغیر ووٹروں کی فہرست مرتب نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے پٹواری افسر سے خالی دوات کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ دوات لے کر پریس کی عمارت میں جاؤ اور فلاں صاحب سے روشنائی ڈلوا کر لے آؤ۔

محرر ندیم کا یہ چٹائیوں اور چارپائی والا کمرہ دفتر لاہور کے مشہور گلاب سنگھ پریس میں تھا اور اسی پریس کی عمارت کے ایک حصے میں پٹواری افسر اور محرر گرداوروں کے نگرانِ اعلیٰ کا دفتر تھا اور وہیں کہیں روشنائی مہیا کرنے والے صاحب بھی پائے جاتے تھے۔ بظاہر یہ فاصلہ چند منٹوں میں طے کیا جا سکتا تھا مگر محرر ندیم کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ یہ فاصلہ زندگی بھر چلنے کے باوجود طے نہ کر سکیں گے۔ "دوات اور روشنائی" جو بچپن میں ان کے تعلیمی مستقبل کی علامت تھی آج وہ ان کے بیس روپے مہینے کی ضامن تھی مگر آج دوات میں روشنائی بھروالانے کا حکم انہیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کو ذلیل کر دیا ہو۔ انہوں نے اس حکم کے جواب میں رجسٹر بند کر کے قلم ایک طرف رکھ دیا اور چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے افسر سے اسی کے لہجے میں جواب دیا "میں نے یہاں دفتروں کی فہرستیں مرتب کرنے کی شرط پر ملازمت کی تھی، روشنائی بھر کر لانے کی شرط نہ تھی۔ اس لیے میں یہ کام نہیں کروں گا۔"

اس حکم عدولی کی شکایت نگرانِ اعلیٰ سے ہوئی۔ مگر یہ صاحب شریف آدمی تھے، انہیں ملک میں پھیلی ہوئی بیروزگاری کا احساس تھا اس لیے انہوں نے بڑی ہمدردی سے سمجھایا کہ نوکری میں "ایسی" ذرا ذرا سی" باتوں کو محسوس نہیں کرتے۔ مگر پیرزادہ ندیم اس کے سوا کچھ نہ سمجھے کہ اپنی اس ذرا سی توہین کا بدلہ صرف اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔

اس سے پہلے استعفے کی عبارت دونوں بھائیوں نے سر جوڑ کر بڑے جوش و خروش سے کاغذ پر منتقل کی۔ اور جب یہ کاغذ ہاتھ سے نکل گیا تو روحیں سرشار تھیں مگر جیبیں خالی۔

انہی دنوں بی نے سمجھایا کہ ٹیلیفون آپریٹروں کے امتحان میں بیٹھ جاؤ۔ اس امتحان میں

کامیاب ہو گئے تو آرام سے رہو گے۔ چٹائی کے بجائے کرسی ملے گی۔ دوات اور روشنائی سے جان چھوٹ جائے گی۔ فرصت میں افسانے اور شعر لکھنے کی چاٹ بھی پوری کر لیا کرنا۔

چنانچہ یہ حضرت بڑی سعادت مندی سے امتحان میں بیٹھے اور اتفاق سے پاس بھی ہو گئے۔ بھیا ندیم کہتے ہیں: "میں خود حیران ہوں کہ کیسے پاس ہو گیا جبکہ اس نامراد امتحان میں حساب کا ایک سوال بھی شامل تھا۔"

اس کامیابی کے صلے میں انہیں اوکاڑہ منڈی میں ٹیلیفون آپریٹر کی کرسی مل گئی اور یہ ٹیلیفون ایکسچینج کی عجیب سی دنیا میں بورڈ پر تھرکتے ہوئے نمبروں کے سامنے جا بیٹھے۔

ندیم بھیا کہتے ہیں کہ "نمبر پلیز، نمبر پلیز کی رٹ لگاتے ہوئے مجھے یوں لگتا جیسے میں خود ایک مشین ہوں۔ ان دنوں میرے ذہن میں نہ کوئی شعر تڑپا نہ کوئی افسانہ چمکا۔"

اس ملازمت کے چوتھے پانچویں دن کا واقعہ ہے کہ ایک نمبر جوں ہی بورڈ پر آیا مسلسل تڑپنے لگا۔ آپریٹر ندیم کو اپنے بے قرار دل کے سامنے اس کم بخت نمبر کی بے قراری اور خود اہمیتی بالکل پسند نہ آئی اس لئے ذرا تاخیر سے توجہ دی۔

"نمبر پلیز"

"پہلے اپنا نام بتاؤ" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"نمبر پلیز" ——— آپریٹر ندیم ملازمت کی حدود سے آگے نہ گئے۔

"نام بتاؤ، ورنہ اپنے ہیڈ آپریٹر کو بلاؤ" سختی سے حکم صادر ہوا۔

"مجھی سے بات کیجئے۔ ڈیوٹی پر میں ہوں" اب انہوں نے بھی حکم دیا نتیجے میں دوسری

طرف سے بکواس کرنے کی آواز آئی۔ پیرزادہ ندیم نے مصیبتیں ضرور جھیلی تھیں مگر کسی کی اُونچی بات نہ سُنی تھی اور نہ کسی کو بُری بات کہی تھی۔ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئے اور جواب آں غزل کے طور پر وہی کچھ کہا جو اُن صاحب نے فرمایا تھا۔ ادھر سے ٹیلیفون بند ہو گیا۔

اس قصے کے بعد انہوں نے اپنے حیران و پریشان ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور بڑے بھائی محمد بخش کے پاس لاہور پہنچ گئے اور ہا ہمت اور عزیز بھائی نے اس بار بھی ان کی پیٹھ تھپکی۔

اب پھوپھی زاد بھائی ملک امیر حیدر نے اپنے بھائی ندیم کے مستقبل کی راہ متعین کرنے کا بیڑا اٹھایا اور بڑی آسامیوں پر نامزدگی کا "رول" بھرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ رول صرف ان لوگوں کے لئے بھرائے جاتے تھے جن کے خاندان نے انگریز حکومت کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہوں۔ ندیم بھیا کے والد محترم تو ان معنوں میں اپنی بیوی اور بچوں کی بھی کوئی خدمت نہ کر سکے تھے کجا حکومتِ وقت کی کوئی غیر معمولی خدمت۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ندیم بھیا کے چچاؤں میں سے ایک چچا نے (جو ایک زمانے میں آسام میں تھے۔) لارڈ کرزن کو تبت کے خلاف مہم کے سلسلے میں باربرداری کے لئے یاک فراہم کئے تھے اور یہ کارنامہ خاندانی سندوں میں جلی حروف کے ساتھ درج تھا۔ خدمات کی یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس خاندان نے انگریز حکومت کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ چنانچہ پھوپھی زاد بھائی اپنے نکتے، نک چڑھے بھائی کو اپنے خاندانی استحقاق کی بنا پر جن آسامیوں کے لائق سمجھتے تھے وہ یہ تھیں۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، پنچایت افسر، انسپکٹر آبکاری۔

آخر میں سب انسپکٹر آبکاری کی حیثیت سے ندیم بھائی کے نام کی منظوری ہو گئی۔ اس طرح ندیم کو نوکری اور سعادت حسن منٹو کو اپنے اخبار "مصور" بمبئی کے لئے ایک دلچسپ سرخی مل گئی "شاعر محتسب بن گیا"

اور حضرت جوش ملیح آبادی نے ندیم بھائی کو لکھا:

جناب قبلہ و کعبہ کی آبکاری ہے،

شراب جو نہ پئے آجکل وہ ناری ہے

اور کرشن چندر نے لکھا: "بیکاری سے آبکاری بھلی"۔

یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے دو تین ماہ قبل کا ہے کہ محتسب شاعر منشیات کے ناجائز کاروبار پر چھاپے مارنے لگے۔ اس ملازمت میں سب مل ملا کر ساڑھے بہتر روپے حاصل ہوتے۔ یہ رقم اس زمانے میں اچھی گزر بسر کے لئے کافی تھی۔ مگر یہ رقم بہت جلد ندیم جیسے سینے کا بوجھ بن گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ قانون کی ناک تلے اونچے پیمانے پر ناجائز کاروبار چلتے ہیں لیکن پھنستے صرف وہ لوگ ہیں جو روپیہ آٹھ آنے کما کر اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ کارکردگی دکھانے کو انہیں بھی ایسے چھاپے مارنا پڑے لیکن اس کے بعد اس قدر جذباتی ہوئے کہ انہوں نے کئی بار استعفیٰ دیا مگر یہ استعفیٰ منظور نہ ہوئے۔ اس کی وجہ بھی دلچسپ تھی۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ محکمہ آبکاری اور محکمہ پولیس کا تعاون ہوتا ہے مگر یہاں تو غضب یہ تھا کہ محکمہ آبکاری کے ندیم اور محکمہ پولیس کے ایک نوجوان افسر حمید اللہ خان نیازی محکمانہ کارروائیوں کے دوران ادب فہمی کے رشتے سے ندیم کے گہرے دوست بن چکے تھے۔ چنانچہ حمید اللہ خاں

---

(۱) جوش کا خط [illegible] صاحب کے نام ہے۔

نیازی اپنے دوست کے چہرے سے صورت حال بھانپ لیتے اور ندیم کے استعفے کا کاغذ آگے بڑھنے سے پہلے ہی متعلقہ کلرک سے لیکر پھاڑ دیتے ۔ ندیم کو سمجھاتے کہ بھائی بڑے سے بڑے انسان کو بھی زندگی میں کبھی نہ کبھی غلط چیزوں سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے ۔ اس لئے صبر کرو جب کہیں تمہاری "مرضی" کی نوکری مل جائے تو اطمینان سے استعفیٰ دے دینا ۔

"مرضی" کا کام یعنی لکھنے پڑھنے کا کام دلانے کے لیے مبئی میں بیٹھے ہوئے سعادت حسن منٹو نے بھی کئی کوششیں کیں اور انہوں نے حکیم شیراز سیٹھ کی ایک فلم "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھنے کا معاہدہ کرا دیا ۔ پھر منٹو بمبئی سے اور ندیم ملتان سے چل کر دلی پہنچے۔ وہاں ندیم مکالمے بولتے جاتے اور منٹو اپنے اردو ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرتے جاتے تھے مگر یہ فلم صرف مراٹھی زبان میں تیار ہوئی ۔ بہرحال ندیم کو اپنی محنت کا معاوضہ مل گیا تھا ۔ جب منٹو آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے تب بھی انہوں نے یہ کوشش جاری رکھی ۔ ایک بار منٹو اور کرشن چندر نے مشترکہ طور پر ایک فلمی کہانی (بنجارہ) لکھی تو انہوں نے اس فلم کے گیت لکھنے کی ذمہ داری اپنے دوست ندیم ہی کو سونپی ۔ اس دوران ریڈیو کے لئے ندیم کا ایک آپیرا سو روپے کے معاوضے پر منظور کرایا اور انہیں اس بہانے دلی کا سفر کرا دیا ۔ ان کی شلوار، قمیض کو سوٹ میں بدل دیا لیکن "مرضی" کے کسی مستقل کام کا بندوبست نہ کر سکے ۔ اور ندیم محکمہ آبکاری میں رہ کر دو ڈھائی سال تک ذہنی عذاب سہتے رہے ۔ بڑی مشکل سے وہ لمحہ آیا جب دوستوں اور ہمدردوں کے محبت بھرے مشوروں اور مستقبل کے خوف کی بیڑیاں کٹ گئیں ۔ سب انسپکٹر ندیم اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھے فائلوں سے الجھ رہے تھے کہ سگریٹ کا ایک جلتا ہوا

ٹرا ان پر آن گرا۔

"یہ کس نے پھینکا ہے؟" ندیم نے غصے سے پوچھا۔

"میں نے پھینکا ہے، میں نے آپ کو پکارا مگر آپ نے جواب نہیں دیا، سوچا کہ اس طرح آپ کو متوجہ کروں، شاعر ٹھہرے نا آپ!" انسپکٹر صاحب نے غصے سے جواب دیا۔

ندیم نے ایک لمحے کو سوچا۔ ان کے سامنے روشنائی سے بھری ہوئی دوات رکھی تھی۔ یہ دوات اور روشنائی اب ان کے لئے ایک گھر، ایک نوکر اور اچھے کھانے پینے کی علامت تھی مگر انہوں نے دوسرے ہی لمحے یہ "علامت" اٹھا کر اپنے افسر پر کھینچ ماری ـــــ ندیم نے اپنی زندگی میں نہ تو کبھی گولی چلائی اور نہ کبھی کسی پر پتھر پھینکا تھا اس لئے دوات نشانے پر بیٹھنے کے بجائے دیوار سے جا ٹکرائی مگر روشنائی کے چھینٹوں نے انسپکٹر کے کپڑوں پر تجریدی آرٹ کا وہ نمونہ بنا دیا جو مصوری کی دنیا میں ندیم کا پہلا اور آخری شاہکار تھا۔

افسر اپنے ماتحت کے اس جواب سے ہکا بکا رہ گئے اور جب انہیں ہوش آیا تو اسی حالت میں سیدھے انگریز ڈپٹی کمشنر کے حضور میں شکایت لے کر پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد ماتحت ندیم کی طلبی ہوئی۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ دوات میں نے ماری ہے۔ کیونکہ ان صاحب نے جلتی ہوئی سگریٹ مار کر مجھے اپنی طرف مخاطب کیا تھا۔ "میں نے سمجھا کہ انسپکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان تبادلۂ اشیا کے ذریعے بات چیت ہو۔"

ڈی سی اس وضاحت کو سن کر ہنسی پر ضبط نہ کر سکا۔ بعد میں انسپکٹر صاحب کی اشک شوئی کے لیے نمائشی طور پر سب انسپکٹر کو تنبیہ کی اور اپنے افسر کا ادب کرنے کی تلقین کی۔ ڈی سی

کی اس زبانی تنبیہہ سے ندیم کی ملازمت کے ریکارڈ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا لیکن وہ تو اس ملازمت سے چھٹکارا پانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے، بہانہ ہاتھ آگیا۔ ملتان سے گھر سمیٹا اور فاتحانہ انداز سے بڑے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ بڑے بھائی نے ایک بار پھر اپنے چھوٹے بھائی کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا۔

بھیا ندیم بڑے بھائی کی طرف سے مطمئن ہو کر تیسری ملازمت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ (میرا خیال ہے کہ حمید اللہ خاں نیازی اس وقت ملتان میں نہ ہوں گے) اس طرح استعفیٰ دینا سرکاری قواعد و ضوابط کے خلاف تھا اس لیے موصوف کی ایک ماہ کی تنخواہ کافی عرصے کے لیے سرکاری خزانے میں رُکی رہی۔

اپنی اس تازہ ترین بیکاری کا کارنامہ سالک صاحب (مرحوم) کو جاکر بتایا تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد سالک صاحب نے ندیم بھائی کو بتائے بغیر "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" کے مالکوں سے مل کر ان دونوں پرچوں کی ادارت کا بندوبست کرا دیا اور ندیم اب ستر روپے ماہوار پر کام کرنے لگے۔ ڈھائی روپیہ ماہوار کے خسارے کو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

اِس ملازمت کے سال ڈیڑھ سال بعد ماہانہ "ادبِ لطیف" کی ادارت بھی سنبھال لی۔ اس کا معاوضہ تیس روپے ماہوار تھا۔

لاہور میں اب ندیم بھائی دروازے کی گلیوں کے بجائے سابق میو روڈ حال اقبال روڈ کی ملک بلڈنگ (حال خیابان ہوٹل) کے ایک فلیٹ میں رہتے۔ یہاں تھوڑے دن بعد ہی حمید اللہ خاں نیازی بھی آ گئے تھے۔

ان تینوں پرچوں کی ادارت کے دوران ندیم کی بہتر کارکردگی کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اور ان کو "ترقی" اور "انعام" کی پیشکش بھی ہوئی۔ یعنی ایک جگہ تنخواہ میں ایک روپیہ ماہانہ کے اضافے کی خوشخبری دی گئی اور دوسری جگہ پانچ روپلے انعام مرحمت ہوا۔

ندیم ان عنایات سے تحت بوکھلائے کہ استعفےٰ دینے کا خیال نہیں آیا۔ اُنہوں نے ان عنایات کو شکریے کیساتھ واپس کر دیا مرضی کا کام تھا اسلئے پیسے کی کمی اور زیادتی محسوس ہوئی۔ دو ہفت روزے اور ایک ماہنامہ مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے جی بھر کر نظمیں، غزلیں، قطعات اور افسانے لکھے۔ اسی زمانے میں راجہ مہدی علیخاں مرحوم نے ندیم بھیا کی بسیار نویسی پر لطیفے گھڑے تھے۔

دن رات محنت کرتے اور کم سے کم آرام کرتے۔ اس کا نتیجہ نروس بریک ڈاؤن کی صورت میں نکلا۔ اتنا شدید حملہ ہوا کہ وصیت تک کر ڈالی۔ سوچا کہ یہ آخری وقت ہے (میرے منہ میں خاک) ماں کے قدموں میں گزاروں۔ اس خیال کے تحت انتہائی بری حالت میں گاؤں چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہاں تو ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ اسلئے مرنا ملتوی کر دیا اور اپنے علاقہ میں (جو ملک خضر حیات ٹوانہ کا حلقہ انتخاب تھا) اپنے نوعمر بھانجے ظہیر بابر کے ساتھ مسلم لیگ کی تنظیم میں شریک ہو گئے۔ انتخاب کی گہما گہمی ختم ہوئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ تو ہمیشہ سے کہیں زیادہ صحت مند ہیں۔

اب پھر گاؤں سے نکلے تو لاہور کے بجائے پشاور ریڈیو کا رُخ کیا اور یہاں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس وقت پشاور ریڈیو پر وہ اُردو کے تنہا اسکرپٹ رائٹر

تھے۔ اس لیے ہفتے میں چار پانچ فیچر لکھنا ان کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ ڈرامے تقریریں اور ورائٹی پروگرام بھی لکھتے۔ انہی دنوں پشاور میں بیٹھے بیٹھے "سویرا" کے چند ابتدائی نمبر بھی مرتب کیے۔

ریڈیو سے ان کو ساڑھے تین سو روپے ماہوار ملتے۔ ایک بڑی سی متروکہ کوٹھی بھی ملی جو ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ مگر ان کو اس کوٹھی سے بس اتنا ہی سروکار تھا کہ یہ اپنے کھاٹ کھٹولے کے ساتھ اس کے ایک کمرے میں پڑے رہتے اور کسی متروکہ چیز کو ہاتھ بھی لگاتے ہوئے گھبراتے۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران ایک آدھ بات ایسی بھی ہو گئی جو انہیں ناگوار تو گزری مگر اس سے بے عزتی کا کوئی پہلو نہ تلاش کر سکے اور نہ استعفیٰ دینے کا بہانہ ہاتھ آسکا۔ اس لیے ریڈیو کے واسطے ایسی چیزیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگاتے رہے جن کے متعلق وہ ہر روز سوچتے کہ کیا میرے قلم کا یہ صحیح استعمال ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب میں اپنے خاندان کے ساتھ لاہور پہنچی تو بھیا نے جھٹ سے ایک ادبی رسالے اور ایک پبلشنگ ادارے کی اسکیم بنا ڈالی۔ صورت حال یہ تھی کہ ہم دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہ رسالے کا ڈیکلریشن تھا اور نہ آئندہ ملنے کی اُمید۔ اس لیے "ادارہ فروغ اردو" کے مالک بھائی محمد طفیل سے بات ہوئی۔ ان کو ڈیکلریشن مل گیا اور پھر بڑے ارمانوں سے "نقوش" شائع ہوا۔ ندیم بھیا ریڈیو کی ملازمت سے مستعفی ہو کر خالص ادبی دُنیا میں سانس لینے لاہور آ گئے۔

اب اپنے ذاتی دارالاشاعت "فسانہ خواں" کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے نسبت روڈ کے گھر پر "فسانہ خواں" کا بورڈ آویزاں ہوا۔ جس کے بعد شوکت تھانوی جب کبھی بھیا سے ملنے آتے گلی میں کھڑے ہو کر "جناب فسانہ خواں صاحب" کہہ کر آواز دیتے اور ہم سب کو ہنسا دیتے) پشاور سے بھیا نے ایک بار بڑے جوش سے لکھا تھا کہ ہم ایک سال میں بارہ کتابیں چھاپیں گے اور اس کے بعد کتابوں کا سیلاب سا لے آئیں گے۔ چنانچہ اس خواب کی تعبیر افسانوں کے دو مجموعوں کی شکل میں سامنے آئی۔ اور پھر یہ کتابیں سینے کا بوجھ بن گئیں کیونکہ ندیم بھائی کو کتابیں بازار میں نکالنا نہیں آتا تھا۔ آخر چند ماہ بعد کتابوں کا یہ بوجھ بھائی محمد طفیل کے سر ڈال دیا کہ لیجیے، انہیں بیچ دیجیے۔ اس کے بعد بھی "فسانہ خواں" کا بورڈ برسوں گھر پر لگا رہا۔

دوسرے محاذ پر ابھی "نقوش" کے صرف تین نمبر ہی نکلے تھے کہ "ادب لطیف" اور "سویرا" کے ساتھ "نقوش" کو بھی منٹو کا افسانہ "کھول دو" چھاپنے کے جرم میں سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ مہینے کے لیے بند کر دیا گیا۔ پھر جب "نقوش" اس قید سے رہا ہوا تو چند پرچے مرتب کرنے کے بعد ندیم بھیا نے "نقوش" سے ہاتھ اٹھا لیا۔

مارچ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء کے آخر تک انہوں نے کس طرح گزر بسر کی، اس کی تفصیل اس مضمون میں نہیں سما سکتی۔ یہ تو ایک الگ داستان ہے۔ مختصراً یہ کہ اب ندیم بھائی نہ صرف شادی شدہ تھے بلکہ دو بیٹیوں کے باپ بھی تھے۔ ایسی حالت میں کوئی باقاعدہ روزگار نہ ہونے کی صورت میں عزت مندانہ طریقے پر زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ

کیا جاسکتا ہے۔ اسی دوران چھ مہینے کے لئے سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھی ہو آئے۔ دو ماہ کا عرصہ سی کلاس قیدی کی حیثیت سے گزارا۔ کیونکہ حکام کا کہنا تھا کہ نظر بند کی مالی حیثیت کے مطابق کلاس دی جاتی ہے۔ مگر یہاں تو گرفتاری کے وقت آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ندیم بھیا جیل میں تھے تو ان کے ایک عزیز نے انہیں رہا کرانے کے لئے ان کی امی کی طرف سے درخواست لکھی اور دستخط کرانے لے گئے۔ امی نے درخواست کا مضمون سُن کر صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ندیم نے کب کسی سے معافی مانگی جو میں اس کی طرف سے معافی مانگتی پھروں۔

جیل سے نکل کر ایک بار پھر ندیم بھیا نے پانچ اصحاب کے ساجھے میں کتابیں چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ اس کام کے لئے ندیم بھیا اور ایک اور صاحب کے نام پر قرضہ لیا گیا۔ کچھ کتابیں چھپیں اور پھر سب بکھر گئے۔ قرضہ لینے والے صاحب ملک سے باہر ہی چلے گئے۔ اور اس طرح یہ پروگرام بُری طرح ناکام ہو گیا۔

سنہ ۱۹۵۲ء کے آخر میں ندیم بھیا "امروز" کے فکاہیہ کالم نویس کی حیثیت سے سامنے آئے اور مارچ سنہ ۱۹۵۳ء میں اسی روزنامے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

اس روزنامے کے مدیر مقرر ہونے کا قصہ بھی آج کے ماحول میں سب کو بڑا عجیب سا لگے گا۔ کیونکہ اب تو ادیب برادری میں بھی بعض کے ہاں یہ رواج عام ہو گیا ہے کہ جب کوئی کام حاصل کرنا ہو تو نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنا قصیدہ پڑھنے کا سلیقہ آتا ہو بلکہ اپنے

قصیدے کا مصرعہ اٹھانے والے دوستوں کی کھیپ بھی تیار کرنا آتی ہو (اس کے بغیر تو ریڈیو اور ٹیلیویژن کا پروگرام تک ملنا مشکل ہوتا ہے)

ہاں تو ہوا یہ کہ ندیم بھیا کے ایک ہمدرد نے آکر اطلاع دی کہ "امروز" کی ادارت کے لیے دو ایک ناموں پر غور ہو رہا ہے۔ جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے مگر ادارے کے ایک بااثر صاحب فلاں صاحب کے حق میں ہیں۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ آپ نہ صرف چیئرمین صاحب سے مل لیجئے بلکہ ان بااثر صاحب سے بھی بات کر لیجئے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ندیم الگ تھلگ رہنے والے آدمی ہیں اس لیے بھی اچھے ایڈیٹر ثابت نہیں ہو سکتے۔

ندیم بھیا نے اپنے دوست کا مخلصانہ مشورہ سنا اور دوسرے دن لاہور سے انگہ چلے گئے۔ جاتے جاتے گھر میں کسی نے کہا کہ یہ کیا غضب کر رہے ہیں آپ۔ اس موقعہ پر کا وہاں جانے کا کیا تک ہے، شاید کوئی آپ سے بات کرنا چاہے۔

ندیم بھیا نے کچھ چڑ کر جواب دیا تھا: "میں نے دوسروں کا کام بنانے کے لیے تو لوگوں کے گھروں پر حاضری دی ہے مگر اپنی سفارش آج تک نہیں کی۔ اگر کسی کو میری ضرورت ہوگی تو انگہ سات سمندر پار تو نہیں، وہ مجھے وہاں سے بھی بلا سکتے ہیں۔"

چنانچہ ندیم بھیا کو انگہ سے بلا کر "امروز" کی ادارت سونپی گئی۔

"امروز" کی ادارت کے باوجود ندیم بھیا نے اپنے رنگ ڈھنگ بدلنے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ہی الگ تھلگ رہنے کی بدنامی کے داغ کو دھونے کی کوشش کی۔ وہ ادارے کے ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے بااختیار اصحاب کے گھروں پر جانا کبھی ضروری نہیں

سمجھا۔ اتنے بڑے سٹاف سے کام لینے کے لیے، اِن کے چہرے پر مدیرانہ شان کی کبھی کوئی جھلک نہ دیکھی گئی۔ وہ افسری ماتحتی کے رشتے بھگت چکے تھے اس لیے سٹاف کے ہر شخص سے دوستوں والا برتاؤ کرتے۔

"امروز" کی ادارت میں پالیسی کے معاملے میں آزادی تھی اس لیے تصادم کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی مگر ایک بار انتظامی امور کے سلسلے میں تلخی ہو گئی اور یہ تلخی آٹھ دس افراد کی موجودگی میں ہوئی۔ ندیم بھائی اٹھے اور اپنے کمرے میں جا کر استعفیٰ لکھ دیا۔ مگر متعلقہ صاحب کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ ندیم بھیا کے کمرے میں پہنچے اور انہیں گلے لگا کر صلح کر لی۔

ندیم بھیا "امروز" میں کام کر رہے تھے تو ظاہر ہے کہ تخلیقی کاموں کے لیے وقت نہ بچتا اس لیے شاکی ہی رہتے۔ کئی بار انہوں نے میری اور خدیجہ جیسی کاہل مطلق بہنوں کو مشورہ دیا کہ "کوئی رسالہ نکالنے کا ڈول ڈالو، ساتھ میں کتابیں بھی چھاپو۔" ہم نے کہا کہ "پہلے آپ کچھ کم تجربے کر چکے ہیں؟ اگر ہم یہ کام کر بھی لیں تو کیا فائدہ ہوگا ــــــ؟" ندیم بھیا سمجھاتے "فائدہ ہی فائدہ ہے۔ دو چار سال بعد میں بھی ملازمت چھوڑ کر تمہارے ساتھ کام کرنے لگوں گا۔" یہ بات ہم ہنسی میں ٹال جاتے۔

مارشل لا کے آغاز میں ایک بار پھر سیفٹی ایکٹ کے گونگے بہرے بھوت نے ندیم بھیا کو دبوچ لیا اور ایک بار پھر ندیم بہ حیثیت "ایڈیٹر امروز" ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے، لاہور جیل، راولپنڈی جیل اور وہاں سے شاہی قلعے لاہور کا چکر لگاتے رہے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنی قید کے سو دن پورے کیے۔ مگر یہ عجیب بات ہے، صاحب حیثیت اور برسرِ روزگار

ہونے کے باوجود اس بار بھی ندیم کو ایک مہینے تک سی کلاس میں رکھا گیا۔ سی کلاس کا حال شاید سب کو نہ معلوم ہو۔ ایسے قیدیوں کو ریت ملی روٹیاں اور تیل سے بگھری ہوئی دال کھانے کو ملتی ہے۔ یہ دال اللہ جانے کس نسخے کو سامنے رکھ کر سیاہ رنگ کی تیار کی جاتی ہے۔ اب نظر بند چاہے اس کو شبِ دیجور کہے، یا بختِ سیاہ، یا دال، بہرحال اسے کھانی پڑتی ہے۔ اور پھر نظر بند کو غروبِ آفتاب سے قبل کوٹھڑی کی سلاخوں کے پیچھے غروب ہونا پڑتا ہے اور پھر ساری رات زمین پر سو کر زمین سے عملی محبت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس اثنا میں قیدی باہر نہیں نکل سکتا مگر حشرات الارض کو کوٹھڑی میں آنے جانے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔

اپریل ۱۹۵۹ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ایک بزرگ نے "افکار" کے فیض نمبر میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے انتظامیہ کی اس تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی بات لکھی تھی کہ فیض اور فلاں فلاں صاحب (ان میں ندیم بھی شامل تھے) جن کے ماتھے پر کمیونسٹ ہونے کا کلنک تھا، وہ سب کے سب اس ادارے سے نکال دیئے گئے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس ادارے کے دوسرے اڈیٹروں کے بارے میں تفصیل کا موقع نہیں، اس وقت تو صرف ندیم بھائی کا قصہ سنئے۔

انتظامیہ کی تبدیلی کی خبر ایک اڈیٹر کے گھر رات کے چار بجے پہنچی اور ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے عہدے پر بدستور کام کرتے رہیں گے۔ لیکن ان اڈیٹر صاحب نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ وہ اڈیٹر نہیں رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت استعفیٰ دیدیا۔ جس وقت پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے دوسرے کارکن دفتر میں پہنچے تو "ضروری ملازمتوں کا قانون" اداروں

پر لاگو ہو چکا تھا۔

ندیم بھیا نے زندگی میں پہلی بار استعفیٰ دینے سے پہلے چوبیس گھنٹے سوچا اور ٹھنڈے دل سے سوچا۔

اب وہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے باپ تھے۔ بچے اچھے سکولوں میں پڑھتے تھے۔ بیوی کو اپنا ہاتھ تنگ محسوس نہ ہوتا تھا۔ زندگی کا ایک معیار مقرر ہو چکا تھا۔ مگر ندیم بھیا نے اس طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ادارے کے نئے ایڈمنسٹریٹر کے پاس گئے۔ اور ان کو مطلع کیا کہ وہ اب ایڈیٹر نہیں رہنا چاہتے۔ اگر انہیں ضروری ملازمتوں کے قانون کی زد سے بچا کر چھٹی دے دی جائے تو بہت ممنون ہوں گے۔

نئے ایڈمنسٹریٹر کی کیوں کے جواب میں ندیم بھائی نے جو کچھ کہا وہ مختصراً اتنا تھا کہ "اب تک میں بحیثیت ایڈیٹر جو کچھ لکھتا تھا وہ اخبار کی طے شدہ پالیسی کی روشنی میں لکھتا تھا۔ اور جب یہ پالیسی ایک بار مجھے دے دی گئی تو پھر مجھے کسی مشورے یا مداخلت کا سامنا نہیں ہوا۔ مگر اب صورتِ حال مختلف ہوگی۔ میں ہر روز نئے مشوروں اور نئی ہدایتوں کے تحت نہیں لکھ سکتا۔ دوسرے یہ ایک اعلیٰ صحافتی اصول بھی ہے کہ جب اخبار کی پالیسی بدلے تو پرانے اڈیٹر کو مستعفی ہو جانا چاہیئے اور نئے اڈیٹر کو نئی پالیسی چلانا چاہیئے۔"

تلوار کی دھار جیسے زندگی کے اس موڑ پر بعض با اختیار اور خیر خواہ اصحاب نے ندیم کے ذہن سے اصول پرستی کا سودا نکالنے کی پُرخلوص کوشش کی۔ اس سلسلے میں ایک ملاقات تو میرے گھر پر ہوئی اور پھر لاہور کے مضافات میں پُرفضا اور پُرسکون ماحول میں پچھ

ملنے کی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ مگر وہ اصحاب انہیں قائل نہ کر سکے۔ ہاں ندیم نے ضرور ان اصحاب کو اتنا قائل کر لیا کہ پھر انہوں نے بغیر کسی ناگوار قانونی گرفت کے چند روز بعد ندیم کا اس ادارے سے رخصت ہو جانا منظور کرا دیا۔

اب وہ پھر بے روزگار تھے۔ انہوں نے زندگی کا یہ تجربہ پہلے بھی کئی بار کیا تھا۔ اور ایسے موقعوں پر دوستوں اور عزیزوں کی محبت نے ان کی ہمت کو جلا بخشی تھی۔ مگر اب کے یہ ایک ایسے اڈیٹر کی بیروزگاری تھی جسے اس کی "کرسی" کے بے شمار عقیدت مند قدم قدم پہ وہ کچھ محسوس کرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ندیم جیسا حسّاس کر ہال جاتے۔ اس رویے پر میں نے انہیں صرف ایک بار ہی اداس دیکھا۔ اس دن انہوں نے بعض اہلِ قلم دوستوں کے رویّے میں نمایاں تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہا: "میں تو کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ ادیب برادری میں بھی کچھ لوگ "کرسی" سے اتنی محبت کر سکتے ہیں کہ میں ان کے مہمان کی حیثیت سے جاؤں اور وہ نظر بچا جائیں ـــــ

بیکاری کے اس دور میں دو ایک اخباروں نے ندیم بھیا سے کالم لکھوائے۔ یہ سلسلہ چند مہینے جاری رہا لیکن دونوں جگہ سے معاوضے کا ایک معقول حصہ، اخباروں کی مالی مشکلات کی وجہ سے انہیں کبھی نہ وصول ہو سکا۔ اس کے بعد انہوں نے فلموں کے مکالمے گھسیٹے اور جو بھی تحریری کام ملا وہ کر ڈالا۔

ساجھے کے کاموں کے کئی ناکام تجربوں کے بعد ندیم بھیا نے ایک بار پھر حکیم حبیب اشعر دہلوی کے ساتھ مل کر "فنون" کا اجرا کیا اور ہمارے ایک عزیز کے ساجھے میں "کتاب نما"

قائم کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے اب تک قائم ہیں۔ کئی بار ادبی حلقوں میں یہ خبر اڑی کہ حبیب اشعر دہلوی اور احمد ندیم قاسمی میں تعلقات بگڑ گئے ہیں اور حبیب اشعر دہلوی اپنا پرچہ کسی اور کے حوالے کر رہے ہیں۔ لیکن ان افواہوں کا جواب حبیب اشعر صاحب نے یہ دیا کہ "فنون" کا ڈیکلریشن اپنے دوست ندیم کے نام منتقل کرنے کی اجازت دیدی۔

ندیم بھیّا نے اپنی پیدائش سے لیکر اس عمر تک پیسے کی قوت کا تماشہ دیکھا۔ وہ ہم سب کی طرح اس تماشے کا ایک کردار بھی رہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اس تماشے میں اپنا کردار اپنی ذات کی حد تک بڑی بے دلی سے ادا کیا۔ انہوں نے بیس روپیہ ماہوار سے لیکر کبھی ہزاروں روپیہ ماہوار تک کمایا۔ مگر شاید ہی کبھی ان کا کوئی ذاتی بینک بیلنس رہا ہو۔ اس کی یہ وجہ بھی نہیں کہ وہ جو کماتے ہیں اپنے عیش و آرام پر اڑا دیتے ہیں۔ بیس سال کے عرصے میں میں نے ان کی صرف ایک عیاشی نوٹ کی ہے۔ اور وہ ہے آفٹر شیو لوشن (AFTER SHAVE LOTION) کا شوق۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مجھے اچھا کھانے اور اچھی طرح رہنے کی عادت ہے۔ مگر میں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ ان کا اچھا کھانا ایک روٹی گوشت اور موسم کے پھل کے علاوہ کچھ نہیں۔ بہت ہوا تو حلوے سے شوق فرمالیا۔ اب رہا اچھی طرح رہنے کا دعویٰ تو ان کے پاس موجودہ معاشرے کے سٹیٹس سمبلز (STATUS SYMBOLS) میں سے صرف ایک ٹیلیفون ہے جو "فنون" کی کاروباری ضرورت کی وجہ سے دفتر میں موجود ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ اگر کبھی آیندہ بھیّا کے گھر میں ریڈیوگرام، ٹیلیویژن ریفریجریٹر وغیرہ قسم کی چیزیں نظر آئیں تو میں اسے بھیّا کے رویّے کی تبدیلی نہیں بلکہ بھابی کی سلیقہ مندی

کا کارنامہ سمجھوں گی۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جب بھی ہم میں سے کسی نے بھیا کو شہری زندگی کی ایسی ضروریات کی طرف توجہ دلائی تو وہ ذرا بُرا مان گئے۔

ایک بار بھابی شکایت کر رہی تھیں کہ ندیم صاحب کی آمد و رفت اور بچّوں کے اسکول وغیرہ جانے کا خرچ دو ڈھائی سو روپیہ ماہوار رہتا ہے۔ اس پر میں نے بھیا سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج کل تو موٹریں بھی قسطوں پر مل جاتی ہیں۔ آپ ایک چھوٹی سی کار لے لیجئے۔ یہی دو ڈھائی سو کے لگ بھگ موٹر کی قسط بنے گی۔ موٹر کی وجہ سے آپ کو آنے جانے میں آسانی ہو جائیگی۔ اس وقت بھیا نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے سیزر نے بروٹس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ لیا ہو۔

وہ ٹیکسی ڈرائیوروں کی کج ادائیوں پر فکاہیہ کالموں کی بھرمار کئے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ عرصے سے کسی ادیب کو بڑا بنانے کے لئے بڑی کار کے ساتھ بڑی کوٹھی اور بڑا عہدہ بھی ضروری ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے بڑا عہدہ یا بڑی کوٹھی تو درکنار، اپنے بچّوں کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے نہ سوچا۔ کبھی اپنی کوئی بیمہ پالیسی نہیں لی۔ کبھی بھاؤ تو کہتے ہیں کہ اس نظام میں بے شمار لوگوں کی کل کی روٹی کی کوئی ضمانت نہیں تو پھر مجھ میں اور میرے بچّوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں، جو میں اپنی زندگی کا بیمہ کراتا پھروں۔

ندیم بھیا نے تو اپنے خاندان کی روایت کے برعکس نہ زرعی زمینیں خریدیں اور نہ اپنے گاؤں کے آبائی مکان کو توسیع دی۔ خود ہی ہنس کر کہتے ہیں کہ محض اس وجہ سے میں اپنے گاؤں کے ایک عام آدمی کی نظر میں خاصا غریب آدمی ہوں ——— لیکن اس احساس کے باوجود

انہوں نے اپنی کمائی میں اِس "عزّت" کے حصول کے لیے کوئی مد نہیں رکھی۔ اگر بھائی جان اپنے چھوٹے بھائی کے حِصّے کے مکان کو اس کی بُنیادوں پر کھڑا رکھنے کی ذمّہ داری محسوس نہ کرتے ہوتے تو یہ خدا جانے کب کا ڈھے چکا ہوتا۔ اِس پر بھیا کی اسکیم یہ ہے کہ بڈھا ہو جاؤں گا تو پھر اپنے گاؤں کے گھر میں بیٹھ کر اطمینان سے اپنی سوانح حیات لکھوں گا ——— اور مَیں اس بات پر یقین کرتی ہُوں کیونکہ ندیم بھیا تو بھاٹی دروازہ میں اُونچی مسجد کے سامنے والے تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر بھی افسانے اور نظمیں لکھتے رہے ہیں۔ اور میو روڈ کے فلیٹ میں دوستوں کے ساتھ رہ کر بھی یہی کچھ کرتے رہے۔ وہ پشاور چھاؤنی کی لق و دق متروکہ کوٹھی میں بیٹھ کر یہی سوچتے رہے کہ کبھی تو وہ کسی کونے میں بیٹھ کر ایک طویل، بہُت طویل نظم لکھیں گے۔ اس کے بعد تقریباً سولہ سال تک اپنا ایک عہد نبھانے کی خاطر وہ میرے مائیکے والے نسبت روڈ کے ایک بے حد تنگ متروکہ مکان کی سب سے اوپری منزل کے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں اپنے تین بچوں اور بیوی کے ساتھ گزر کرتے رہے۔ یہاں ان کی رہائشی منزل تک نلوں میں پانی کبھی نہ چڑھا۔ ہاں اس منزل تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں طے کرتے کرتے سانس ضرور چڑھ جاتی تھی ——— اس کے باوجود بھیا نے اِسی گھر میں بیٹھ کر اپنے بہترین افسانے اور نظمیں لکھیں۔ اور اب وہ گڑھی شاہو کی ایک گلی میں کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ جس کے آنگن کی چوڑائی چند گز سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی وہ اسی طرح لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ندیم بھیا تو نوعمری سے ہی جس دُنیا میں زندہ رہنے کے خواہشمند تھے وہ تصنیف و تالیف کی دنیا ہے۔ وہ جب بھی اس ماحول سے ہٹ کر

کسی ملازمت پر مجبور ہوتے تب بھی اپنی اسی دُنیا میں لوٹ جانے کے جتن کرتے رہتے۔ مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اپنی اس دُنیا کی تعمیر کے لیئے وہ کبھی اتنی رقم نہ جمع کر سکے کہ اپنے طور پر کوئی رسالہ یا کتابیں چھاپنے کے لائق ہو سکیں۔

روپیہ جمع نہ کر سکنا ان کی عادت ہے۔ اس کا یقین مجھے اس وقت ہوا۔ جب بھیا نے پشاور ریڈیو چھوڑ کر مستقلاً لاہور آنے کا فیصلہ کیا۔ ہوا یہ کہ ہم بہنوں نے ضد کی کہ لاہور آنے سے پہلے اپنی منگیتر کو ہماری بھابی بنا کر ساتھ لائیے ——— خلاف اُمید ہماری اس ضد پر بھیا حواس باختہ ہو گئے اور صاف اعلان فرما دیا کہ ابھی دو ڈھائی سال بھابی آنے کی امید نہ رکھو ——— میرے پاس دو تین ہزار روپیہ ہو گا تبھی شادی ہو سکتی ہے۔ آخر شادی میں کچھ خرچ ہو گا ——— بھیا نے تو اپنی بات کہہ دی مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم کو یقین نہیں آیا کہ یہ صاحب جو ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار کماتے ہیں، ان کے پاس دو تین ہزار روپیہ بھی جمع نہیں۔ اس لیئے ہم نے بھیا کے جواب پر مایوس ہونے کے بجائے انگریزی میں میٹھی ہوئی امّی اور بھائی جان سے اپنی اس آرزو کا ذکر کر ڈالا۔ اور تھوڑے ہی دن میں بھیا صاحب کو بھائی جان کی طرف سے دولہا بننے کا نوٹس موصول ہو گیا ——— تب بھیا نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے پشاور سے ہمیں لکھا۔

——— بہرحال تم دونوں بہنوں کی یہ تمنا پوری ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ میں شادی کر کے مستقلاً لاہور آؤں۔ تم نے پچھلی بار پندرہ دن پہلے اطلاع دینے کو کہا تھا۔ سو میں تین مہینے پہلے اطلاع

بھیج رہا ہوں ——

اور جہاں تک مجھے اندازہ ہے ہماری تمنا پوری کرنے میں اس وقت سارا بار بھائی جان نے ہی اٹھایا ہوگا۔ یا پھر ماں کی وہ دوراندیشی کام آئی ہوگی جس کے لیئے وہ پیسہ پیسہ اپنے بچّوں کی خاطر بچا رکھتی ہے۔

بچپن میں بھیّا کو جاسوسی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس لیئے کیمبل پور میں چچا صاحب کی کوٹھی سے ملحقہ کواپریٹو بینک پر ان کی نیت خراب رہتی تھی۔ کتنی بار بینک پر ڈاکہ ڈالنے کی اسکیم بنائی، مگر جب ایک بار اسی بینک کے ایک اہلکار کی غلطی سے آٹھ سو روپے سے زیادہ رقم کی تھیلی ان کی راہ میں آ ٹپکی تو وہ اس رقم کو اپنے کمرے کی تنہائی میں گن کر گھبرا گئے اور فوراً ہی ساری رقم چچا صاحب کے حوالے کر دی۔ یہ تھیلی ایک گھنٹے کے اندر اندر بینک کے حیران و پریشان اہلکار کو جوں کی توں مل گئی۔

پیسے کے بارے میں آج بھی ندیم بھیا کا رویّہ بچپن کے اس واقعے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ پیسہ نہ ہو تو اس کے لیئے ذرا فکرمند ہوں گے۔ پیسہ آجائے تو اپنی ذات کے سوا سب کا حق اس پر فائق سمجھیں گے۔

انہوں نے اپنا بچپن اور نوجوانی بیک وقت افلاس اور خوشحالی کی دھوپ چھاؤں میں بسر کی۔ اس کے باوجود وہ کبھی پیسے کے لیئے نہیں جئے —— پیسے کے لیئے اپنے اصولوں کی قربانی نہیں کی —— انہوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کا کبھی کوئی خاکہ نہیں بنایا —— انہوں نے جو کمایا، اس میں دوسروں کا حصّہ زیادہ سمجھا —— وہ انتہائی خاموشی سے اپنے

رتھیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہے ـــــ اور اس سلسلے میں کبھی کسی سے ذکر یا دکھاوا نہیں کیا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک بار میں نے اور خدیجہ نے شور مچایا کہ لائیے ہم آپ کا بجٹ بناتے ہیں۔ دیکھیں گے کہ ہر ماہ ایک معقول رقم آپ کے نام پر بینک میں جمع ہوتی ہے یا نہیں۔ بھیا نے ہچکچاتے ہوئے کچھ حساب لکھوایا اور پھر کسی ضروری جگہ جانے کا بہانہ کر کے بھاگنے لگے ـــــ مگر ہم نے انہیں اٹھنے نہیں دیا کیونکہ ان کی آمدنی میں سے ایک معقول رقم کا حساب ابھی باقی تھا، جو کسی مد میں خرچ نہیں ہو رہی تھی ـــــ ہم نے اس بقایا رقم کے بارے میں معلوم کرنے کی بہت ضد کی تو منہ بنا کر بولے "دیکھو انسان صرف اپنے اور بال بچوں کے لئے ہی تو سب کچھ نہیں کماتا ـــــ تمہیں بھی اسی طرح اپنی آمدنی کی کچھ رقم کو بھول جانا چاہئے ـــــ" اور پھر ہم خاموش ہو گئے۔

بھیا کو نہ صرف اپنے پیسے کا حساب کسی کو دینا ناگوار ہوتا ہے بلکہ انہیں یہ بات بھی بری لگتی ہے کہ کوئی دوسرا کھاتا پیتا آدمی بیٹھ کر اپنا حساب کتاب ان کے سامنے کرے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ہم سب اکٹھا ہوئے تو باتوں باتوں میں بڑھتی ہوئی مہنگائی، اس پر سے ناگہانی اخراجات کا ذکر چھڑ گیا۔ میں خدیجہ سے اپنے گھریلو بجٹ کی دگرگوں حالت کا ذکر کرنے گی۔ بجائے اس کے کہ بھیا میری باتوں میں دلچسپی لیتے، مجھے ڈانٹنے لگے کہ تم کیا آمد و خرچ کے تذکرے لے بیٹھیں، کیا یہ کافی نہیں کہ آمد و خرچ برابر ہو جاتا ہے۔ ان کے اس غیر ہمدردانہ رویے پر میں تقریباً رو پڑی۔ مگر ایک موقع پر یہی بھیا تھے جو مجھے اور احمد کو روپے کی اہمیت سمجھا رہے تھے۔ ہوا یہ کہ جب احمد پاکستان ٹائمز سے مستعفی ہو کر کراچی کا رُخ کرنے لگے تو انہوں نے جیل روڈ والے

گھر سے گہری جذباتی وابستگی کی بنا پر ایک قطعی فیصلہ کر ڈالا۔ فیصلہ یہ تھا یہ گھر کرائے پر نہیں اٹھایا جائیگا بلکہ اس میں بھیا اپنے بال بچوں کے ساتھ آکر مقیم ہو جائیں گے۔ اس زمانہ میں بھیا نسبت روڈ پر ہی مقیم تھے۔ ہماری اس درخواست کے جواب میں وہ خاموش ہو گئے۔ مگر دو چار دن بعد آئے تو زندگی میں پہلی بار مَیں نے ان کی زبان سے جذبہ کی اہمیت کی بجائے روپیہ کی اہمیت پر ان کا ایک نہایت بے ربط اور غیر مدلل لکچر سُنا جس کے آخر میں اُنہوں نے ہمیں دو ایک ایسے کرایہ داروں کے نام بتائے جو ہمارے گھر کو بے حد پیار کے ساتھ اپنا گھر سمجھنے کو تیار تھے۔ اپنے لیئے انہوں نے نسبت روڈ کے اس متروکہ تنگ و تاریک مکان کی تیسری منزل کے دو چھوٹے چھوٹے کمروں کو کافی سمجھا۔

پچھلے دنوں بعض حلقوں سے یہ خبر اُڑی کہ احمد ندیم قاسمی نے ایک نیم سرکاری ملازمت قبول کر لی ہے۔ ساتھ ہی ایک ہفت روزہ کی ادارت کی پیشکش کا بھی ذکر سُنا۔ بھیا کی عادت ہے کہ جس چیز کو قبول کرنے میں انہیں ہچکچاہٹ نہ ہو، اس کے بارے میں اپنے عزیزوں سے مشورہ کریں گے۔ اور جس چیز کو رد کر دیں، اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ مَیں نے خط میں ان سے پُوچھا، مگر وہ میرے سوال کو ٹال گئے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ افواہیں ایسی بے پر کی بھی نہ ہوں گی اور یہ یقین اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا، جب وہ کسی مشاعرے میں کراچی آئے۔ مگر دو تین دن رہنے کے بعد بھی اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ چھیڑا۔ مَیں بھی ضبط کیئے رہی۔ آخر یہ بند اس وقت ٹوٹا، جب مَیں اور احمد کراچی ایرپورٹ پر ان کو خدا حافظ کہنے کو کھڑے تھے۔ میرے سوال کے جواب میں کہنے لگے۔

بٹو ، میں شرمندہ ہوں کہ تم سے اور احمد بھائی سے کوئی مشورہ نہ کر سکا" پھر انہو
اپنی نظریں ایئرپورٹ کی دیواری گھڑی پہ جما دیں اور اپنی فطری انکساری کے ساتھ رک رک
" دراصل مجھ پہ ـــــ صاحب نے بڑی عنایت کی ہے بس عنایت سے فائدہ نہ ا
پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کروں ، انہوں نے بنا شروع کیا ۔ " دیکھو ، فنو
کتاب نما ، بھی تو اس قابل ہوں گے کہ مجھے غیر ادبی اور غیر تخلیقی کاموں کے بوجھ سے نکال
میں کبھی تو اتنا مطمئن ضرور ہو جاؤں گا کہ وہ طویل نظم اور وہ ناول اور خود نوشت سوانح لکھ سک
مجھے برسوں سے ارمان ہے "

وہ رکے اور پھر بولے ، " اچھا تو بٹو ، تم فنون کے لئے کہانی کب لکھو گی اور احمد
آپ " کتاب نما " کے لئے اپنی کتاب کب مکمل کریں گے ؟"

بھیا ، جو عافیت اور آسودگی کو ہمیشہ سے استعفا دیتے آئے ہیں ، تھکن کے باوجو
بھی جواں سال تخلیق کے لمحوں کے منتظر ہیں ۔

پچھلے دنوں خدیجہ نے مجھے لکھا کہ خدا کے لئے لالہ کو سمجھاؤ کہ اتنی محنت نہ کریں ۔ ا
صحت ٹھیک نہیں ۔ میں تو سمجھا کر تھک گئی ۔ تم لاہور سے دور بیٹھی ہو ، شاید اس خیال
بات مان لیں ۔ ان کے گردے میں اڈھ رٹ برابر پتھری نکلی ہے ۔ لیکن میں اس کے جواب
بھی تو نہ لکھ سکی ۔ سمجھ میں نہ آیا کہ بھیا کو کیسے سمجھاؤں اور ان سے یہ کیسے کہوں کہ اپنے خواب
ڈھونڈو ۔ گردے سے پتھری تو نکالی جا سکتی ہے لیکن تعبیر کو خواب سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔

احمد شفیع

میرا بھائی — میرا دوست

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات تو تھے ہی، لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ احمد شاہ ساکن انگہ ضلع شاہ پور (سرگودھا) جو اپنے چچا پیر حیدر شاہ صاحب افسر مال کیمبل پور کے ہاں اپنے دو بھائیوں محمد بخش اور محمد حیات کے ہمراہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک مقیم رہے، اور مسلسل چار برس تک احمد شفیع کے ساتھ ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے رہے، ایک دن اُردو ادب کے فلک پر درخشندہ ستارے کی طرح چمکیں گے اور پاکستان کے مقتدر ترین ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، مزاح نگاروں اور صحافیوں میں ان کا شمار ہوگا۔

اُس وقت کے ایک مختصر سے شہر میں (جو اَب بھی ایک نیم جان سا قصبہ ہے خواہ ایک ضلع کا صدر مقام جب بھی تھا اور اب بھی ہے) ایک خاموش، محنتی اور شریف الطبع بچہ جو بلوغت کے مدارج نہایت ہی دلپذیر اور شریفانہ انداز سے طے کر رہا تھا، صرف اپنے نصابی مضامین میں ایک اچھے طالبعلم کی طرح اپنے دن گذار رہا تھا۔ لیکن یہ گمان کرنا مشکل تھا کہ ۱۹۶۸ء میں اس شخص کو ادھیڑ عمر میں جہاں شہرت و ناموری کے بیشمار عوامی منصب ملیں گے، وہاں اسے اپنے ملک اور قوم کی طرف سے شعر و ادب میں حُسنِ کارکردگی کا اعزاز بھی دیا جائے گا، اور وہ لاہور کے تمام معیاری ادبی

رسائل کی ادارت کے مراحل طے کرنے کے بعد اپنے ایک رسالے "فنون" ر
اور روزنامۂ امروز ۔ کی ادارت ترک کرنے کے بعد اس کا ہر دلعزیز "عنقا"
اور ملک کے بیشتر رسائل و اخبار اس کی دلکش نگارشات شائع کرنے کے متمن
اور جس مشاعرہ میں وہ شریک نہ ہوسکیگا اسے اوّل درجہ کا مشاعرہ قرار نہ دیا جا
اور جس مجلسِ شعروشاعری میں وہ موجود ہوگا وہاں تحت اللفظ پڑھنے کے باوجود
شعرا سے بھی کہیں زیادہ مقبول ہوگا۔ جب وہ سٹیج پر آئیگا تو ایک احترام آمیز سکو
جائیگا اور اگر ایسی محفل میں اس کا ایک سابق ہم جماعت بلکہ ہم نشست احمد شف
ہوگا تو وہ یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوگا کہ احمد شفیع سرکاری ملازمت میں رہ کر ایک
بوروکریٹ ہی بنا جب کہ اس کا ہم نشین احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی بنا اور ردا
قرار پایا۔ جس کے پرستار نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں بھی ہیں بلکہ جس
اور نثری مجموعے روس اور چین میں بھی شائع ہوچکے ہیں اور لیے دیئے رہ
طرزِ زندگی کے باوجود شہرت کے ساتھ اسے اہلِ وطن کی اتنی محبت نصیب ہوگی
ہی اُردو کے کسی شاعر اور ادیب کو اپنی زندگی میں نصیب ہوئی ہو۔

احمد شاہ صفِ اوّل کے ڈیسک پر بیٹھتا تھا۔ وہ طالب علم جو اپنے آ
پچھلی سیٹوں پر تمکن رکھتے ہیں، ان کی ڈگر کچھ اور ہوتی ہے۔ احمد شاہ تو ایک
محنتی طالب علم تھا اس لیئے وہ اساتذہ کے بالکل سامنے بیٹھنے میں کوئی ہچکچا
محسوس نہیں کرتا تھا۔ پھر جب مڈل پاس کرنے کے بعد وہ کالج کا طالب ع

جب بھی پروفیسروں کے سامنے ڈٹ کر بیٹھتا رہا۔

نویں دسویں جماعت میں بھی اس کے معلم پروفیسر تھے کیونکہ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور میں گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے علاوہ نویں اور دسویں جماعت بھی شامل ہوتی تھی اور ہم دونوں نویں اور دسویں میں بھی کالج اسٹوڈنٹ تھے۔ ہمارا طالبعلمانہ STATUS بہت کم عمری میں خاصا بلند ہو گیا تھا۔ لیکن اس زمانے کے کالج کے طلبار بھی سکولوں کے طلبار کی طرح اپنے استادوں کے فرمانبردار ہوتے تھے اور پڑھائی سے وہ بے حد لگن محسوس کرتے تھے۔ اِن دنوں ہمارے کالج میں نہ تو سٹوڈنٹس یونین تھی، نہ کسی قسم کی سیاست طلبار پر اثر انداز ہوتی تھی۔ مَیں تو پھر بھی شام کو کھیل کے میدان میں نکل جاتا اور ٹینس کھیلتا لیکن میرا یہ علم دوست ہم جماعت کافی عرصہ صرف کتابوں سے ہی کھیلتا رہا۔ ہاں سیر کر لیا کرتا تھا جس سے اس کی صحت دُوسرے لڑکوں کے مقابلے میں قابلِ رشک ہوتی تھی۔

پھر اس شاعرِ مضمر کا مذاق بھی بظاہر عاشقانہ نہ تھا۔ انکسار اور خاموشی اس کا شیوا تھا۔ نہ وہ کسی سے جھگڑتا تھا، نہ شور و شغب میں حصّہ لیتا تھا۔ اِسے صرف اپنے کام سے کام تھا۔ سر پر فیض کیپ (ترکی ٹوپی) شلوار قمیض اور چھوٹا کوٹ اس کا ملبوس تھا۔ سادہ زندگی۔ سادہ مزاج۔ سادہ کھانا۔ ایک سیدھا سادہ مسلمان۔ دوستوں کا دوست۔ دُشمن کسی کا نہیں۔ اسے بچّوں کی پارٹی بازی سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ امتحان میں اوّل آنے کا، ہم ایک ہی ڈیسک پر بیٹھنے والے ـــــ دوستوں کے

درمیان ہمیشہ مقابلہ رہا۔ ترازو کے پڑے کبھی میری طرف جھک جاتے۔ کبھی اس کی طرف، مگر اردو میں یہ قومی ہیرو ہمیشہ اوّل آتا رہا۔ بظاہر اس کا مزاج شاعرانہ تھا۔ نہ گفتگو میں شاعری تھی اور نہ کبھی اس نے کوئی شعر کہا اور اگر اس نے ایسا کیا بھی ہو تو کم از کم مجھے تو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ اس کا "ڈیسک میٹ" اس راز سے ناآشنا ہی رہا۔

احمد شاہ اور احمد شفیع سکول اور کالج کے باہر بہت کم ملتے۔ کبھی کبھار ملاقات ضرور ہو جاتی کیونکہ ایک مختصر سے شہر میں ایک دوسرے کے مکان قریب سے گذرنے کا اتفاق ہو ہی جاتا ہے۔ جب کبھی اس کے بزرگ چچا جان مکان پر ہوتے، وہ نہایت خلوص اور خوش خلقی سے مجھے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتے اور احمد شاہ کے دونوں بڑے بھائی مجھ سے ہمیشہ بڑے بھائیوں کا سا سلوک روا رکھتے۔ جب ہم مل بیٹھتے تو اکثر و بیشتر موضوعِ گفتگو امتحانات اور مضامین اور اساتذہ ہی ہوتے تھے۔ یا پھر ان مباحثوں سے متعلق تبادلۂ خیال ہوتا جن میں ہم دونوں نے اس دور میں جی بھر کے شرکت کی۔ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے، مباحثوں میں احمد شاہ ایک گھٹے گھٹے، شرمیلے لڑکے کا کردار ادا کرتے۔ ہاں ان کے مضمون پائے کے ہوتے تھے اور دلپذیر بھی۔ شاید ریڈ کراس کی طرف سے مضامین کے صوبائی مقابلے میں احمد شاہ کو اوّل انعام بھی ملا تھا۔ اس کے باوجود ان کے دوستوں اور ہم جماعتوں کو یہ اندازہ قطعی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ملک کے ایک قابلِ فخر فرزند اور شعر و ادب کی آبرو ثابت ہوں گے۔ میں اب سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے

کہ اپنی کتابوں کے ساتھ احمد شاہ کی لگن اور کُرید اسے دوسرے طالبعلموں سے ہمیشہ الگ رکھتی تھی اور ان کی باوقار خاموشی میں مستقبل کا ایک جری دانشور پرورش پا رہا تھا۔

دسویں جماعت کے آغاز ہی میں احمد شاہ کے چچا جان کا تبادلہ شیخوپورہ ہو گیا۔ یہ شاید ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ ۱۹۳۱ء میں میں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد کیمبل پور ہی میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا اور احمد شاہ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور چلے گئے۔ جہاں سے انہوں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور گریجوایٹ بھی بنے۔ ان چار برسوں میں بھی ہمارا رابطہ قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ بیشتر خطوں کے ذریعے، مگر مجھے وہ چند خوشگوار اور ناقابلِ فراموش لمحات بھی یاد ہیں جب ہماری بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ میرے تایا جان کوئٹہ میں محکمہ جنگلات کے ایک افسر تھے۔ میں ہر برس موسم گرما کی تعطیلات گزارنے وہاں جاتا تھا۔ جاتے اور آتے ہوئے بہاول پور سے گزرنا ہوتا تھا اور احمد شاہ مجھے اسٹیشن پر ملنے آتے۔ وہ ہر بار اتنی دوست پروری کرتے کہ گاڑی میں سوار ہو کر اگلے جنکشن سمہ سٹہ لودھراں تک میرے ہمسفر رہتے اور دوسری گاڑی سے واپس بہاولپور آ جاتے۔ ان چار برسوں کے دوران بھی کوئی ایسا واقعہ مجھے یاد نہیں جس سے مجھے شبہ بھی ہوا ہو کہ احمد شاہ اب احمد ندیم ہونیوالے تھے۔ ہماری گفتگو سراسر پرانی یادوں سے متعلق ہوتی تھی۔ یا پھر ہم حال کے حالات اور مستقبل قریب کے دلآویز امکانات اور زندگی کے ساتھ متوقع کشمکش پر گفتگو کرتے۔

سنہ ۱۹۳۳-۳۵ء کے دوران میں گارڈن کالج راولپنڈی میں بی اے کا طالب علم تھا

جبکہ احمد شاہ بدستور صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان دو برسوں میں بھی ہم اسی طرح برابر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ اور وہ لمحات میری زندگی کے حسین لمحات ہیں۔ میں جب بھی کوئٹہ جاتا یا وہاں سے واپس لوٹتا تو یہ تصور میرے لئے باعث تسکین و مسرت ہوتا کہ احمد شاہ سے ملاقات ہوگی اور وہ کچھ دیر کے لئے میرے ہم سفر ہوں گے۔ ہم نہایت کم قیمت تحائف (مثلاً پھل وغیرہ) ایک دوسرے کو دیتے۔ ان ننھے منے تحفوں کے تبادلے سے ہمیں بے پناہ مسرت ہوتی۔ ہمارے خطوط بھی ان خوشگوار یادوں سے متعلق ہوتے۔

مئی ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کا خوفناک زلزلہ آیا۔ مجھے ۱۹ مئی کو کوئٹہ پہنچنا تھا۔ یہ احمد شاہ کو خط بھی لکھا، لیکن کسی وجہ سے مجھے کوئٹے کا یہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ اس کا احمد نے شکوہ بھی کیا۔ لیکن جب ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے بھونچال میں وہ مکان گر کر ملبے کا ڈھیر ہو گیا جہاں مجھے اپنے تایا صاحب کے ہاں رہنا تھا اور وہ پلنگ چکنا چور ہو گیا جہاں مجھے بھیانک رات کو سونا تھا، تو میرے اس جگری دوست نے بارگاہِ باری تعالیٰ میں اس خلوص کے ساتھ سجدۂ شکرانہ پیش کیا کہ میں اب بھی سوچتا ہوں تو مارے مسرت کے میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ میرے تایا اور ان کے خاندان کے تمام دیگر افراد اس مکان کے ملبے کے نیچے دب گئے۔ مگر بعد میں سب صحیح سلامت نکل آئے۔ اس قیامت سے بچ نکلنے والے خاندان کم ہی تھے۔ کوئٹے کی تاریخ کے اس شدید ترین زلزلے میں ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ زلزلے کے جھٹکے بہت رات گئے آئے۔ اس رات سردی تھی

غیر معمولی تھی اور تمام لوگ بند کمروں میں سو رہے تھے۔ یوں مکانوں کے گرنے کے سبب بہت جانی نقصان ہوا۔

۱۹۳۵ء میں ہم دونوں نے بی اے پاس کر لیا۔ میں لاہور میں لا رکالج میں داخل ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں تلاشِ روزگار کے سلسلہ میں مقابلہ کے امتحانوں میں لگا رہا اور ۱۹۳۸ء کے پی۔سی۔ ایس کے مقابلہ میں کامیابی کے سبب ای اے سی تعینات ہو گیا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد احمد شاہ نے ایکسائز کے محکمہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ جب شاید ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں، میں انبالہ میں تعینات تھا اور احمد شاہ ملتان میں براجمان تھے تو ایک دن ان کا ایک خط ایسا آیا جو اپنے موضوع کے لحاظ سے غیر معمولی تھا۔ میں اس کو تاریخی کہوں گا، مگر افسوس کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلوں اور سامان کے انتقال کے باعث یہ تحریر محفوظ نہ رہ سکی۔ اس میں احمد شاہ آخری بار بول رہا تھا اور احمد ندیم قاسمی کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس خط میں اس واقعے کا ذکر تھا جس نے اس حسّاس اور ذہین نوجوان کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ اور اسے ایک سرکاری محکمے کی خاک پیمائی سے ہٹا کر ایک ایسے راستے پر گامزن کر دیا، جو اسے علم و ادب کے میدان میں ایک ایسے مقام پر لے آیا جو اس کے لئے مقدر تھا۔ اور جو اس کے عزیزوں اور دوستوں کے لئے باعثِ فخر ہے۔

احمد شاہ نے اپنے افسر مال صاحب (اس کے چچا بھی افسر مال تھے!) اور ان کے متعدد ساتھیوں کے لئے سینما دیکھنے کا اہتمام کیا۔ شو کے اختتام پر گھر سے جاتے

ہوئے ان صاحبِ اقتدار نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایکسائز کے ایک ماتحت افسر (ان دنوں یہ محکمہ افسرِ مال کی زیرِ تحویل ہوتا تھا) کا شکریہ ادا کریں اور جس بات نے اس غیر معمولی انسپکٹر آبکاری کے گداز دل میں شگاف ڈالا وہ موٹر کی وہ دھول تھی جو اس عالی مرتبہ ضلعی افسر نے اپنے اس ماتحت کے چہرے پر اڑائی۔ اس بظاہر معمولی واقعے پر احمد شاہ کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ ملازمت سے جی بھر گیا اور مستعفی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں بعد احمد شاہ نوکری کے جنگل سے نکل کر ادب کے میدان میں گامزن ہو گیا۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ہمارے ہاں کے ادیب آج بھی صرف ادب پر گزر بسر نہیں کر سکتے اور آج سے ۲۰ برس پہلے تو یہ بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ احمد شاہ کو شدید مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس مردِ مجاہد نے ہار نہ مانی۔ آخر اس کی کتابیں چھپنے لگیں۔ مجھے اس نے "چوپال" کی ایک کاپی بھیجی جو میں نے باوجود کم فہمی کے بہت پسند کی۔ میں اس کی دوسری تصنیفات کے مطالعے کا بھی شرف حاصل کرتا رہا۔ اس کی ہر تازہ تصنیف پر مجھے یوں مسرت ہوتی جیسے اس میں کچھ میرا بھی حصّہ ہو۔ میں ایک فاصلے سے اس عزیز دوست اور پیارے بھائی کو ارتقا کی منزلیں بھی طے کرتا دیکھتا رہا۔ بمصداق :

بخدا کہ دور ہی دور سے
تجھے دیکھتا ہوں غرور سے

ان دنوں میں نے کئی بار اس سے ملنے کی کوشش کی مگر میرے اس پُرخلوص دوست نے موقع ہی نہ دیا۔ پہلے تو اس کا یہ طرزِ عمل میری سمجھ میں نہ آیا۔ نہ خود کسی نے

اِس کا اظہار کیا۔ مگر بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ ایک سرکاری افسر کو جو اُس کا پیارا دوست تھا، حکومت کی طرف سے کسی نوع کے مُواخذے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کی کُل پاکستان انجمن کا سیکرٹری جنرل تھا۔ اور اس کی عوام دوستی ایک جُرم قرار دے دی گئی تھی۔ چنانچہ اُس کا خلوص یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سے میری ملاقات میرے لیئے دردِ سر بنے۔ اِس ضمن میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کا بیان میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۴۹ء میں مَیں راولپنڈی میں بطورِ اے۔ ڈی۔ ایم تعیّنات تھا۔ مسٹر ہادی حسن سی ایس پی کمشنر تھے۔ وہ شاعر تھے اور شاعر پرور بھی۔ ایک مشاعرہ کرایا گیا جس میں شرکت کے لیئے احمد ندیم قاسمی بھی آئے۔ وہ بھی کمشنر صاحب کے مہمان تھے۔ اِن شاعروں نے بشمول احمد ندیم قاسمی اِن کے ہاں کھانا کھایا۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ میرے یہاں بھی چائے کا پیالہ پی لو تو "احمد بھائی" نے اِنکار کر دیا۔ آخر مانا مگر بہت اصرار کے بعد مانا۔ مَیں نے اس کی منطق کا یہ جواب دیا کہ جب وہ اور دوسرے ترقی پسند شعرا کمشنر صاحب کے ہاں کھا سکتے ہیں تو ایک اے ڈی ایم کے ہاں بھی چائے نوش کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا استدلال یہ تھا کہ چھوٹوں کا اِحتساب کیا جاتا ہے، بڑوں کو کون پوچھتا ہے۔ بہر حال یہ ہے احمد ندیم قاسمی بحیثیتِ ایک دوست — کہ اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ایک افسر کو ایک غلط قسم کے شاعر و ادیب" سے بچانے میں لگا رہا کہ کہیں اس کا قرب اس کے افسر دوست کے لیئے باعثِ آزار نہ بن جائے! وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ نوبت بایں جا رسید کہ جب مَیں ۱۹۶۰ء میں

مظفرگڑھ میں ڈپٹی کمشنر تھا تو ملتان میں وہاں کے کمشنر صاحب کی صدارت میں احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ایک شام "منائی گئی۔ میں نے اس مجلس میں شرکت اپنا فرض سمجھا اور بلا دعوت پہنچ گیا۔ وہ ایک نہایت پُرشکوہ اور دلپذیر شام تھی۔ اور ایک دیرینہ ہم جماعت اور ایک قریبی دوست کی حیثیت سے وہ تمام لمحات میرے لئے نہایت قیمتی تھے۔ میں نے فخر بھی محسوس کیا اور مجھے (REFLECTED GLORY) کا احساس بھی ہوا۔ اور جب احمد شاہ (احمد ندیم قاسمی) کی نظر مجھ پر پڑی تو اس مجلس کے مہمان خصوصی نے ایک خصوصی مسکراہٹ سے اپنے دیرینہ ساتھی کو بھری بزم میں پہچانا، اور یہ محفل ختم ہوئی تو ہم دونوں نے احمد شاہ اور احمد شفیع کی حیثیت میں دیر تک باتیں کیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وقت گذر جاتا ہے مگر محبتیں اپنی جگہ اٹل رہتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان پیار کا یہ رشتہ کتنا مقدس ہے!

اس کے ساتھ ایسی ہی ایک ملاقات اباسین آرٹ کونسل پشاور میں (۱۹۶۸ء میں) بھی ہوگئی۔ وہاں بھی یہ ایک قطعی غیر متوقع ملاقات تھی۔ اب میں ستمبر ۱۹۶۸ء سے لاہور میں تعینات ہوں۔ احمد ندیم سے ملاقات اصالتاً تو کم ہی ہوئی ہے۔ ہاں ٹیلیفون کے سہارے نیم ملاقات گاہے گاہے ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران میں نے اسے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر سہرہ بندی میں شرکت کے لئے کہا۔ شرکت تو وہ نہ کر سکا لیکن "سہرہ" بھجوا دیا جس خط کے ساتھ سہرہ بھیجا گیا اس کا متن یہ ہے:

"فنون" ——— ۲۶ مارچ ۱۹۶۸ء
۴۷، انارکلی لاہور

پیارے بھائی۔ سلام مسنون ——— شرمندہ ہوں کہ سہرہ بروقت پیش نہ کر سکا

دراصل میں نے سہرہ کبھی لکھا نہیں۔ نہ آپ کا لکھا، نہ اپنا، نہ کسی اور کا۔ اس لیئے ایک شاعر دوست کو تکلیف دی۔ وہ بیمار ہو گئے۔ آخر پرسوں صحت یاب ہو کر انہوں نے یہ سہرہ لکھا جو مجھے بہت پسند آیا۔ فوراً کتابت کرائی۔ فوراً بلاک بنوایا۔ فوراً چھپوایا۔ اب آج شام کو مجھے چھپا ہُوا ملا ہے اور صرف یہ سہرہ بروقت پہنچانے کے لیئے اپنے دفتر کے مینجر کو آپ کی خدمت میں راتوں رات بھیج رہا ہوں۔ انشاءاللہ کل، مارچ کو دوپہر تک آپ کو مل جائے گا۔ اور یقین ہے کہ آپ پسند کریں گے۔

ایک بار پھر تاخیر کے لیئے شرمندہ ہوں۔ مگر شکر ہے کہ ۸ مارچ سے پہلے اس خوشگوار فریضے سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

کاش مَیں بھی اس مبارک تقریب میں شامل ہو سکتا مگر پرسوں ۸ کو مجھے جھنگ جانا پڑ رہا ہے۔ آپ سب کو مبارک ہو۔

آپ کا بھائی

احمد ندیم

اس زندگی کے باون برسوں میں سکول میں بھی پڑھا۔ کالج میں بھی رہے۔ ملازمت کے اب کم و بیش تیس برس ہونے کو ہیں۔ بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑا۔ چند لوگ دوست یا دوست نما بھی کہلائے لیکن میرا ایمان ہے کہ کسی کو ندیم جیسا دوست اور بھائی ملنا مشکل ہے۔

احمد ندیم قاسمی اب بھی میرے لیئے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۵ء تک کا احمد شاہ ہے۔

بحیثیت دوست میرے دل میں جو اس کا مقام ہے وہ لازوال بھی ہے اور بے مثال بھی۔ میری دعا ہے کہ یہ عظیم شاعر، یہ باکمال ادیب اور یہ پُرخلوص دوست افقِ علم و ادب پر ایک تابدار ستارے کی طرح آیندہ برسوں برس چمکتا رہے۔ آمین

(۲۳۔ مئی ۱۹۶۹ء)

سیّد ضمیر جعفری

ادب کا منگلہ ڈیم

احمد ندیم قاسمی اِس دَور کی ایک عظیم ادبی شخصیت ہیں۔ فردا حال سے کٹا ہوا نہیں، بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ندیم کی روشنی حال سے گزر کر فردا کے دامن میں بھی جھلملا رہی ہے۔ ہر دَور میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تاریخ، خود ان کی زندگی ہی میں ان کی پایۂ عظمت کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ ندیم انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ندیم کی آواز ہمارے دور کی نمائندہ آواز ہے۔ جو دھڑکن اور روشنی بن کر زندگی کے دل میں اُتر گئی ہے۔ میں نے جب تک لکھنے کیلئے قلم نہیں اُٹھایا تھا، ندیم کے بارے میں کچھ لکھنا بڑا سہل معلوم ہو رہا تھا، اب یہ مرحلہ اتنا ہی دشوار نظر آرہا ہے۔ ذہن میں جھانکتا ہوں تو دُور دُور تک رنگوں اور پھولوں اور ستاروں اور نغموں کا گویا میلہ چراغاں بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ندیم کی شخصیت پر جتنا غور کرتا ہوں اُتنا اس کا پیکر رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیلا چلا جاتا ہے۔ اے کاش اس کی لطافت اور زیبائی اور شیرینی کو کماحقہٗ بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ موجود ہوتے اور اگر وہ الفاظ موجود ہیں تو میری دسترس میں بھی ہوتے!

زندگی میں مختلف اور مصروف راستوں پر چلنے کے سبب سے، آرزو کے باوجود، مجھے

ندیم سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کا موقع تو نہ مل سکا لیکن میں ان سے محبت ضرور رکھتا ہوں۔ ان سے میری محبت چونکہ وصال سے زیادہ فراق کی راہوں سے گذرتی رہی ہے لہٰذا اس کی شدت کا اندازہ میں ہی کرسکتا ہوں۔ جب میں پہلی دفعہ ان سے بغلگیر ہوا تھا تو طبیعتیں کب دو برس سے پہلے ہی بغلگیر ہوچکی تھیں۔ یہ ذات سے ذات اور محسوسات سے محسوسات کی ملاقات تھی۔ توقع یہی تھی کہ ہم دونوں اس پس منظر سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر برآمد ہوں گے اور زندگی کے راستے پر قدم سے قدم ملا کر چلیں گے۔ مگر دو قدم چلے ہوں گے کہ راستے الگ ہو گئے۔ میں اپنی روٹی کے انتظام میں اور ندیم دوسروں کے نان و نفقہ کے بندوبست میں مصروف ہو گئے۔

دہلی اور آگرہ، لکھنؤ اور حیدرآباد کا تو مجھے پتہ نہیں البتہ پنجاب کے جتنے ممتاز و مشہور شاعر اس وقت پچاس برس کے پیٹے میں ہیں ان میں سے اکثر اصحاب تیس پینتیس برس پیشتر دو دو ایک ایک برس آگے پیچھے کے فرق سے پنجاب کے مختلف کالجوں میں تعلیم کے مرحلے سے گزر رہے تھے اور غالباً ابھی اپنی اپنی محدود دنیا میں "ملک الشعراء" کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے کالج میں جو پنجاب کے شمال مغربی گوشے میں واقع تھا بخشی انور علی انور اور شیر محمد خاں شاد کا طوطی بول رہا تھا۔ شاد کالج سے نکلتے ہی ادب کا محاذ چھوڑ کر جنگ کے محاذ پر جا پہنچے اور اب کرنل ایس ایم کے شاد ہیں۔ ندیم سے میری ذہنی ملاقات کا باعث وہی ہوئے۔ ہماری ادبی سبھا" عموماً کالج کی ٹک شاپ میں جمتی تھی جہاں گرما گرم سموسوں کے چٹخاروں کے ساتھ شعر و ادب کے مسائل پر بھی گرما گرم بحثیں برپا رہتی تھیں۔ شاد صاحب ایک روز کہیں سے کوئی رسالہ اٹھا لائے جو شاید صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کا میگزین تھا۔ آپ نے اس میں سے ایک نظم اپنے مخصوص

جارحانہ ترنم میں پڑھ کر سنائی اور پھر دو ٹوک فیصلہ صادر کرتے ہوئے بولے ع

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی!

یہ کسی پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی نظم تھی جس میں دیہاتی زندگی کے کسی منظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ ایک ایک شعر کے چہرے پر جیسے خود میرے اپنے گاؤں کی سنہری دھوپ دمک رہی تھی۔ پھر یہی نہیں کہ شاعر محض شجر و حجر گنواتا چلا گیا ہو یا کسی کاشتکار کے ہاتھ میں حقہ تھما کر خود کہیں غائب ہو گیا ہو بلکہ الھڑپنے کی معصومیت اور جوانی کی نہایت دلنواز رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی دھڑکن بھی سنائی دے رہی تھی۔ منظر کا جسم جس قدر خوبصورت تھا اس کی روح اتنی ہی دردمند تھی۔ شاعری کا یہ اسلوب بالکل نیا تھا۔ بہت پیارا اور میٹھا بھی، خالص اپنا بھی اور بڑا من موہن بھی۔ وہاں سے ہم لوگ وفد کی صورت میں سیدھے مولوی انعام علی بیگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب قبلہ عربی کے پروفیسر تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ادبیات پر اُن کی تنقید کا انداز بھی ان کا اپنا ہی تھا۔ شعر سن کر لمبی چوڑی صاحتوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے آپ کوئی عارفانہ سا ایک آدھ جملہ کہدیا کرتے تھے۔ اس کے بعد تعبیر و تفسیر آپ خود کرتے رہیئے۔ ہم نے سوچا لاؤ پیرزادہ صاحب کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے بھی معلوم کرلیں کیمبل پور میں مذاقِ سخن کی آخری مُہر انہیں کے پاس تھی۔ چنانچہ شاد صاحب نے حسبِ معمول نظم ترنم میں سنا کر مولانا سے نقد و نظر کی درخواست کی۔ ترنم سننے کے بعد مولوی صاحب نے شاد سے وہ نظم دوبارہ تحت اللفظ میں سماعت فرمائی کیونکہ ان کے بقول شعر کی قدر و قیمت کا فیصلہ ترنم سے نہیں، تحمّل، تعمّق، تفکّر وغیرہ سے ہوتا تھا۔ شاد پڑھ چکا تو مولوی

صاحب نے رسالہ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مرتبہ نظم کو دل میں چبا چبا کر خود پڑھا۔ پھر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے اندر دیکھتے رہے۔ پھر ادھر اُدھر سر ہلانے کے بعد ارشاد فرمایا۔" یہ گھوڑا اگر دوڑتا رہا تو ریس جیت جائیگا"۔

اس کے بعد جب پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی جو چیز جہاں نظر آتی ہم لوگ ٹک شاپ میں بیٹھ کر باجماعت پڑھتے اور اسکے اندرونی و بیرونی محاسن پر تبصرہ کرنے کے بعد مولوی صاحب کو اطلاع دیتے کہ جناب وہ گھوڑا بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ ندیم کی چیزیں زیادہ تر دُور افتادہ ضلعی پرچوں میں نظر آیا کرتی تھیں۔

"ادبی سبھا" کے ایک اور رکن منوہر لال دھوپر اُردو نثر کے رسیا تھے۔ دھوپر ہندو تھا مگر چونکہ میانوالی میں پلا بڑھا تھا اس لئے پنڈت تلوک چند کی اولاد معلوم ہوتا تھا یعنی اُردو فارسی میں ڈھلا ہوا ہندو۔ ایک روز دھوپر کوئی پرچہ اُٹھا لایا۔ اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا :

" ایں گل دیگر شگفت ! ذرا یہ کہانی تو دیکھو ! "

یہ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ تھا۔ بصیرت کی خیر اس وقت نہ ہمیں تلاش تھی نہ کچھ اس تک نظر ہی پہنچتی تھی۔ ہم لوگ خالص مٹھاس لذت اور کشش کے جویا تھے سو یہ سب نعمتیں ان کے افسانے میں بھی کمال توازن' بانکپن' تاثر اور فن کاری کے ساتھ موجود تھیں۔ شعر کی طرح ان کی نثر بھی سیدھی جا کر دل میں ترازو ہو جاتی تھی۔ اس افسانے میں کپاس کے ہنستے ہوئے پھولوں میں روتی ہوئی زندگی کا کوئی مرقع پیش کیا گیا تھا۔ افسانے کے اکثر کردار ہمیں اپنے ہی رشتے دار معلوم ہوتے تھے۔ یہ شاید ۱۹۳۷/۳۸ء کی بات ہے۔

ندیم سے میری رُو در رُو ملاقات کچھ عرصہ بعد لاہور میں ہوئی۔ ندیم شہرت کے زینے تیزی سے طے کر رہے تھے۔ میں اسلامیہ کالج کے ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ریواز میں جہاں مختار صدیقی، اختر ہوشیارپوری اور تابش صدیقی ایسے شاعر رہتے تھے، جو آگے جا کر مشاہیرِ ادب کی صفِ اوّل میں شمار ہوئے۔ وہاں سرگودھے اور میانوالی کی طرف سے خالص توانا و تندرست طلباء کا مرکز بھی یہیں قائم تھا۔ شاعر و ادیب ہونے کے باوجود میری اپنی وضع قطع انہی اصحاب سے ملتی جلتی تھی۔ لہٰذا میرا اُٹھنا بیٹھنا بھی اِن کے ساتھ زیادہ تھا۔ ہم سب لوگ طُرّے والی پگڑیاں باندھتے تھے۔ لمبی اچکن اور بھاری تہہ دار شلواریں پہنتے تھے۔ مونچھیں اگر نکل آئی تھیں تو انہیں واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ زیادہ وقت گھی پی کر ورزش کرنے، انارکلی میں گھومنے یا مارکٹائی میں گذرتا تھا۔ ندیم سے میری ملاقات اِسی حلقے کی وساطت سے ہوئی۔ وہ ریواز ہوسٹل کے پانچ چھ نیازیوں سے ملنے آئے تو اس زُمرے میں مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز دوپہر کا کھانا ان سب نے میرے ہی کمرے میں کھایا تھا۔ پھر جب سہ پہر کو نیازیوں کا جتھا انارکلی پر یلغار کو نکل گیا۔ تو میں اور ندیم دیر تک شعر و ادب کی باتیں بھی کرتے رہے۔ ندیم ابھی پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ہی تھے۔ وضع قطع بالکل وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی یعنی ٹھیٹھ دیہاتی نوجوان۔ لباس سادہ اور ڈھیلا مگر صاف ستھرا۔ خلوص، سچائی اور انکسار کا پیکر۔ لہجہ دھیما مگر میٹھا۔ بات ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر کرتے تھے۔ چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کی کھلی ہوئی چاندنی (یہ سدابہار مسکراہٹ اب بھی ان کی شخصیت کا جزوِ خاص ہے) آنکھوں میں وہ غیر معمولی چمک جو محبت، مروت، ہمدردی، خوش خیالی اور اُفق پار کسی چیز کی مسلسل تلاش کے

جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور رخسار پہ وہ زخم بھی جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے۔ ان کے خط و خال کی کشش کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ بیان کرنا تو مشکل ہے مگر مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر ایک وادانہ جاذبیت اور شریفانہ وقار کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بعد میں جیسے جیسے نکا فن نکھرتا گیا ہے لباس میں نفاست اور سلیقے کا رکھ رکھاؤ بھی سنورتا چلا گیا ہے۔ ندیم دراصل شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی کام آنے والے، ایک صحت مند خوش ذوق صاف ستھرے انسان ہیں۔

ندیم ان دنوں تعلیم سے تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے۔ اور تھوڑی ہی مدت میں دو ایک سرکاری ملازمتوں کو ٹھوکر لگا کر اب لاہور میں اپنی پسند کا کوئی کام تلاش کر رہے تھے۔ ادبی حلقوں میں اگرچہ ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ مگر لاہور میں وہ ابھی نئے نئے ہی وارد ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس عظیم شہر میں (ان کے خالہ زاد بھائی) مولانا غلام مرشد صاحب یا زیادہ ہوسٹل کے ان چند نیازیوں کے سوا وہ کسی شخص سے ذاتی طور پر متعارف نہیں ہیں گویا جہاں تک لاہور کی زندگی کا تعلق تھا، میں ندیم سے سینئر تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنے ظرف کی روشنی میں ان کو ملازمت ترک کرنے پر ایک طرح کی سرزنش کی کہ میاں ادب میں روٹی نہیں ملتی۔ پھر ادب کے میدان میں ان کو مشورہ دیا کہ بھائی صاحب یہاں کے ایڈیٹروں سے بھی کچھ راہ و رسم پیدا کیجئے گا۔ یہ لوگ شعر نہیں واقفیت چھاپتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ندیم نے مسکرا کر جواب دیا تھا :

"میرے شعر میں جان ہوگی تو چھپ جائیگا ورنہ اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے"۔ مجھے

اِس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ نوجوان ایک روز لاہور شہر کے دل پر حکومت کرے گا اور اُردو زبان و ادب کا ایک پُورا دَور اس کے نام سے روشنی پائیگا۔

لاہور کی روزمرہ ادبی زندگی میں، اُن دِنوں ابُوالاثر حفیظ جالندھری اور شاعرِ رُومان حضرت اختر شیرانی اپنی مقبولیت کی معراج پر تھے۔ حفیظ صاحب تو چونکہ کوٹھی میں رہتے اور موٹر میں گھومتے تھے، لہٰذا وہ ہماری رسائی سے باہر تھے۔ شاعرِ رومان ایک تو نوجوانوں کے دل و دماغ پر خصُوصیت کے ساتھ چھائے ہوئے تھے۔ پھر وہ آس پاس ہی چلتے پھرتے مل جاتے تھے اور خُدا بخشے پہلی ہی مُلاقات میں غیریت کے پردے چاک کر کے الگ پھینک دیتے تھے۔ لہٰذا ان سے مُلاقات سہل بھی تھی اور خوشگوار بھی۔ مجھ سے پہلے تابش صدیقی ان کے راسخ مریدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو تابش کے وسیلے سے میں بھی ان کے نیاز مندوں میں شامل ہو گیا۔ اختر ان دنوں اپنے نامور والدِ بزرگوار قبلہ پروفیسر محمُود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ مکان کی پہلی منزل پر ایک مختصر نیم تاریک بغلی کوٹھڑی اختر کی نشست گاہ اور خواب گاہ کا کام دیتی تھی۔ "رومان" کا دفتر بھی اسی کوٹھڑی میں تھا۔ مُلاقاتی بھی یہیں جمع ہوتے تھے۔ ندیم اب لاہور ہی میں رہتے تھے اور آستانِ اختر شیرانی پر ان سے اکثر مُلاقات ہو جاتی تھی۔ ان کی محفل میں چونکہ بندہ و صاحب و محتاج و غنی بالکل ایک ہو جاتے تھے اس لئے اختر کے بعض چھوٹے چھوٹے نیازمند بھی ان کے سامنے گفتگو میں خاصی بے تکلفی کا اسلوب اختیار کر لیتے تھے۔ ندیم غالباً واحد نوجوان تھے جو اختر کے حضور میں سراپا ادب و عقیدت کا مرقع بنے خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ اختر خاص طور پر ان کو مخاطب کرتے تو کوئی جچا تُلا جملہ جواب میں کہہ دیتے۔ بات چٹکیلی بھی ہوتی

تو اطلس و کمخواب ہی میں لپیٹ کر پیش کرتے ور نہ گھنٹوں بیٹھے رہتے اور ۔۔۔ "جی جناب بہت اچھا ۔۔۔۔ بجا ارشاد فرمایا" کی سرحد سے تجاوز نہ کرتے ۔ اختر کے نیازمندوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ سب سے زیادہ مودب ندیم ہی تھے ۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اختر کے ہاں بس اختر کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کی نیت ہی سے آتے تھے ۔ ندیم کی اس ادا میں عبادت کی سی پاکیزگی اور لگن کا انداز پایا جاتا تھا ۔ خود اختر شیرانی بھی ندیم کو بیحد عزیز رکھتے تھے ۔ اختر ان سے محبت ہی نہیں ان کی عزت بھی کرتے تھے ۔ میں نے خود دیکھا جب کبھی ندیم لاہور سے باہر ہوتے اور انہوں نے انگہ یا کسی دوسرے مقام سے اختر شیرانی کی خدمت میں کوئی خط بھیجا تو اختر دوستوں کو ان کا خط دلی لگاؤ کے ساتھ سنایا کرتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ نوجوان پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کے اخلاص و اخلاق کا یہ پرتو اس کی شخصیت کے ایک بہت ہی اہم رُخ کی ترجمانی کرتا ہے ۔ میری رائے میں ندیم کی عظیم اور وسیع انسانی ہمدردی، اس کے دل و نگاہ کی روشنی اور بصیرت، اس کی دردمندی اور دلنوازی نے، جو اس کے عظیم فن کا امتیازِ خاص ہیں، ندیم کی اپنی اعلیٰ سیرت ہی سے جنم لیا ہے ۔ یہ روشنی اُسکی خودکشید ہے ۔

اِس اثنا میں، لاہور سے میرا آب و دانہ جب اُٹھا ہے تو دُوسری جنگِ عظیم میں سے گذرتا ہوا کوئی آٹھ دس برس کے بعد راولپنڈی میں آکر بیٹھا ۔ ندیم سے اب کبھی کبھی "امروز" کے دفتر میں مُلاقات ہوتی تھی ۔ میں مولانا چراغ حسن حسرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بعض اوقات ندیم بھی وہاں موجود ہوتے یا آجاتے ۔ مولانا حسرت "امروز" سے رخصت ہوئے تو معمولی سے

وقفے کے بعد اس کی کرسیِ ادارت ندیم کو تفویض ہوئی۔ ندیم کی شہرت و عظمت کا آفتاب اُفق پر کافی بلند ہو چکا تھا۔ وہ ایک نغز گو شاعر، منفرد افسانہ نگار، بالغ نظر نقاد اور صاحبِ طرز ادیب و انشا پرداز مانے جاتے تھے۔ اِن کی ریڈیائی نگارشات کی ملک میں دُھوم تھی۔ گویا عسکری زبان میں وہ بیک وقت چھ سات مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ بس مورچہ کھود کر بیٹھ گئے ہوں۔ وہ آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے اور ایک کے بعد ایک خوابوں کا جزیرہ فتح کرتے چلے جا رہے تھے۔ ادب کا عام قاری تو حیران تھا کہ دیکھو یہ شخص جس راستے کا رُخ کرتا ہے، پھول اُگاتا، چراغ جلاتا چلا جاتا ہے۔ جتنا سفر طے کرتا ہے اِتنا ہی تازہ دم دِکھائی دیتا ہے۔ سوادِ اعظم کے دل میں ندیم کی تخلیقات اور اس رشتے سے خود ندیم کے لیے دِلی پیار اور تکریم کے جذبات ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بنتے جا رہے تھے۔ مگر خواص کے بعض حلقوں میں کچھ اندیشے ابھی لرز رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی عظمت مقدار میں نہیں، معیار میں ہوتی ہے۔ ندیم نے ابھی تک جس رنگ میں بھی جتنا لکھا تھا، جو لکھا تھا، گو وہ ہر لحاظ سے اعلیٰ ادب ہی تھا۔ پھر اس کی اپنے فکر و نظر کی خوبیاں اور خوبصورتیاں اُس کے ادب کو باقی اعلیٰ ادب سے جُدا اور ممتاز بھی کرتی تھیں۔ تاہم دو برس میں ایک آدھ غزل لکھنے والے لوگوں کو خدشہ تھا کہ مقدار کا اِتنا بوجھ سر پہ اُٹھا کر چلنے سے معیار کی کمر دوہری ہو جائیگی۔ اولاد اِتنی زیادہ ہو تو وہ تندرست اور خوشحال نہیں رہ سکتی، ایک ہی قسم کی مٹی سے بیک وقت کئی مختلف قسم کے پودے، پھل، پھول، درخت اور ترکاریاں اُگا کر ان کی یکساں پرورش کا خیال ایک امرِ محال ہے۔ یہ لوگ، جن میں سے اکثر وہ تھے جو نہ تو خود تخلیقِ ادب کی توفیق رکھتے تھے، اور نہ دُوسرے نسبتاً زیادہ آرام دہ اور منفعت بخش دھندوں

نے ان کے دل میں اس تخلیقی جل کے واسطے کوئی خاص آرزو۔ لگن یا تڑپ ہی باقی رہنے دی تھی۔ البتہ تنقید کے طور پر انگریزی اور فرانسیسی کے چلتے ہوئے جملے خوب چست کر لیتے تھے —— تو ان لوگوں کے اندازے کے مطابق یا تو ندیم کی نثر آگے نکل جائے گی اور شاعری پیچھے رہ جائے گی یا تنقید کسی موڑ پر سرے سے لاپتہ ہو جائے گی۔ یا افسانہ کہیں پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیگا، یا کم از کم شاعری میں تو وہ خانہ جنگی برپا ہوگی کہ نظم غزل کے ہاتھوں ماری جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ چہ ستا مختلف اصناف ادب اگر ایک ہی صف میں دوش بدوش "مارچ" کرنے لگیں تو صف سیدھی نہیں رہتی۔ پھر کامن ویلتھ کی طرح کے عظیم اور متنوع لشکر کو پڑاؤ کئے بغیر لیکر چلنا کوئی آسان کام نہیں۔ مطلب یہ کہ اس سے لکھنے والے کی شخصیت بکھر جاتی ہے۔ جب ندیم نے مزید برآں کوچہ صحافت میں قدم رکھ کر صحافت کے "ملک الموت" یعنی فکاہی کالم سے بھی پنجہ کشی شروع کر دی تو معاملہ گویا بہت ہی سنگین ہو گیا۔ یہ ہر روز نیا کنواں کھود کر پانی پینے پلانے کا معاملہ تھا۔ اچھے اچھے اس میدان میں اترے مگر دوسروں کو ہنساتے ہنساتے بیچاروں کی اپنی گھگھی بندھ گئی۔

یہ سب اندیشے اپنی جگہ پر کچھ غلط نہ تھے۔ ندیم کے ظرف و ذہانت سے کمتر آدمی واقعی ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا۔ میں تو اسے ندیم کے حوصلے، فن سے اس کے عشق اور اس کی غیر معمولی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ کہوں گا کہ اس نے جس صنف کو بھی اپنی جولانئ طبع کے لئے منتخب کیا، نہ صرف یہ کہ اس کی روایت کو چار چاند لگا دیئے بلکہ اس میں عظمتِ فن و فکر کے نئے چراغ بھی روشن کر دیئے۔ حد یہ ہے کہ وہ صحافت بھی ادب ہی کی سطح پر کرتا ہے۔ جمال اور جلال اس کے ہاں دو توام جذبے ہیں۔ مگر جمالیات میں اس کا احساس و ادراک اتنا لطیف، اتنا متوازن، اتنا دلفریب ہے

کہ لفظ اُس کے قلم سے پھول بن کر برستے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ندیمؔ اس دور کی ایک عظیم ادبی شخصیت ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس برس سے اِس بات کا اعتراف دِلوں سے گزر کر زبانوں پر بھی آنے لگ گیا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی ہی میں ایک "شخص" سے بڑھ پھیل کر ایک "شخصیت" کے مقامِ بلند پر فائز ہو جاتا ہے وہ دُوسرے لوگوں سے کچھ اس انداز میں بات کرنے لگ جاتا ہے جیسے کسی اُونچے مینار سے بات کر رہا ہو۔ ندیمؔ سے اب بھی گاہے ملے ادب کے "ہوائی اڈوں" یعنی مشاعروں میں ملنے کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ اِسی اکتوبر میں جب واہ کلب والوں نے اِن کے اعزاز میں ایک شام آراستہ کی تھی تو ہم دونوں نے اُسی کرنل ایس ایم۔ کے شادؔ کے گھر میں ایک پوری شب گُم رفتہ کو آوازیں دینے میں گزار دی تھی۔ میں ندیمؔ سے جب بھی ملا ہوں، بلکہ جو کوئی بھی اُس سے ملتا ہے، وہ ندیمؔ کی انسان دوستی، اس کے حلم، اخلاص اور انکسار سے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ مجھے تو ندیمؔ اب بھی وہی ندیمؔ معلوم ہوتا ہے جو آج سے تیس۳۰ برس قبل مجھے ریواز ہوسٹل میں ملا تھا۔ بلکہ یہ شاخ اثمارِ شیریں سے جس قدر بھرتی جا رہی ہے، اُتنی ہی جھکتی جا رہی ہے۔ جن دنوں میں یہ سطور لکھ رہا تھا، انہیں دنوں صدرِ پاکستان نے عظیم الشان "منگلا ڈیم" کا افتتاح فرمایا تھا۔ ندیمؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے جب اس کی رنگا رنگ تخلیقات پر نظر پڑی تو دفعتاً میرا ذہن منگلا ڈیم کی طرف منتقل ہو گیا۔ ندیمؔ بھی ادب و تہذیب کا عظیم الشان منگلا ڈیم ہی تو ہے۔ مثلاً دیکھیے:

منگلا	اور	ندیمؔ
منگلا تعمیر و تسخیر کا کارنامہ ہے۔		ندیمؔ۔ تخلیق و تسخیر کا سرچشمہ ہے

منگلا کی بجلی سے شہر اور بن روشن ہوں گے۔ ندیم کی روشنی سے ذہن و جہاں روشن ہو رہے ہیں۔

منگلا زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کریگا۔ ندیم دلوں اور خیالوں کو سیراب کرے گا۔

منگلا سے کئی مختلف نہریں جاری ہوں گی۔ ندیم سے اس سے مختلف اصنافِ ادب کی کئی نہریں جاری ہیں۔

منگلا سب سے بڑا ذخیرہ آب ہے۔ ندیم سب سے بڑا ذخیرہ ادب ہے۔

منگلا عظیم الشان منصوبہ ہے۔ ندیم عظیم الشان انسان ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ خشت و آب کے منگلا ڈیم اور ادب و تہذیب کے منگلا ڈیم — ان دونوں عظیم الشان سرچشموں کو تادیر سلامت رکھے۔ ۔ ۔ یہ دونوں ہماری آبرو کی علامت ہیں۔

ادا جعفری

ندیم بھائی

آج جو میں ندیم بھائی کے بارے میں مضمون لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کہیں یہ میری بہت بڑی جسارت تو نہیں۔ ان کی ادبی حیثیت کا جائزہ لینے کی مجھ میں ہمت کہاں؟ کہ بڑی بڑی شخصیتیں ان کے کمالِ فن کا شاعری سے لیکر افسانہ نگاری اور صحافت تک اعتراف کر چکی ہیں۔ پھر بھلا میں کس گنتی میں ہوں۔ اور جو ذاتی اور گھریلو باتیں بتاؤں تو کس برتے پر۔ کہ ان سے میری جان پہچان ابھی تک چند ہی ملاقاتوں تک محدود ہے۔ مگر میں نے یہاں جان پہچان کا لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ جانتی تو میں ان کو اس وقت سے ہوں جب سے ہوش سنبھالا ہے (ہوش سنبھالنے کی عمر بھی کوئی دس بارہ سال ہوتی ہے نا؟) اور پہچان؟ تو پہچاننے کے لیے کبھی کبھی ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے۔ اور ندیم بھائی کا ذکر ہو تو اس میں پہچاننے والے کا کوئی کمال نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شخصیت ہی اتنی سلجھی ہوئی، اتنی سادہ اور پُرخلوص ہے کہ آپ ان سے ایک بار باتیں کر لیجیے اور آپ کو یقین آجائے گا کہ آپ تو ان کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ بلکہ ممکن ہے آپ حیران بھی ہوں کہ وہ بالکل اسی طرح ملیں گے جیسے عام لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چہرے پہ کوئی بہت بڑے ادیب اور

بہت بڑے شاعر کا لیبل نہیں لگا رکھا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں ایک بار ایک ایسی افسانہ نگار ہستی سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکی ہوں جن کا ہر انداز پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ دیکھو کہیں یہ نہ بھول جانا کہ تم اس وقت کس سے مخاطب ہو۔ اور اس ملاقات کے بعد میں اس قدر تھک گئی تھی جیسے انسائیکلوپیڈیا یا لغت کا بغور مطالعہ کرتی رہی ہوں۔

ہاں تو بات میرے ہوش سنبھالنے کی ہو رہی تھی (ویسے یہ بتاتی چلوں کہ میری چند بے حد پیاری دوستوں کی رائے میں یہ سعادت مجھے آج بھی حاصل نہیں ہو سکی ہے!) یہی کوئی دس بارہ سال کی عمر ہوگی جب میری چیزیں رسالوں میں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ ان دنوں ندیم بھائی "ادب لطیف" کی ادارت کر رہے تھے اور اس طرح میرا اس عظیم بھائی سے تعارف ہوا۔

گھرانہ قدامت پسند تھا۔ میں پردہ کرتی تھی۔ سر پر باپ کا سایہ تھا نہ کوئی بڑا بھائی۔ دو بڑی بہنیں تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی ابھی ناسمجھ تھا۔ ایسی حالت میں ندیم بھائی نے مجھے نہ صرف بڑے بھائی کی شفقت اور محبت سے نوازا بلکہ وہ میرے ناصح مشفق اور مشیر کار بھی تھے۔ گھر کا وہ کون سا بھید تھا جو میں نے ان سے چھپایا ہو اور ننھی منی خوشیوں سے لیکر عہد طفل کی بے بنیاد پریشانیوں تک وہ کونسی بات تھی جس میں انہوں نے مجھے مشورہ نہ دیا ہو۔

آج جب میں یہ باتیں لکھ رہی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ نوجوان جو گھر سے میلوں دور روزی کمانے کی خاطر نکلا ہو اور جس نے محض اپنے ضمیر کے حکم پر لگی لگائی نوکری چھوڑ کر صرف قلم ہاتھ میں تھام لیا ہو اس کے پاس آتنا وقت کہاں تھا کہ دور دیس میں بسنے والی ایک

چھوٹی سی بچی کی خوشی کی خاطر اس کی بے سروپا باتوں کا جواب لکھتا ہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات غالباً اگست یا ستمبر ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ میں لاہور میں جعفری صاحب کی بہن کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ ندیم بھائی کو اطلاع ہوئی تو وہ ملنے کے لیے آئے۔ کم گو، متین اور پُرخلوص اور مجھے لگا کہ میں تو پہلے ہی ندیم بھائی سے ملتی رہی ہوں۔ انہیں دنوں میرے شوہر کا تقرر لاہور میں ہوگیا۔ چھاؤنی میں ہمارا گھر تھا۔ وہاں ندیم بھائی نور سے ملنے تشریف لائے۔ خاصی دلچسپ ملاقات تھی میاں دیہ آشنا اور بھائی خاموش طبع۔ مگر وہ جو کسی نے کہا تھا کہ خلوص کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ ان دنوں میں قلم سے اپنا ناطہ توڑ چکی تھی اور جعفری صاحب میرے بدلے میرے عزیزوں سے خط و کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ اس پندرہ سولہ سال کے عرصے میں ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے لیے سو گاہے گاہے خطوط کی آمد و رفت جاری رہی ہے وہ انہی دونوں کے درمیان۔

یوں ہی آپ کسی اہلِ قلم سے ملتے تو اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ کہ آپ اس کی اصلی شخصیت سے (جس سے کبھی کبھی وہ خود بھی ناآشنا ہو سکتا ہے) متعارف ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایک سچا ادیب یا شاعر جب قلم ہاتھ میں تھامتا ہے تو اس سے بہت پہلے وہ اس لمحے یا واقعے کو اپنی رُوح میں جذب کر چکا ہوتا ہے جس کو الفاظ کا جامہ پہنانے چلا ہے۔ اور اس طرح حدیثِ دیگراں میں بھی اپنی شخصیت کے کچھ گوشے بے نقاب ہوتے جاتے ہیں۔

پھر ندیم بھائی جنہوں نے اپنی زندگی قلم کے لیے وقف کر دی۔ اور وہ جن کا واحد سہارا

اور تنہا سہارا بھی قلم ہے۔ اور وہ ندیم جو اس قلم کا احترام کرنا بھی جانتا ہے۔ وہ جو حساس دل لیکر انسانیت کا پرچار کرنے نکلا تھا کئی مرتبہ معتوب ٹھہرایا گیا۔ مگر کوئی طاقت اسے اس کی ڈگر سے نہیں ہٹا سکی۔ کسی امتحان میں اس کے پائے استقلال کو جنبش نہیں آئی۔ وہ جس کے یہاں شعر عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ سوچتی ہوں جس شعر میں اتنا سوز و گداز بھرا ہوتا ہے اسکو تخلیق کرتے وقت خود شاعر کس کرب کے عالم سے گزرا ہوگا۔

تو آج جو میں نے قلم ہاتھ میں اُٹھایا ہے تو محض ایک ذرا سی بات کہنے کے لیئے۔ اور بات بھی وہ جو کسی سے ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ کہ ندیم بھائی انسان ہیں ـــــ بہت بڑے انسان۔ کیونکہ انسان کبھی چھوٹا نہیں ہوتا آج کی دُنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے مگر انسان کی تلاش میں نکلو تو خون تھوکنا پڑجاتا ہے۔ یہ سیدھا سادا، کم گو مردِ ناتواں اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ سچائی اور اصول کی بات آجائے تو پہاڑوں سے ٹکرا جائے۔

پچھلے دنوں ندیم بھائی کا خط آیا تو انہوں نے تذکرتاً لکھا کہ "۲۰ نومبر کو نصف صدی کا ہوجاؤں گا۔" میں نے لکھنا چاہا کہ آپ جیسے لوگ اپنی عمر کو ماہ و سال کے پیمانے سے کس طرح ناپ سکتے ہیں۔ انسان تو صدیوں سے چلا آرہا ہے اور صدیوں تک اسے جینا ہے ورنہ دُنیا کیسے قائم رہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھ میں جو چراغ ہے وہ آپکی اصلی عُمر ہے۔ اور یہ چراغ تو ہاتھوں ہاتھ آپ تک پہونچا ہے۔ اور اسے ابد تک روشن رہنا ہے۔ پھر اس نصف صدی کی بات پر کیسے اعتبار کرلوں۔

ایک بات اور چپکے سے بتاتی چلوں کہ میری ندیم بھائی سے لڑائی بھی ہوتی ہے۔

اِس حقیقت کا تو ہر وہ شخص اعتراف کریگا جسنے ان کو ذرا بھی نزدیک سے دیکھا ہے کہ وہ اپنی خاطر کبھی کسی کو تکلیف یا زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔ مگر میری اِن سے ہمیشہ اسی بات پر لڑائی ہوتی ہے۔ اب ایسا بھی کیا کہ دُوسروں کو بالکل ہی کانچ کا بنا ہوا سمجھ لیا جائے۔ مجھے تو ابھی تک ندیم بھائی میں بس یہی ایک خرابی نظر آئی ہے۔ ممکن ہے ان میں اس کے علاوہ بھی کچھ خامیاں ہوں مگر مجھے اِس سلسلہ میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اور پھر سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ آج تک کسی بہن کو اپنے بھائی میں کوئی بُرائی نظر آئی ہے؟

عزیز اثری

گناہ گار ندیم

میرے ایک شاعر دوست کا کہنا ہے کہ جو شخص شراب نہیں پیتا، اُس کی ذات پر بھاری قفل پڑا رہتا ہے۔ اور اس کے اندر جھانکنا ناممکن ہے۔ ندیم نے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کبھی شراب نہیں پی اور میرے دوست کے نظریے کے مطابق بلاشبہ اُن کی ذات مقفل ہے۔ لیکن بعض ہنرمند لوگ بڑے بڑے قفلوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور نقب لگا کر اندر جا داخل ہوتے ہیں۔ اگر کسی نقب زن نے ندیم کے اندر گھسنے کی سعادت حاصل کی تو اس پر سب سے پہلے یہ انکشاف ہوگا کہ باہر کا دروازہ تو صاف کھلا ہوا تھا اور وہ چیز جسے وہ قفل سمجھ رہا تھا۔ اس کی اپنی کوتاہیٔ نظر کا کرشمہ تھا۔ ندیم کی ذات تو لوٹنے والے اور لٹنے والے دونوں کی پناہ گاہ ہے۔

لیکن خواتین و حضرات! مجھے ندیم کی "ذاتی" ذات اُن کی زاہدانہ روش اور دیگر گناہ دشمن حرکات سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ابھی چند روز پہلے ندیم کے ایک عقیدت مند نے ایک محفل میں ندیم کو فرشتہ کہہ ڈالا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا حضرت! آپ ندیم پر فرشتہ ہونے کا الزام کس خوشی میں عائد کر رہے ہیں۔ وہ بھنّا گئے۔ بولے کیا ندیم میں

فرشتوں ایسی خصلتیں نہیں ہیں۔ کیا ندیم نے کبھی کوئی گناہ کیا ہے۔ کیا کبھی کسی کے ساتھ کوئی بُرائی کی ہے۔ مَیں نے جواب دیا۔ تمہارا فرشتہ تو کوئی گناہ یا بُرائی کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا تم ندیم کو فرشتہ کہہ کر اُن کی توہین مت کرو۔ اِس لئے کہ ندیم اِنسان ہے اور اِنسان میں فرشتگی اور شیطنت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ اِنسان کی ایک حرکت کی وجہ سے اُسے شیطان سمجھ لینا یا ایک اور بات کی پاداش میں اسے فرشتہ بنا دینا کہاں کی اِنسانیت ہے۔

اُن عقیدت مند صاحب کو یہ جواب دے کر مَیں گھر آیا تو مجھے اپنی مذکورہ بالا دلیل سے مایوسی ہُوئی۔ مَیں نے اپنی کم عقلی پر خود کو لعن طعن کی اور اُس وقت مجھے ندیم کی زاہدانہ زندگی پر غصّہ آنے لگا۔ آخر اس شخص نے گناہ کیوں نہیں کیا؟ شراب کیوں نہیں پی۔ ادھر — مَیں نے اپنے آپ سے کہا — وہ مارا۔ ارے بھئی ندیم سگریٹ جو دھڑا دھڑ پیتے ہیں اور اِتنے بڑھیا سگریٹ — کیا یہ گناہ نہیں ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مَیں نے خود سے کہا۔ ہُونہہ سگریٹ پینا بھی کوئی گناہ ہے۔ ارے میاں! سگریٹ تو کئی سِکھ حضرات بھی چھپ چھپا کر پی لیتے تھے۔ حالانکہ اُن کے مذہب میں تمباکو نوشی حرام ہے۔ اِس طرح تو سِکھ ندیم سے زیادہ بہادر اور گُناہ گار ہُوئے۔

پھر مَیں نے سوچا کہ یہ گناہ دوستی اور گناہ دشمنی کا چکر ہی بکواس ہے۔ ندیم فرشتہ نہیں ہے۔ اور اِس لئے نہیں کہ وہ گناہ نہیں کرتا بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اِنسان ہے۔ اور اِنسان کبھی فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فرشتہ تو وہ مخلوق ہے جس کا ہماری زمین سے (سوائے اُن فرشتوں کے جنہیں ہماری مخبری پر متعین کیا گیا ہے) کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ندیم تو سراسر

زمینی مخلوق ہے۔ ندیم کا خمیر اس مٹی سے اٹھا ہے جس کی خوشبو میں گیت اُگتے اور نوحے پلتے ہیں۔ یہ زمین جو آہنی ہل کا کُھرپے سے گہرا زخم ہنس ہنس کر برداشت کرتی ہے۔ تخلیق کا درد سہنے والی ماں کی طرح۔ ندیم نے مادرِ زمین کا درد اپنی ذات میں جذب کر لیا ہے۔ اس کے زخموں کا زہر چُوس چُوس لیا ہے۔ اس کی ذات انسانی دُکھوں کے لیے "بلاٹنگ پیپر" بن گئی ہے۔

یہاں پھر میں سوچتا ہوں کہ ندیم اگر شراب پی لیتا تو اس کا ازلی کرب کچھ کم ہو جاتا۔ حساس لوگ عموماً دُکھوں کو بھول جانے کے لیے ہی تو پیتے ہیں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ندیم شراب پی لیتا تو وہ ضرور فرشتہ بن جاتا۔ سُنا ہے کہ جناب آدمؑ کو ایک بڑی لذیذ نعمت چکھنے کی پاداش میں عرش سے نیچے لُڑھکا دیا گیا تھا لیکن ندیم ——— ایک آدم زاد اگر ایک بڑی نعمت اپنے اندر اُنڈیل لیتا تو وہ فرش سے عرش کی طرف اُٹھ جاتا۔ لیکن ندیم وہ شے ہے جس نے چند لمحوں کے لیے بھی زمین سے اُوپر اٹھنا گوارا نہیں کیا۔ وہ ایک ننھے بچے کی طرح ہمیشہ سے دھرتی ماں کے سینے سے چمٹا ہوا ہے۔ اس سینے سے دُودھ ملا ہے تو بھی اور اگر نہیں ملا تو بھی ——— ندیم کی تخلیقات اور اس کی ذات دھرتی سے پیار کرنے کی آپ بیتی ہے۔

ندیم کے ایک اور مداح، جنھوں نے ندیم کو کبھی نہیں دیکھا تھا، میرے ساتھ ندیم کے درشن کرنے کے لیے "فنون" کے دفتر میں آئے۔ ندیم اس وقت حسبِ معمول اپنے احباب کے جُھرمٹ میں تھے۔ لطیفے پر لطیفہ بیان کر رہے تھے۔ اور قہقہے لگا رہے تھے۔ جب ہم

ہر نکلے تو اُن کے عقیدت مند بالکل خاموش چل رہے تھے ۔ مَیں نے پُوچھا : تمہیں ندیم کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہوگی ۔" وہ بولے ۔" مجھے قطعاً خوشی نہیں ہوئی ، اُلٹا مایوسی ہوئی ۔ کیا یہی شخص وہ ندیم ہے ۔ جس کی شاعری میں اس قدر فکر اور تاثیر اور افسانوں میں بہت دلکشی پائی جاتی ہے ۔ یہ شخص تو عجیب عجیب لطیفے سُنا رہا تھا اور بے تُکے پن سے چھت پھاڑ قہقہے لگا رہا تھا ۔"

مذکورہ شخص کی مایُوسی میری سمجھ میں آتی ہے ۔ اُس نے ندیم کی شخصیت کا جو امیج (IMAGE) اپنے ذہن میں قائم کیا تھا ، ندیم اس کے برعکس نکلے ۔ ہمارے ہاں شخصیتوں کو ملفوف کر کے پیش کرنے کی روایت عام ہے ۔ ہم جس چیز کو مقدس جانتے ہیں ، اسے غلافوں اور پردوں میں چھپا دیتے ہیں ۔ ہمیں ہر وہ چیز ، جو نقاب پوش ہو ، اچھی لگتی ہے اور اس لیے ہمیں اکثر کسی ڈاکو پر حسین دوشیزہ ہونے کا گمان بھی گزر جاتا ہے ۔ ہم اپنے ممدوح کو کفن پہنا کر ، اس کی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے اور اسے منوں مٹی تلے دبا کر اس کی پرستش کرنے کے عادی ہیں ۔ لیکن ندیم نہ تو دفن ہونے کے لیے تیار ہے اور نہ خود کو چھپانے کا قائل ہے وہ خود کو تو کیا ، کسی دُوسرے کو بھی غلاف میں پنہاں نہیں دیکھ سکتا ۔ اُس کا نظریہ ہے کہ جو شخص کھل کر قہقہہ نہیں لگاتا وہ ایک سربستہ راز ہے ـــــــ اس کی ذات مکمل طور پر مقفل ہے ۔

ندیم کے اس نظریے کے سامنے آتے ہی مجھے پھر اپنے وہ دوست یاد آجاتے ہیں جو شراب نہ پینے والے کی ذات کو مقفل سمجھتے ہیں ۔ اور مجھے فوراً بزرگوں کا قول یاد آجاتا ہے ، کہ زور زور سے ہنسنا عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے ۔ بے سروپا لطیفے کہنا اور چھت پھاڑ قہقہے

لگانا یقیناً گناہ ہے۔ قہقہہ وہی لگاتا ہے جو بہت خوش ہو اور خوشی بھی تو ایک قسم کی شراب ہی ہے۔ وہ شراب جس کا نشہ کوئی ترشی نہیں اتار سکتی۔ لہٰذا ندیمؔ مسرت کی بہت بڑھیا شراب پیتا ہے۔ وہ یقیناً گنہ گار ہے۔

لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ انسان نشے کی حالت میں پہچانا جاتا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انسان کی اصلیت عیش اور طیش یا غم اور مسرت کے عالم ہی میں کھلتی ہے۔ انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے اُس کی آزادی کا سلب ہو جانا۔ آج سے چند سال پہلے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے جرم میں کئی لوگ پکڑے گئے۔ ان گناہ گاروں میں ندیمؔ بھی تھے۔ انہیں بھی جیل میں بھیج دیا گیا۔ جیل کے ایک عینی شاہد مرزا ابراہیم کا کہنا ہے کہ جیل کی کال کوٹھری میں بڑے بڑوں کا ملمع اتر گیا۔ ہمارے کئی ساتھی جیل میں یا تو انتہائی دکھی تھے یا پھر ذرا سی آسائش ملتے ہی رئیسانہ ادائیں دکھانے لگے لیکن ندیمؔ دونوں حالتوں میں ذرا نہیں بدلے۔ وہ ہمیشہ مسکراتے اور اپنے قہقہے آزادی کے ساتھ قیدیوں میں بانٹتے رہے۔ مرزا ابراہیم کہتے ہیں۔ محکمہ جیل کی طرف سے ہمارے ساتھیوں کے کام کرنے کے لئے مشقتی مامور تھے لیکن ندیمؔ اپنا ہر کام خود کرتے۔ اپنے کپڑے دھوتے، کمرہ صاف کرتے، کھانا پکاتے اور اس کے بعد دوسروں کے کام بھی کر دیتے۔ ساتھ ہی ہنستے ہنساتے بھی رہتے تھے۔ مرزا ابراہیم کی یہ بات سُن کر میں نے اُن سے کہا "اجی حضرت! آپ ندیمؔ کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے نہیں جانتے کہ ان کی ہنسی وغیرہ کا راز کیا تھا۔ دراصل ندیمؔ کا نشہ جیل میں بھی پورا ہو جاتا ہوگا۔ ان کی خوشی کی خفیہ سپلائی لائن زنداں میں بھی قائم رہی ہوگی۔ اسی لئے وہ مسرور اور سرشار نظر آتے تھے۔"

خواتین و حضرات ! آپ بھی یہی سمجھتے ہیں نا کہ ندیم شراب نہیں پیتے - ہاں وہ شراب ندیم واقعی نہیں پیتے جو انگور، ملاٹے، گڑ یا جو وغیرہ سے بنتی ہے۔ ندیم کے شراب نہ پینے کی وجہ اُن کی نیکی و بدی ہرگز نہیں ہے۔ یقین کیجئے کہ ان کے اس گریز کی تہ میں ایک خوف چھپا ہوا ہے۔ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ نہ جانے شراب پی کر ان کی کیا حالت ہو گی۔ انہوں نے اپنے کئی دوستوں کو اکثر پی کر بہکتے دیکھا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ وہ بھی ایک دن پی کر خدانخواستہ کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کر بیٹھیں یا پھر اُن کا چہرہ مضحکہ خیز نہ دکھائی دینے لگے۔ یا پھر اُن کے عام اہتمام میں کوئی فرق نہ آجائے۔ ندیم اپنی زندگی میں سلیقے اور اہتمام کے بڑے قائل ہیں۔ اہتمام، اطوار میں، لباس میں، دوستوں سے ملاقاتوں میں، کتاب نما کے حساب کتاب اور فنون کی اشاعت کے سوا، وہ ہر کام میں باقاعدگی اور اہتمام رکھتے ہیں۔ میری رائے میں وہ شروع ہی سے اہتمام کے رسیا رہے ہوں گے۔ کیونکہ وہ بچپن میں روتے بھی اہتمام سے تھے۔ باقاعدہ پروگرام بنا کر۔ وضو کر کے۔ نیت باندھ کر اور جماعت کھڑی کر کے۔ بچپن میں ان کی آنکھوں کی نماز کی اذان اُن کے بھائی دیتے تھے۔ پھر دونوں با جماعت کھڑے ہو جاتے۔ لیکن امامت کون کراتا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہیں —— میں نے انہیں روتا کبھی نہیں دیکھا لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ اب بھی جب کبھی رونے پر آتے ہیں تو خوب خوب برستے ہیں۔ اِس قدر روتے ہیں کہ ان کا دامن بھیگ جاتا ہے —— مجھے بتایئے یہ "تر دامنی" نہیں تو اور کیا ہے۔

معلوم نہیں کہ وہ اپنا دامن نچوڑ کر کسی فرشتے کو وضو کراتے ہیں یا نہیں لیکن یہ بات بالکل واضح

ہے کہ آج کھلے سنسار کی بادشاہی مسجد میں وہ آنکھوں کی نماز کے لیے خود ہی اذان دیتے ، خود ہی صفیں درست کرتے اور خود ہی امامت فرماتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اُن کی بے زادگی کی وجہ سے انہیں امامت کرنے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ اب دیکھئے نا...... اُدھر تو خلوت میں آنسوؤں کی عبادت کی امامت کر کے آتے ہیں اور ادھر محفل میں آتے ہی لطیفہ بازی میں پیش امام بن کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے امامت کرنے کے چسکے نے کئی لوگوں کو ان کے مُقتدی بننے کی لت لگا دی ہے۔ خود مجھے بھی یہ لت ایسا لگا ہے کہ کئی کئی بار طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے ندیم کے ہاں پہنچ جاتا ہوں۔ رونی صورت بنا کر بیٹھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں "ندیم صاحب! بہت ہو چکی اب دُکھوں کی یہ صلیب اُٹھائی نہیں جاتی۔"

ندیم دُور کی چیزیں دیکھنے والا چشمہ لگا کر مجھے بہت نزدیک سے دیکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں "لاؤ اپنی یہ صلیب میرے کندھوں پر رکھ دو کیونکہ میں بہت بڑی صلیب اُٹھا اُٹھا کر بوجھ سہنے کا عادی ہو گیا ہوں اور وہ چپکے سے میری صلیب اپنے کندھے پر رکھ لیتے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں: "آؤ چُپ چاپ چلے آؤ"۔۔۔۔۔ اور میں اُن کی امامت کا نشئی اُن کے پیچھے ہو لیتا ہوں۔ پھر کہتا ہوں ۔۔۔ "رات ہو گئی ہے۔ اِس قدر اندھیرا ہے" اور اس اندھیرے میں مجھے، تلخی اور محرومی کا خنجر اپنے سینے کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ ندیم اس خنجر کو اپنے سینے پر روکتے ہیں۔ راستے کے ہر کانٹے کو ہاتھ سے ہٹاتے ہیں۔ جب ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے تو اُسے میری نظر سے بچا کر اپنی بغلوں میں چھپا لیتے ہیں۔ میں خون کا کوئی قطرہ گرتے دیکھتا ہوں، کچھ پوچھنے لگتا ہوں تو وہ فوراً کہتے ہیں: "بھئی تمہاری آنکھوں سے یہ موٹا سا قطرہ کیوں گرا ہے،

آنسو پونچھ لو اور سامنے دیکھو۔ سامنے، جہاں منزل ماں کی طرح بانہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ آگے بڑھو۔ چُپ چاپ چلتے رہو ——— اور مَیں سحر زدہ چلتا رہتا ہوں حتیٰ کہ کسی مُبارک اور روشن لمحے میں مجھ پر اُن کی "چال" واضح ہو جاتی ہے۔ اچھا تو یہ بات تھی۔ جناب مجھ پر مشقِ امامت کرنے کے لئے مجھے بہلا پھسلا کر یہاں تک لے آئے ہیں۔

خواتین و حضرات! مجھے ڈر ہے کہ آپ لوگ بھی، جو اُن کی شاہیں مِلنے پر اُتر آئے ہیں کہیں اُن کی امامت کے ہتھے میں نہ آ جائیں۔ کیونکہ ان کی یہ امامت نہایت پُر فریب ہے۔ وہ ہوتے آگے آگے ہیں لیکن محسوس یُوں ہوتا ہے جیسے وہ آپ کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملائے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہیں۔ غالباً اپنی امامت کو "کیموفلاج" کرنے کے لئے ہی اپنا نام ندیم رکھ لیا ہے۔ اور آج میں ان کی امامت گزیدہ اور ستم رسیدہ شخص آپ کو بتاتا ہوں کہ اُن کی امامت کے چکر نے کئی بار میری اَنا کے سینے پر مونگ دَلی ہے اب دیکھئے کہ مَیں دفتر "فنون" میں بیٹھا ہُوں اور کچھ ایسے حضرات تشریف لاتے ہیں جو ندیم کے علاوہ مجھ سے بھی صاحب سلامت رکھتے ہیں۔ وہ آتے ہی پُوچھتے ہیں "ندیم صاحب نہیں آئے؟" مَیں جواب دیتا ہوں "تھوڑی دیر تک آ جائیں گے۔ آپ تشریف رکھئے۔" وہ کھڑے کھڑے فرماتے ہیں "اجی جب ندیم ہی نہیں ہیں تو ہم بیٹھ کر کیا کریں گے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ واپس سیڑھیاں اُتر جاتے ہیں۔ اور تماشا دیکھئے میرے کئی دوست جو خالصتاً مجھ سے ملنے کے لئے "فنون" کے دفتر میں آتے تھے۔ ذرا دیر تک مجھ سے باتیں کرنے کے بعد پُوچھتے ——— "ندیم صاحب نہیں آئے؟ ——— "بس آتے ہی ہوں گے"۔ میرا جواب ہوتا

وہ دو چار باتیں کرنے کے بعد پھر پوچھتے: "ویسے ندیم صاحب کس وقت یہاں آجایا کرتے
ہیں" میں انہیں تسلی دیتا۔ ساتھ ہی دیکھتا کہ ان حضرات کی نظریں سیڑھیوں کی طرف لگی ہیں
سمجھ جاتا کہ ان لوگوں کی نیت بھی نیک نہیں۔ میں جل کر کہتا: "ارے نامعقولو! تم سب کو ندیم
کیوں ہوتا جا رہا ہے؟" آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے خلقِ خدا کو ندیم کی لپیٹ سے
کا فرض سنبھالا۔ میں نے بچوں کا تھیٹر بنا دیا۔ اور ندیم کو محض یہ جتلانے کے لئے کہ میں ان
CULT سے بہتر تڑوا چکا ہوں ان کے سامنے بچوں کے تھیٹر کے قیام کا اعلان کر دیا۔
مسکرا کر بولے "یہ تو پاگل پن ہے۔" میں دل میں بہت خوش ہوا کہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اب
میرے اس اقدام کی مخالفت کریں گے اور میں آزاد ہو کر خوب من مانی کروں گا۔ "یہ پاگل پن
بھائی!" ندیم نے کہنا شروع کیا۔ "مگر بڑے کارنامے اکثر دیوانے ہی انجام دیتے ہیں۔
ثابت قدمی سے ڈٹ جاؤ ——— میں تمہارے ساتھ ہوں" ... بیڑہ غرق۔ میں نے اپ
آپ سے کہا اور جل کر کباب ہی تو ہو گیا۔

ان دنوں بچوں کے ڈرامے تیار کرنے کے لئے کوئی معقول جگہ نہیں مل رہی تھ
ندیم کو پتہ چلا تو فوراً مجھ سے کہا: "بھئی ریہرسل "فنون" کے دفتر ہی میں کرا لیا کرو۔" میں نے
اچھا ہے۔ ڈرامے میں بیس اکیس بچے کام کرتے ہیں۔ "فنون" کا دفتر اپنی ضخامت کے اع
سے بالکل دفتری ہے۔ وہاں بچے زور زور سے مکالمے بولیں گے یا ویسے ہی اودھم مچائیں
تو ندیم چلا کر کہیں گے: "ہٹاؤ یہاں سے دکانداری کم بخت بچے کام ہی نہیں کرنے د
اسی شام کو میں نے وہاں ریہرسل شروع کرا دی۔

اگلے دن کیا دیکھتا ہوں کہ بچے، جو عام طور پر رہبرسل میں دیر سے آتے تھے آج وقت سے ایک گھنٹہ پہلے آپہنچے ہیں۔ میں نے حیران ہوکر وجہ پوچھی، تو بچوں نے جواب دیا "ذرا سی دیر ندیم صاحب کے پاس بیٹھیں گے"۔۔۔۔ لیجئے دو تین روز ہی میں بچوں کو "ندیمیت" کا زہر چڑھ گیا۔

ندیم کی امامت کی لپیٹ بڑوں اور بچوں تک ہی محدود نہیں، صنفِ نازک بھی اس جگہ میں آتی جا رہی ہے۔ مجھے بتایئے کہ کیا شخصیت کی زلفِ گرہ گیر سے مَرد و زن اور خورد و کلاں کو باندھ لینے کی حرکت مسمریزم کے عمل سے کم ہے؟۔

بزرگ کہتے ہیں کہ گناہ گار شخص کی ذات کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے، جو ہر معمول کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہاں بالکل وہی معاملہ ہے، اور یہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ "ندیمیت" کا سیلاب ہمارے ملک کی سرحدوں کو پار کرکے ہمسایہ ملکوں میں گھستا جا رہا ہے۔ تازہ اطلاعات مظہر ہیں کہ روسیوں اور چینیوں کو بھی "ندیمونیا" نے گھیر لیا ہے۔ کچھ دن پہلے میں نے خود اپنی ان گناہگار آنکھوں سے ندیم کے خطوں میں روسی لڑکیوں کے خط پکڑے ہیں۔ اور یہ جان لیجئے کہ جب لڑکیوں کے اور وہ بھی کمیونسٹ ملکوں کی لڑکیوں کے خط آنے لگیں تو معاملہ کتنا سنگین ہو جاتا ہے۔ ندیم سے جب میں نے ان خطوں کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے "بھائی یہ لڑکیاں ماسکو یونیورسٹی میں میرے افسانوں پر ریسرچ کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں مجھ سے مدد مانگی ہے"۔ میں نے اپنے دل میں کہا، آپ جو جی چاہے کہتے رہیئے لیکن میں سب جانتا ہوں کہ اندر سے معاملہ کیا ہے۔

پھر نہ جانے اُن لڑکیوں نے کیا چکر چلایا کہ ایک دن پورے روس میں شور مچ گیا۔ ہوشیار

خبردار۔ ندیم نے عمر کی آدھی سینچری مار لی۔ اور روسی تو پہلے ہی ڈھنڈورچی قسم کے لوگ ہیں انہوں نے پوری دُنیا میں ندیم کی اس بہادری کو مشتہر کر دیا۔ مبارکبادوں کے تار آنے لگے۔ افسانوں کے ترجمے پڑھے جانے لگے۔ دِن منائے جانے لگے۔ حتیٰ کہ ہم لوگوں کو بھی خبر ہوئی کہ ندیم پچاس سال تک پہنچ گئے۔

اُدھر چین میں بھی "ندیمیت" کا غلغلہ بلند ہوا۔ چین نے روس سے بازی لے جانے کی کوشش میں ندیم کی نظموں کے مجموعے چینی میں لاکھوں کی تعداد میں چھاپ مارے۔ ندیم روس اب تک نہیں گئے۔ ایک بار چین ضرور ہو آئے ہیں۔ ہماری حکومت نے بہت اچھا کیا جو دوبارہ اُنہیں چین میں گھسنے نہیں دیا۔ کیونکہ اگر ندیم دُوسری بار چین جاتے اور وہاں سے لوٹتے تو چینیوں کا ایک جمِ غفیر اُن کے پیچھے پیچھے ہوتا اور وہ سب "یا ندیمو یا ندیمو" کا ورد کرتے نظر آتے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ ندیمیت کا سیلاب چین، روس اور ایسے ہی دوسرے ملکوں یعنی "غلام" دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد "آزاد" دُنیا کی طرف بڑھنے لگا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر صدر جانسن کی دُہائی دیں کہ اے آزاد دُنیا کے آزاد سربراہ! تیرے راج میں ہم مارے گئے۔ تُو ویت نام کی اوکھلی میں سر دیے بیٹھا ہے اور ادھر ایک اور خطرہ بڑھ رہا ہے۔ کچھ اس کا تدارک فرما۔

صاحبِ صدر، اور خواتین و حضرات، آج اپنے ہاں چاروں طرف دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کاش لوگ میری ہی طرح ذہنِ رسا اور دیدہ عبرت نگاہ رکھتے تو ندیم کی ذات کو درگاہ نہ بنا لیتے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ اِس درگاہ پر

آتے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرکے اپنی حماقت پر خوش ہوتے ہیں مجھے بتائیے کہ ایک جادوگر قسم کے شخص کو معصوم اور فرشتہ سمجھ لینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے ؟ ۔

لوگ ندیم کی معصومیت سے اس درجہ دھوکہ کھاتے جا رہے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب اس شہر کے سب سے بڑے گناہ گار کو سنگسار کرنے کی ٹھانی جائے گی اور خلقت اسے شہر سے باہر میدان میں لیکر آئے گی تو کہا جائیگا کہ اس گناہگار کو سب سے پہلا پتھر وہ شخص مارے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو ــــــ اور خلقتِ خدا ایسے بے گناہ اور معصوم شخص کی تلاش میں نکلے گی تو بلا شبہ اس کی نگاہِ انتخاب ندیم پر پڑے گی ــــــ لوگ ندیم کو خوشی خوشی میدان کی طرف کھینچ لے جائیں گے اور اس وقت ندیم اپنی امامت کے احساس سے جھومتا ہوا جلدی جلدی اور خوشی خوشی میدان کی طرف آئیگا ۔ اُس گناہگار کی طرف دیکھ کر مسکرائے گا ۔ پہلا پتھر اٹھائے گا ــــــ اور اسے اپنے سر میں دے مارے گا ــــــ اور پھر دوسرا پتھر بھی ، اگر وہ زندہ رہا تو انشاء اللہ اپنے ہی سر میں مارے گا ۔

خلقتِ خدا حیران پریشان کھڑی ہوگی کہ یہ کیا ہو گیا ــــــ اور تب میں آپ سے پوچھوں گا کہ اب بتائیے ، گناہگار کون تھا ــــــ ندیم ہی تھا نا ! ــــــ اور تم لوگ اُسے فرشتہ سمجھنے کی حماقت کرتے رہے ۔

میں آپ کو بتاؤں گا کہ ندیم ازلی ابدی گناہگار تھا ــــــ اُس کا ایک گناہ تو یہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں پیدا ہوا جو اُسے سمجھ نہ سکے ــــــ اور اس کا دوسرا گناہ ، اور سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ کسی انسان کو گناہگار نہیں سمجھتا ۔

لیکن تم پھر بھی نہیں سمجھو گے ۔ تم کہو گے کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم سمجھ نہ سکے۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ پتھر سے شاعر کے سر کا رشتہ بہت پرانا ۔ بہت گہرا ہے ۔ ہمیں یاد بھی نہ رہا کہ پتھر تو ندیم کی شاعری کا محبوب موضوع تھا —— لیکن یہ پہلا پتھر اب بھی رائیگاں نہیں گیا، کیونکہ یہ پتھر مزار بنانے کے کام بھی تو آتا ہے ۔

اور خلقتِ خدا خوش ہوگی کہ اس کی دلی مراد اور روایت پوری ہوئی ۔ لوگ خوش خوش ندیم کو اعزاز کے ساتھ زمین میں اتاریں گے۔ اس پر منوں مٹی ڈالیں گے ۔ دو زانو ہو کر لہو میں شرابور اسی پتھر کو چومیں گے اور پھر مطمئن ہو کر شہر کو لوٹ جائیں گے — اور میدان میں صرف گنہگار شخص تنہا کھڑا ہوگا —— وہ اس طرف دیکھے گا ۔ ہولے ہولے مزار کی طرف بڑھے گا اور اس پر مجاور بن کر بیٹھ جائے گا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

نوٹ

شاہدرہ میں ندیم کے ساتھ ایک "شام"
منائی تھی ۔ یہ مقالہ اس تقریب کے
موقع پر پڑھا گیا ۔

محمد خالد اختر

ایک دوست کا مرقع

یہ مرقع ڈیڑھ دو سال ہوتے ہیں مَیں نے لکھا تھا تب اس عمدہ ادبی مجلے "فنون" (جسے ندیم ایڈٹ کرتا ہے) کا دفتر بائیبل بک سوسائٹی کے سامنے ایک سٹیشنر کی دکان کی بالائی منزل پر تھا —— ایک چھوٹا سا نیچی چھت کا کمرہ جو ہمیشہ ملنے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ اس میں آٹھ نو کرسیاں تھیں لیکن وہ ہمیشہ کم ہو جاتیں اور اکثر ہمیں ایک کرسی پر دو دو ہو کر بیٹھنا پڑتا۔ اس کے ملنے والے سب ادبی لوگ ہی نہ ہوتے تھے۔ ہر قسم اور ہر قماش کے لوگ اسے ملنے اور اس کی میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے گھڑی دو گھڑی کے لئے چلے آتے۔ اس کے پرانے جاننے والے، کالج اور سکول کے طالب علم، تانگے والے، پتنگ باز، بلکہ فلم ڈائریکٹر بھی (پتنگ باز اور فلم ڈائریکٹروں کا ایک ساتھ ذکر محض اتفاقیہ ہے) اس کمرے میں ہر ایک کا استقبال میٹھی مسکراہٹ سے ہوتا، خواہ وہ کوئی جیب کترا ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ رُپے اُدھار مانگنے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ مَیں نے وہاں ایک دفعہ ایک سُونڈ بونڈ آدمی دیکھا جو ایک آدھ گھنٹے تک اچھی خاصی باتیں کرتا رہا، اور اُٹھتے وقت اس نے ندیم سے دو رُپے مانگے۔ ندیم نے اسے دے دیئے، اور بعد میں مجھے بتایا کہ یہ ایک پیشہ ور ہے

اور تیسرے چوتھے روز آن موجود ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے ندیم نے اسے کبھی انکار کیا ہو گا ——

ایک دفعہ میں نے یقیناً اس کمرے میں ایک قاتل بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک نرم جلد دھیما، چھوٹا سا آدمی تھا جو دوسرے نرم طبیعت دھیمے چھوٹے آدمیوں سے قطعاً نہ تھا! —— کمرے میں ہی میں ندیم کے ایک بڑے پیارے دوست، آنکھوں والے آرٹسٹ مُوجد سے متعارف ہوا اور مُوجد کے کہنے پر ہی میں نے لکھنے کا عزم باندھا۔ مُوجد کے چند سکھ دوست امرتسر سے اپنے ایک ادبی رسالے کا نکالنے کے آرزومند تھے، اور انہیں ندیم کی زندگی اور فن پر مضامین کی ضرورت، میں نے یہ مرقع دو تین دنوں میں گھسیٹا (کیونکہ مجھے چند دنوں کی اجازت دی گئی تھی) اسے مُوجد کے حوالے کیا، جس نے اسے اپنے سکھ دوستوں کو بھجوا دیا۔ وہ "ندیم نمبر" کبھی نہ نکل سکا۔ اور مُوجد کے سکھ دوست یک لخت گویا غائب ہو گئے (غالباً ان کا وجود نہیں تھا، اور مُوجد نے انہیں ایک بڑے مذاق کی خاطر خود ہی ایجاد کیا تھا)۔

"فنون" کا دفتر اب انارکلی بازار کی گہما گہمی میں چلا آیا ہے، بینکوں اور بزنس کے جمگھٹ میں ایک دلیر ناخواندہ مہمان کی طرح! یہ پہلے دفتر سے بڑا، صاف اور بہتر ہے۔ اور گو ندیم کے دوست اب بھی یہاں گویا مقناطیس سے کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں، وہ پہلی سی رنگا رنگی اور رونق یہاں پیدا نہیں ہو سکی۔ ندیم یہاں دوپہر کو بارہ سے ڈیڑھ بجے تک بیٹھتا ہے، اور پھر شام کو سات سے نو تک۔ وہ بے حد مصروف آدمی ہے

کیونکہ وہ نہ ہی صرف "فنون" کو ایڈٹ کرتا ہے، بلکہ ادیبوں کے ساتھ خط و کتابت سے لیکر پروف ریڈری، رسالے کی ترسیل اور بک کیپنگ بھی اسے ہی تنہا کرنی پڑتی ہے۔ "فنون" نے اُسے ایک پائی نہیں دی۔ مگر وہ اسے ایک بچے کی طرح محبت کرتا ہے اور اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اسے زندہ رکھے ہوئے ہے ——— جب مَیں اسے دیکھتا ہوں اس محنتی، پُر خلوص، محبت بھرے انسان کو تو مَیں اس کی طمانیتِ قلب اور حوصلے پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کیا یہ وہی ندیم ہے، مَیں سوچتا ہوں، جو پچیس تیس سال پہلے میری زندگی میں آیا تھا؛ وہ کڑیل، تازہ رو، جذباتی دیہاتی لڑکا، جو اس وقت بھی اپنے گاؤں کی لہراتی پگڈنڈیوں اور ان پر چلتی ہوئی الھڑ صبوحیوں کے گیت لکھا کرتا تھا!!

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں مَیں کیا کہہ سکتا ہوں؟ ندیم میری زندگی میں ۱۹۳۴ء میں آیا، جب مَیں ایس ای کالج بہاول پور میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ یہ اس کریملن کی طرح پیازی گنبدوں کی درس گاہ کے ہالوں میں تھا کہ ہم پہلے پہل ملے۔ اور ایسی دوستی کی بنیاد پڑی جو زمانے کی سب تلخ کامیوں اور حادثات کے بعد اب بھی فاتحانہ طور پر زندہ ہے۔ ندیم مجھ سے تین سال سینئر تھا۔ فورتھ ایر کا طالب علم! مگر ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ سے متعلق تھے جو "سوبجرز" کہلاتا تھا۔ "سوبجرز" کی میٹنگ جمعرات کے جمعرات ایک لیکچر روم میں ہوتی تھی۔ اور انگریزی کا سینئر پروفیسر پیرزادہ اس کی صدارت کرتا تھا۔ ندیم "سوبجرز" کا سیکرٹری تھا۔ اور کالج میگزین کے اُردو اور انگریزی سیکشن کا مدیر بھی! میرا خیال ہے وہ

الی بال ٹیم کا سیکرٹری بھی تھا۔ کالج کی مشہور شخصیتوں میں سے ہونے کی وجہ سے ہم جونیئر اسے
زت اور تعریف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتے تھے۔ اور پھر وہ شعر بھی کہتا تھا
ل میں اتر جانے والے سیدھے سادے شعر، جن میں پہاڑی جھرنوں کی سی روانی اور
کیزگی تھی۔

اور وہ "سولجرز" کی میٹنگز! ہم ان میں اپنے افسانے اور نظمیں اور مضمون لا کر
ھتے اور تعریف کئے جانے پر بڑا فخر محسوس کرتے۔ "سولجرز" کے علاوہ اور بھی دوسرے
وفیسروں کے گروپ تھے۔ مثلاً "لیڈرز"، "تھنکرز"، "فلاسفر" وغیرہ۔ مگر ہم اپنے گروپ کے سب
گے ہونے پر مغرور تھے۔ "سولجرز" میں ندیم تھا اور ندیم کے علاوہ کالج کے اچھے لائق ترین
الب علم ... اور گروپ کی ان میٹنگز میں ہمیں ذہنی تحریک ملتی تھی۔ دھڑکتے
رتے دل کے ساتھ ہم وہاں اپنی بڑی محنت سے لکھی ہوئی تخلیقات پڑھتے تھے۔ اور
اسے پروفیسر پیرزادہ کا ایک تعریف کا لفظ بھی نشیلی شراب کی طرح ہمارے سروں
ڑھ جاتا تھا۔ آج ایک اچھے میگزین میں چھپنے یا اپنی کتاب کے شائع ہو جانے پر بھی
خوشی نہیں ہوتی۔ آدمی پرواہ کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ ان دنوں ہماری ابتدائی ادبی کاوشیں
ں شاہکار لگتی تھیں۔ ستارے ہماری پہنچ میں تھے۔ ندیم پروفیسر پیرزادے کا چہیتا
ب علم تھا، اور ندیم بھی ہم سب کی طرح انہیں حد درجہ تعریف، عزت اور قدر کی نگاہو
دیکھتا تھا۔ اسی لئے اس پروفیسر کے لئے اپنے محسوسات کا ذکر "جلال وجمال" میں
اس طور پر کیا ہے۔ پروفیسر پیرزادہ ہم چھوٹوں کے لئے فی الواقع انگلش لٹریچر کے

مندر کا بڑا پروہت (DOYEN) تھا۔ اب میں سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ پروفیسر پیرزادہ اتنی بڑی بلا نہ تھا جتنا ہم اسے سمجھتے تھے۔ وہ ایک گول ہڑ سانولے ربر کے سے چہرے والا پستہ قد شخص تھا جو اٹک اٹک کر ایک (STACCATO) اور حکمی لہجے میں پڑھتا تھا۔ اس سے بڑی قابلیت اور وسیع علم کا تاثر ہوتا تھا۔ نوجوانی میں ہم آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اپنے فارغ پیریڈ میں اور شام کو اپنے مکان پر، جو لب سڑک تھا، پروفیسر پیرزادہ تیل کے لیمپ کی روشنی میں اپنی چندھی آنکھیں کاغذ پر جمائے بڑے عمیق مطالعے میں غرق نظر آتا تھا۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ یہ دقیق مطالعہ اور پُرانہماک استغراق کسی "انگ لٹ" کی کوئی عظیم ادبی اور علمی کتاب کے لیے نہ تھا۔ بلکہ "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" کے "کراس ورڈ پزلز" کی خاطر تھا۔ وہ ان معموں کے حل کرنے کا بے حد شوقین تھا، اور مجھے یقین ہے کہ ایک بار اس نے غالباً تین سو روپے کا انعام بھی حاصل کیا تھا —— میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ پروفیسر پیرزادہ ایک شارلٹن (CHARLATON) تھا۔ اور اگر میں نے یہ تاثر دیا ہے تو مجھے افسوس ہے۔ وہ آج کل کے نوٹس رٹ رٹ کر پاس ہونے والے ایم اے پروفیسروں سے کہیں زیادہ قابل تھا۔ اسے اچھے ادب اور شاعری کی سچی سوجھ بوجھ اور اصل ذوق تھا۔ اس نے مجھے پریسٹلے اور ٹام لنسن اور کئی دوسرے جدید انگریزی ناول نگاروں سے متعارف کرایا جنہیں میں اب بھی شوق اور مسرت سے پڑھتا ہوں۔

میں ان دنوں انگریزی مصنف رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے جادو تلے تھا، جسے میں نے

اپنے اسکول کے دنوں میں دریافت کیا تھا۔ اور جواب تک میرا چہیتا مصنف ہے۔ نوجوانی کی بلند حوصلگی سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بھی کسی وقت اسٹیونسن بنوں گا۔ اور لڑکوں کے لیے دھانتے سمندروں اور بحری قزاقوں کی ارغوانی کہانیاں لکھا کروں گا۔ امیں خود کو اسٹیونسن کا چیلا کہا کرتا۔ اور اس کی تصویر کو ہمیشہ اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب میں اپنے سینے کے ساتھ رکھتا۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا تھا جتنی ایک آدمی اپنی محبوبہ سے) میں "سوبرز" کی میٹنگز میں اسی قسم کی انگریزی میں لکھی ہوئی کہانیاں پڑھا کرتا۔ ایک بار میں نے ایک دیہاتی کہانی پڑھی جس کا عنوان "صبوحی" تھا۔ صبوحی اس شراب کو کہتے ہیں جو صبحدم پی جائے۔ فارسی بھی میرے مضامین میں سے تھی) ندیم کو یہ کہانی بڑی پسند آئی۔ اگرچہ یہ اس قسم کی احمقانہ رومانی کہانی تھی جیسی رسالہ "عالمگیر" میں لکھنے والے عموماً لکھا کرتے تھے۔ خصوصاً صبوحی کے لفظ نے تو اسے دم بخود کر دیا۔ بعد میں صبوحی اس کی کئی نظموں میں آئی۔ اور حقیقتاً اس کے لیے وہی کچھ بن گئی جو سلمیٰ اختر شیرانی کے لیے تھی ___ شاعر کی خوابی محبوبہ۔ آدھی عورت اور آدھی ناقابلِ حصول حل پری!

"سوبرز" کے علاوہ ہم اکثر ندیم سے اس کے ہوسٹل کے کمرے میں ملتے۔ ندیم سینئر سٹوڈنٹ اور قابل ہونے کی وجہ سے ہوسٹل کا مانیٹر تھا۔ اور اُوپر کی منزل پر ایک (ATTIC) میں رہتا تھا جو مانیٹروں کے لیے مخصوص تھی۔ کھڑکی میں سے ٹینس کورٹ اور کالج کے سبزلان نظر آتے تھے۔ اور کالج کی تعزیے جیسے گول گنبدوں اور کنگریوں والی سُرخ عمارت بھی۔ ندیم (وہ ان دنوں پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی تھا) دوسرے

تیسرے روز ہمیں ایک نئی خوبصورت نظم پڑھ کر سناتا۔ ان میں سے بعض نظمیں اس نے بعد میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام "جلال و جمال" میں چھاپیں۔ اِن نظموں کی سادگی اور پرکاری سے متاثر نہ ہونے کا سوال نہ تھا۔ اُس گہرے گونجتے ہوئے لہجے میں اس کی نظمیں سُن کر ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ شخص "جینئس" ہے۔ قدرت کا وہ حسین اور ناقابلِ فہم (PHENOMENON) جسے پیدائشی شاعر کہتے ہیں۔ اور یہ کہ ایک دن وہ شہرت کی چوٹی پر بیٹھے گا اور ہم سب اِس بات پر مغرور ہوں گے کہ ہم اسے جانتے تھے۔ اِس کی اس وقت کی نظموں میں ایک دیہاتی (BARD) کے گیتوں کا فطری بہاؤ تھا۔ جو سب سچی اور بڑی شاعری کا خاصہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ندیم کبھی سکول میں نہ پڑھ سکتا، یا کالج میں تعلیم نہ پا سکتا (یہ محض اتفاق تھا کہ وہ کالج میں تعلیم پا سکا) تو وہ پھر بھی شاعر ہوتا۔ اور اپنے دیس کی پہاڑیوں، ندیوں اور جیالے چرواہوں اور معصوم غزالی صورت حسینوں کے دبے ہوئے ارمانوں کے گیت گاتا۔ یہی اس کی قسمت تھی اور یہی دیوتاؤں کا مقصد تھا کہ وہ بنے۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اُردو میں اس وقت کئی ایک ایسے شاعر ہیں جو اس لئے شاعر ہیں کہ انہوں نے آدھی رات کے چراغوں میں جان ماری ہے اور بھاری بھرکم اور پُرشکوہ الفاظ کی لغت ان کے دماغ اور ان کی تحویل میں ہے۔ وہ ان الفاظ کو ترتیب اور اہتمام سے شعر کی شکل میں بٹھا سکتے ہیں۔ ان الفاظ کی بندش کا اگر کچھ سوچ بچار کیا جائے تو مطلب بھی ضرور ہوتا ہے۔ مگر شاعری کی روح مفقود ہوتی ہے۔ اور خود مطلب CRUDE اور BANAL ہوتا ہے۔ ندیم کی شاعری پر اس موقع میں تنقید کرنا اور اظہارِ خیال کرنا میرا

مقصد نہیں۔ نہ ہی یہ تنقید کا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی اس کی نظموں نے ہمیں بہت گہرائی تک متاثر کیا تھا!

ان دنوں کا احمد شاہ ایک چوڑے ہاتھ پاؤں کا کسرتی بدن والا نوجوان تھا، اور اس میں اپنے جنم دیس کی سنگلاخ پہاڑیوں کی سی سختی تھی۔ وہ ایک فرسٹ کلاس والی بال پلیئر تھا (اس کی صحت اب بھی زندگی کے کڑے، حوصلہ شکن مصائب، دن رات کی ان تھک محنت اور متواتر سگرٹ پھونکنے کے باوجود حیران کن حد تک اچھی ہے) اس کی باتیں تب بھی شگفتہ اور نرم ہوتی تھیں۔ اگرچہ آدمی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس شگفتگی کے پیچھے دل کے پھپھولے جلے پڑتے ہیں۔ اس کی میٹھی اور دھیمی ہنسی جو کبھی بے پروا قہقہہ نہ بنتی تھی، آنسوؤں سے زیادہ دور نہ تھی۔ وہ اکثر تنہا اور دکھی کھویا کھویا سا نظر آتا۔ پُر یاس آنکھیں دور افق میں کچھ ڈھونڈتی رہتیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ندیم زندگی کے الم و حزن سے کم عمری ہی دوچار ہو گیا۔ ہم میں سے بیشتر کو صدمے اور غم اٹھانے پڑتے ہیں لیکن جواں سالی کے زمانے میں نہیں۔ اور ندیم جیسے بے حد حساس اور جذباتی نوجوان پر اس کے بچپن اور لڑکپن کے ان واقعات نے گہرے گھاؤ چھوڑے تھے۔ اس نے ایک دن اس "ایٹک" میں مجھے اپنی پہلی زندگی کے واقعات سنائے۔ جب اس نے ختم کیا تو آنسو اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے دمک رہے تھے اور اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے ان خاندانی حالات کو اجمالاً "جلال و جمال" کے دیباچے میں لکھ دیا ہے۔ لیکن اس نے بعض وجوہ کی بنا پر اس کہانی میں رنگ بھرنے سے احتراز کیا ہے۔ اس کی اس لکھی ہوئی روداد میں

اس روح کو پیس دینے والی غربت اور فاقہ کشی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جس کا اس کنبے کے بچپن کے گھر میں راج تھا۔ ندیم کا باپ تنک مزاج خوددار اور غیر دنیادار، اصل معنی میں ایک فقیر تھا۔ گھرانے کے قبضے میں چند ایک ایکڑ زمین تھی جس سے کھانے کے لیے اناج اور تھوڑی بہت نقد رقم آ جاتی تھی۔ ندیم کا باپ اپنی عسرت کی زندگی پر صابر و شاکر تھا اور اگر کوئی اس کو اس کی مجذوبانہ زندگی چھوڑنے کا مشورہ دیتا تو وہ بہت برا مانتا۔

ندیم کو اپنے والد ایک بوڑھے برف جیسی سفید داڑھی والے بزرگ کی حیثیت سے یاد ہیں، جو ہمیشہ مصلّے پر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ دنیاداری کے معاملات میں اتنے معصوم جتنا ایک بچہ۔ اور گھر کی ضروریات کے متعلق قطعاً بیگانہ! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بیحد مفلس تھے۔ اور اکثر ان پر فاقوں کی نوبت بھی آ جاتی۔ ندیم کی ماں بیچاری کڑھتی اور اپنی جان مار کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتی۔ ندیم کے والد کے کردار کا ایک اور رُخ بھی تھا۔ اس کے باوجود کہ ان کے نزدیک روپے کی نہ قدر تھی، نہ محبت، انہیں کیمیا گری کا خبط تھا۔ مگر ہر تجربے میں کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی۔

اِس ناکامی پر ان کے چہرے پر ذرا بھی ملال و رنج کے آثار نمودار نہ ہوتے، اور وہ پھر اس اگیا بیتال (Will o' the wisp) کے تعاقب میں مگن ہو جاتے جسے وہ کبھی نہ پا سکے۔ میرے خیال میں ان کے لاشعور میں ان کا احساسِ فرض انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ آخر وہ ایک بیوی کے شوہر اور تین بچوں کے باپ تھے اور جانتے تھے کہ خدا کے بعد وُہی ان کا سہارا ہیں۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ ان کی مجذوبانہ زندگی اور ان کی کیمیا گری کے

درمیان کوئی تضاد نہ تھا۔ زندگی کے حقائق ان کے عالم جذب میں بھی اپنی اہمیت منوا رہے تھے۔

ندیم نے اپنے خاندان کے جو واقعات مجھے سنائے، ان میں سب سے نمایاں عنصر ایک ہی خاندان کے مختلف گھروں کے درمیان طبقاتی بُعد تھا۔ جو ایک سٹیونسونین (STEVENSONIAN) ناول کے لیئے مناسب تھیم تھی۔ اس نے میرے تخیل کو بھڑکایا۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے ندیم کی بتائی ہوئی کہانی کے کچھ حصّے کو ایک ناولٹ کی شکل میں لکھا جس میں بیشتر سینری اور گفتگو بالکل تخیلی تھی۔ جب مَیں نے ندیم کو یہ کہانی کالج کے لان میں پڑھ کر سنائی تو اس نے کہا کہ یہ اپنے مین پوائنٹ میں سچی ہے، لیکن تفصیلات میں نہیں۔

ندیم آٹھ برس کا تھا جب اس کے والد کا اِنتقال ہوا۔ اِن کی موت اِس کی زندگی میں پہلا خوفناک المیہ تھا جس کا اثر دیر تک رہا۔ کیسے اس کے چچا نے اسے اپنے ہاں بُلا لیا کیسے اسے اس نے بہاولپور کالج میں داخلہ لیا۔ کیسے اس کا یہ طالب علمی کا زمانہ گذرا۔ یہ مجھے یہاں پر دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے پوری کہانی "جلال و جمال" کے دیباچے میں اپنے دلکش انداز میں قلم بند کر دی ہے۔

ندیم اور مَیں نے کالج کے ایک ڈرامے میں بھی حصّہ لیا تھا۔ مَیں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ پر کتیوں سے زیادہ ہنس سکتے ہیں۔ لیکن جب بھی مَیں اس ڈرامے میں اپنی "ڈسگریس" کا خیال کرتا ہوں تو میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور خون میری رگوں میں برف ہو جاتا ہے۔ یہ آغا حشر کے مشہور ڈرامے "رستم و سہراب" کا ایک حصّہ تھا — جو

"نیرنگِ خیال" میں "عشق و فرض" کے عنوان سے چھپا۔ ہم اس وقت اسے شاہکار سمجھتے تھے۔ اگرچہ اب میری رائے اس کے متعلق مختلف ہے اور آغا حشر کو اُردو ادب میں جو اونچا مقام دیا جاتا ہے اسے میں نہیں سمجھ سکا۔ ندیم نے اِس ڈرامے میں ہیرو (سُہراب) کا کردار ادا کیا۔ اور اس نے اسے نہایت خوبی سے نبھایا۔ اس کی آواز میں قدرتی گونج ہے۔ اور دائیں گال کے نیچے چاقو کے نشان سے اس کے جنگجو ہونے کا جھوٹا تاثر ہوتا ہے۔ میں غالباً ایرانی سرداروں ہومان اور بارمان میں سے ایک تھا جو رات کو قیدیوں کے پنجرے کے سامنے گشت لگا کر پہرہ دیتے ہیں۔ اس ڈرامے کو بڑی شدومد سے ریہرسل کیا گیا۔ میں ایک شرمیلا اور (BASHFUL) لڑکا تھا اور ڈراموں میں حصہ لینے کے لئے قطعاً ناموزوں! ڈرامے کا ڈائرکیٹر میری ادائیگی سے آخر دم تک غیر مطمئن تھا۔ ڈرامہ بڑے کرّوفر سے شہر کے واحد سینما ہال میں سٹیج ہوا۔ مجمع بہت بڑا تھا اور بہاول پور کے سب افسر اور معزّزین مدعو کئے گئے تھے۔ ندیم نے اپنا رول بڑی خوش اسلوبی اور لیاقت سے نبھایا۔ میرا ایکٹ ایک قطعی (FIASCO) تھا۔ پہرہ دیتے وقت میرے قدم بالکل اکھڑ گئے اور میں "رائٹ اباوٹ ٹرن" اچھی طرح نہ کر سکا۔ سارا ہال قہقہوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ اور میں نے کئی ایک آوازے بھی سُنے۔ اس ڈرامے کے بعد میں ایک عرصے تک شہر میں آنکھ اُٹھا کر نہ چل سکا۔ واحد شخص جو مجھ پر نہ ہنسا، ندیم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو بیوقوف بنایا ہے۔ اس نے کبھی اس کا ذکر نہ کیا۔

مجھے یاد نہیں کہ کالج میں اس نے کبھی انگریزی لباس پہنا ہو۔ وہ ہمیشہ اپنے دیس کا پُررنگ

لباس پہنتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک بانکی گڑوی پہنتا تھا۔ جو صرف اس پر خوب سجتی تھی۔ جوں جوں اس کا بی اے کا امتحان قریب آنے لگا۔ اس کے کالج کو الوداع کہنے کے دن نزدیک آنے لگے، وہ کھویا کھویا اور اداس رہنے لگا۔ وہ اس خوبصورت آزاد زندگی کو کھونے پر غمزدہ تھا۔ جہاں اس نے اتنی گہری جذباتی دوستیاں بنائی تھیں۔ باہر کی جدوجہد اور بیکاری کی بھیانک دُنیا اسے کھانے کو آتی تھی اور وہ تن تنہا اور بے یار و مددگار اس میں تھپیڑے کھانے کا حوصلہ اپنے میں نہ پاتا تھا۔

اُن دِنوں کا ایک سین مجھے یاد ہے۔ شام کے وقت ہم چند دوست بنچوں پر کالج لان میں بیٹھے ہیں۔ ندیم بھی وہاں ایک کونے میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ وہ بے حد اداس اور کھویا ہوا ہے۔ اور ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ اتنا اُداس کیوں ہے۔ وہ جواب نہیں دیتا۔ جو اس کی عادت کے خلاف ہے۔ خالی آنکھوں میں آنسوؤں کا اشارہ لیئے وہ کالج کی عمارت کے گنبدوں اور میناروں پر نظر دوڑاتا ہے اور آہ بھرتا ہے!

امتحان کے بعد ندیم اپنے وطن انگہ چلا گیا۔ اس نے مجھے سخت مایوسی کے خط لکھے۔ اس نے مجھے اپنی ماں کی بابت لکھا جسے وہ سب چیزوں سے زیادہ چاہتا تھا اور مقدس سمجھتا تھا۔ اس نے لکھا کہ اس نے اپنی ماں کو میرے متعلق بتایا ہے اور وہ مجھے دُعائیں دیتی ہے نتیجے کے دِنوں میں وہ دس پندرہ روز کے لئے اپنے ایک اور چہیتے دوست کے پاس ٹھہرنے کے لیئے آیا۔ ہم شام کو ملتے۔ لمبی سیروں پر جاتے، ایک خزاں رسیدہ باغیچے

میں بنچ پر بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ ایک بار اسی بنچ پر میں نے ندیم کو ایک کہانی لکھتے دیکھا۔ اس نے اسے فخر سے پڑھ کر سنایا۔ اس کا عنوان بھی عجیب طور پر میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔ اس کا نام "کالا کوٹ" تھا۔ لیکن اس کا پلاٹ یا موضوع کیا تھا۔ اس کے بارے میں میرا حافظہ کچھ یاوری نہیں کرتا۔ کہانی مجھے پسند آئی اور میں ندیم کے کہانی لکھنے پر بڑا خوش تھا۔ ہم اس وقت یہ نہیں جانتے تھے مگر یہ ندیم کی زندگی میں ایک نئی روش کی ابتدا تھی۔ ایک فیصلہ کن لمحہ! اس کے بعد اسے کئی کہانیاں لکھنا تھیں، جن میں سے بعض اس وقت اپنی تکنیک کی استادی، گہرائی اور اسلوب کے اچھوتے پن کے لحاظ سے ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ اور یہ اس امر کے باوجود کہ افسانہ نگاری اس کا اصل GENRE نہیں۔ وہ سب سے پہلے ایک شاعر ہے۔ مختصر افسانہ نگاری اس نے بطورِ فن کے، خون اور پسینہ بہا کر حاصل کی ہے۔ اور اب وہ غالباً اردو کا واحد بڑا شاعر ہے جو بڑی کہانیاں بھی لکھتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے ایک اچھے مختصر افسانہ نگار کی حیثیت ہی سے جانتے ہیں اور بعض کو یہی معلوم نہیں کہ یہ شاعر کہانیاں بھی لکھتا ہے ——— ندیم چلا گیا، مگر یہ پندرہ روز ہم نے فی الواقع اکٹھے گذارے۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو بہت کچھ دیا۔ مجھے صحیح معنی میں احساس ہوا کہ میرا دوست بے حد تنہا اور یاس زدہ ہے۔ میرا دل اس کے لئے بھر آیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک مستقل اور لمبی خط و کتابت ہمارے درمیان شروع ہوئی۔ اس کے خط کئی کئی صفحوں کے ہوتے تھے اور ہمیشہ جذباتی! میرے خط اس کے

خطوں سے بھی ملیے ہوتے تھے۔ کاش میں ان خطوں کو سنبھال کر رکھتا۔ کیونکہ وہ بیس سالہ ندیم کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے۔ میرے خط اس نے کافی سال محفوظ رکھے اور جب اس کی پہلی کتاب "چوپال" دارالاشاعت پنجاب سے چھپی تو اس کے انتساب میں، جو میرے نام تھا، اس نے ان خطوں سے کئی ٹکڑے لیکر درج کر دیئے۔ میں اپنے نام کو اس طرح چھپا ہُوا دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اور ہمیشہ میں نے "چوپال" کو اپنی کتاب سمجھا ہے، جسے میرے دوست نے میرے لئے لکھا تھا۔ میں اس کے متعلق دوست کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، مگر میں یہ بتادوں کہ ان دنوں ندیم کو دوست کے لفظ سے بڑی چڑ تھی۔ جب میں نے ایک بار اسے اپنے خط میں "پیارے دوست" سے خطاب کیا تو وہ تقریباً غصے سے بھڑک اٹھا۔ اس نے مجھے لکھا کہ وہ اس لفظ سے نفرت کرتا ہے۔ میں اسے بھائی لکھا کروں۔ وہ مجھے اپنا دوست نہیں بلکہ اپنا عزیز بھائی سمجھتا ہے۔ اس نے لکھا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر میں نے کیسے اس کو دوست سے خطاب کیا۔ اس قسم کی خط وکتابت کوئی دو سال تک رہی، اور پھر یہ تقریباً بند ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ خط وکتابت کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ جب آدمی چالیس سے تجاوز کر جاتا ہے تو ایک تو زندگی کی جولانی اور تازگی نہیں رہتی۔ دوسرے خط لکھنا دوسری کئی باتوں کی طرح بڑا اُکتا دینے والا مشغلہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ سال ندیم کے لئے سخت جدّوجہد اور المناکی کے تھے۔ ان کی پُوری کہانی یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے "جلال و جمال" کے دیباچے میں یہ ساری کہانی اپنے

ناقابلِ تقلید انداز میں بتادی ہے۔ کیسے وہ ڈگری کا پروانہ ہاتھ میں لیئے، اور خاندانی سندوں کا پلندہ باندھے سرکاری نوکری کے لیئے دربدر پھرتا رہا۔ کیسے اس نے پچاس روپے کے عوض ایک مشہور ہندو بزرگ کے لیے سندل کے نثر پر ایک کتاب لکھی جو اسی ہندو بزرگ کے نام سے شائع ہوئی۔ کیسے اسے مغرور آدمیوں کی تحقیر اور اپنے عزیزوں کی ہنسی سہنی پڑی —— اپنی ان ساری تلخ کامیوں کی داستان ہمیں بتاتی ہے۔ وہ محرر بھی رہا۔ چار پانچ دن اس نے ٹیلیفون آپریٹری بھی کی اور دو تین سال یہ اردو کا جان کیٹس (JOHN Keats) آبکاری کے محکمہ میں سب انسپکٹر بھی رہا۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ اکثر لاہور میں رہا۔ اس کی رہائش ایک گھُپ اندھیری کوٹھڑی میں تھی۔ اور کئی کئی دن اس نے فاقے کاٹے۔ لاہور میں وہ اختر شیرانی اور عبدالمجید سالک سے مِلا جنہوں نے اس نوعمر شاعر کے جوہر اور اس کی صلاحیتوں کو پہچانا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسے وہ سب مکمل اور محبوب انسان لگے۔ ندیم حد درجہ مخلص ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو بت پرستی کی حد تک پوجنے لگتا اور آسانی سے متاثر ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں شدید جذباتی دوستیاں بنانے کی کوشش کی ہے — سخت اور کڑے اگرچہ یہ سال تھے، مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں بہت سے نوجوانوں کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ندیم ایک بے حد حساس دل شاعر تھا اور وہ دوسروں سے زیادہ قسمت کے دھچکوں اور ناوکوں سے زخم خوردہ ہوا۔ اس وقت ندیم کرب و اندوہ اور تنہائی کا پیکر تھا۔ اور زندگی کی آگ میں بے سپر سفر کرتا تھا۔ اس کا واحد سہارا

اس کے دوست تھے۔ اختر اور سالک جیسے لوگ جن میں وہ اپنی المناک تنہائی کا مداوا ڈھونڈتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی یہ الوہی شکست خوردگی ایک مردانہ الجھن تمدن میں رہنے کا نتیجہ تھی۔ اور اس کے علاج کے لئے ایک اچھی خیال رکھنے والی عورت اپنی محبت اور اپنی تھپکیوں سے بڑی حد تک دور کر دیتی۔ مگر شاید یہ ہماری خوش بختی تھی کہ اسے ایک مدت تک اپنی ہی تپش میں جلنا پڑا اور عورت اس کے لئے ایک حسین سپنا ہی رہی —— اپنی جسمانی خصوصیات کے بغیر، ایک معصوم پاک اور لطیف مخلوق جو جسمانی حاجات اور حیاتی تقاضوں سے بے نیاز تھی اگر اسے اپنی محبوبہ اس وقت گوشت پوست میں مل جاتی تو ممکن ہے وہ شکیل اور شانت دل ہو جاتا۔ لیکن تب شاید اردو ادب میں وہ اچھوتی سبحری اور پر درد نظمیں کبھی نہ لکھی جاتیں جنہیں پڑھتے ہوئے ہم نہیں تھکتے اور جن کا جادو کبھی نہیں مٹتا۔ خوبصورتی ہمیشہ کرب و اذیت سے پیدا ہوتی ہے۔ جان کیٹس کو اپنی فینی براؤن مرتے دم تک نہ ملی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ اسے سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو جب بھی وہ اپنی بڑی (ODES) اور "لا بیلے ڈیم سانس مرسی" جیسی نظمیں لکھ سکتا! کیٹس کو اپنی فینی مل جاتی (جو بعد میں سب عورتوں کی طرح ایک عام عملی اور دنیادار اور سطحی عورت نکلی جس نے ایک پن چکی چلانے والے سے کامیاب شادی کی، اور آٹھ بچے پیدا کئے) مگر دنیا "اوڈ ٹو نائیٹنگیل" کے بغیر غریب رہ جاتی۔

۱۹۲۹ء میں ندیم کو رشتے کے ایک مشفق بھائی کے توسط سے محکمہ آبکاری میں جگہ ملی۔

اور اسے لاہور چھوڑنا پڑا! "رومان" میں اس کی نظموں اور کہانیوں نے اسے ادبی حلقوں میں کافی روشناس کرادیا تھا، کرشن چندر اور جوش ملیح آبادی سے اس کی خط وکتابت تھی۔ وہ تین سال تک محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر رہا۔ اور اگر وہ ٹکا رہتا تو اب کلاس ون افسر ہوتا۔ اس کے رفیقوں میں سے ایک اب ڈپٹی کمشنر اور ایک ایس پی ہے۔ لیکن تین سال ندیم کے سے آدمی کے لئے اس غلیظ ماحول میں کافی تھے۔ اور اپنے رشتہ داروں کی ناراضی اور مایوسی کا خیال نہ کرتے ہوئے اس نے ملازمت کے جوئے کو اتار پھینکا۔ اس نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ان تین برسوں کے عرصے میں "میرے شباب نے چند ٹھوکریں کھائیں۔ مگر میرے جنسی جذبات ژولیدہ نہ ہونے پائے" اس تحریری بیان سے (اگر یہ سچ ہے۔ ہمیں اس کی صداقت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) یہ واضح ہوتا ہے کہ ستائیس سال کی عمر تک احمد ندیم قاسمی سومرسٹ مام کی اصطلاح میں ایک "ورجن" آدمی رہا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اور اس وقت کی سوسائٹی میں، جس میں آدمی اور عورت ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے، اور جنس پر اتنے TABOO تھے، یہ کنوارپن کوئی غیر معمولی نہ تھا۔

جب ندیم نے یہ فقرہ لکھا ہوگا (میرا خیال ہے کافی سوچ بچار کے بعد!) تو اسے ایک دلیرانہ اور بے باک اعتراف لگا ہوگا۔ مگر اب ہم اس کے اعتراف کی اس معصومیت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے اس اقرار میں ایک ابوالکلامی بناوٹ اور رنگین بیانی ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ TABOO کے اثرات بہت گہرے ہیں جنس کے معاملے

میں ندیم ابھی تک کچھ کچھ PRUDE ہے۔ اور اس کا اخلاقی کوڈ "وکٹورین" ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ اب بھی جنسی فعل کو سات خوفناک گناہوں میں سے ایک سمجھتا ہے۔ ہمیں ڈی ایچ لارنس اور دوسرے ادیبوں کا شکر گذار ہونا چاہیے جنہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ فعل ایک خوبصورت اور عظیم فعل ہے، اور ہم کھلی ہوا میں سانس لینے لگے ہیں۔ ندیم سے باتیں کرتے ہوئے میں ایک بار حیران ہوا جب اس نے کہا کہ منٹو کی بعض کہانیاں ضرور فحش ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ان کو اس لئے فحش سمجھتا ہے کہ ان میں انسان کے ایک تنومند اور جبلی تعلقات کا ذکر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جنسی لذت کے لئے لکھی گئی تھیں۔ میں نے کہا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ وہ زندگی کی طرح حقیقی اور گرم ہیں۔ اگر جنس فحش ہے تو زندگی خود فحش ہے۔ میں نے کہا کہ منٹو کی کہانیوں میں سادے اور دیانتدارانہ جنس کی باس ہے۔ مجھے اسلامی تاریخی ناول جن میں گھٹے اور ڈھکے چھپے انداز میں دیندارانہ محبت کے نقشے پیش کئے جاتے ہیں صحیح معنوں میں فحش لگتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ندیم بھی ان ناولوں کو تیسرے درجے کا لٹریچر قرار دیتا ہے۔

جب آبکاری کی سب انسپکٹری سے اسے نجات ملی تو اس نے اپنی ڈائری میں لکھا "یہ میری زندگی کا زریں ترین دن ہے۔ آج میں احمد شاہ اکسائز انسپکٹر کی بجائے صرف احمد ندیم قاسمی ہوں۔ تجربات کا انبار سمیٹے میں اپنے ماضی کے کھنڈروں سے رخصت ہو رہا ہوں۔"

دنیا میں بعض ایسے لوگ ہیں جن کی آنکھیں دور اپنے افق پر لگی رہتی ہیں، اور جو کچھ

بھی وہ وقتی طور پر کرتے ہیں، ان کی آشاؤں کے شہر کے مینار کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے اور وہ اپنے "ال ڈوراڈو" کی سمت ایک مضبوط ارادے سے بڑھتے رہتے ہیں۔ ایسے آدمی، خواہ وہ بظاہر کیسے ہی نرم مزاج اور پاس رکھنے والے کیوں نہ ہوں۔ حقیقت میں بڑے ہٹیلے اور جری ہوتے ہیں۔ وہ فولاد کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، اور ایسے ہی آدمی اس زمین کا زیور ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ آرام اور عیش کی سرکاری ملازمت کو جس میں ترقی کے کافی امکانات تھے، آسانی سے نہ چھوڑ سکتا۔ بہت کم لوگ ایک دلدل سے نکلنے کی طاقت اور ہمت رکھتے ہیں۔ گیرٹ میں فاقہ زدہ شاعر کی زندگی اسے دفتر کی کرسی اور ملازم کو بلانے والی گھنٹی سے زیادہ عزیز، زیادہ حقیقی نظر آئی اور وہ ندیم جو اب لاہور میں ادب و شاعری کی دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے آیا، تین سال پہلے کا شکست خوردہ اور مایوس ندیم نہ تھا۔ جوانسالی کی تیرگی اور خود ترسی کی جگہ اب آگاہی اور بلند ولولے نے لے لی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اور اعتماد سے زندگی کے چمکیلے، پُرہجوم اور شوریدہ کوچوں میں قدم رکھا۔ اس کو "دارالاشاعت پنجاب" میں بحیثیت ایڈیٹر "تہذیبِ نسواں" اور "پھول" جگہ مل گئی۔ میرا خیال ہے سالک نے یہ ملازمت دلوانے میں اس کی مدد کی ہوگی۔ تنخواہ غالباً پچھتر روپے ماہوار تھی۔ دارالاشاعت پنجاب" والے پہلے ہی اس سے متعارف تھے۔ انہوں نے تین چار سال پہلے ندیم کی پہلی کتاب "چوپال" چھاپی تھی اور اسے شاید دو سو روپے معاوضہ دیا تھا (کاتب کو بھی غالباً اتنی ہی رقم ملی ہوگی!) انہیں اتنی تنخواہ پر اپنے رسالوں کے لئے ندیم سے بہتر آدمی کہاں

دستیاب ہو سکتا تھا۔

۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک وہ ترقی پسند رسالہ "ادبِ لطیف" کا مدیر بھی رہا۔ میں پہلی بار ادبِ لطیف" میں ہی چھپا۔ یہ ایک سفری ESSAY تھا "ڈیپلو سے نون کوٹ تک" (میں تب تھرپارکر کے ایک صحرائی قصبے ڈیپلو کے سکول میں انگلش ماسٹر تھا) ندیم نے اسے نوک پلک سے سنوارا، اور یہ مضمون ہم دونو کے مشترکہ ناموں سے شائع ہوا۔ اس کے تعارفی نوٹ میں ندیم نے لکھا کہ لکھنے والوں کی جذباتی ہم آہنگی کی وجہ سے مضمون مشترکہ ناموں سے چھاپا جا رہا ہے۔ اس دفعہ یہ تحریک میری طرف سے ہوئی کہ یہ مضمون ہم دونوں کے ناموں سے طبع ہو۔ اس سے پہلے ندیم نے مجھے کئی بار لکھا تھا کہ اس کی خواہش ہے کہ بعض یورپی زبانوں کے مصنفین کی طرح وہ بھی اپنی کہانیوں اور نثری تحریروں کو دونوں کے مشترکہ نام "احمد ندیم محمد خالد" سے چھپوائے۔ اور اس نے مجھ سے اس کی اجازت مانگی۔ میں نے اس سے اتفاق نہ کیا (اور میرے انکار نے اسے شاید کچھ رنجیدہ خاطر بھی کر دیا) مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اس کے شہرت یافتہ نام پہ TRADE نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان تخلیقات کا جن کے لکھنے میں میرا کچھ ہاتھ نہیں تھا CREDIT لینا مجھے اوچھی سی بات لگی۔ اور پھر پڑھنے والے بیوقوف نہیں ہوتے۔ ندیم کا اصرار اس کے شدید احساسِ تنہائی کی بدولت تھا۔ وہ خود کو ایک دوسرے انسان کی ذات کے ساتھ مکمل طور پہ IDENTIFY کرنا چاہتا تھا۔ اس کے شدید اخلاص کی مجھے قدر تھی لیکن میں ندیم کے نام کے ساتھ اپنے نام کا دم چھلا لگا کر شہرت کی چوٹی پہ نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اور پھر ادبی

شراکتیں بہت سی دوستیوں کی قبر ثابت ہوتی ہیں۔

یہ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ میرے ایک دوست شفیق الرحمٰن نے اسے اپنے ایک مزاحیہ مضمون میں 'رکیٹ' کہا ہے۔ اس تحریک کی ابتدا کہانی اور نظم میں نئے تجربوں سے بڑے اُمید افزا طور سے ہوئی۔ "لحاف" جیسی کہانیوں نے (اور اس کے بعد ہر ایک نے ایسی کہانیاں لکھنی شروع کر دیں) پڑھنے والوں کو چونکا دیا، اور انہیں اپنی اخلاقی تنگ خیالی سے جھنجوڑا۔ اس کا اثر صحتمندانہ تھا۔ کیونکہ اپنے جنس کے قدرے مریضانہ اور لذتیت میں سرشار تخیل کے باوجود یہ کہانیاں جنس کو مذہبی اور سماجی ریاکاری کی دبیز تہوں سے نکال کر باہر کھُلی ہوا میں لے آئیں۔ بعض لوگوں نے اسے فحش ادب کہا۔ ان کے نزدیک غالباً اپنی بیوی کی ہمراہی بھی فحش تھی۔ نظم میں بھی ن۔م راشد اور دوسرے ہیئت کی تبدیلی لے آئے۔ اور فوراً ہی ہر کوئی معرّیٰ نظمیں لکھ رہا تھا۔ اس وقت کی بیشتر شاعری مر چکی ہے کیونکہ یہ تیسرے درجے کی شاعری تھی، اور زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اِن دنوں کوئی ن۔م راشد یا اس کے پیروکاروں کے شعراء میں ذکر نہیں کرتا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلا اور جلد ہی ترقی پسند ادب جنسیاتی سے مارکسی ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تغیّر کیسے ہوا اور کس نے ڈور کھینچی۔ لیکن ایک اچھی صبح ہم جاگے تو ہمیں بتایا گیا کہ پہلے 'ترقی پسند' دراصل 'رجعت پسند' تھے اور ترقی پسند ادب وہ ہے جس میں 'سماجی شعور' ہو۔ ادب میں اب میکانیکیت ازم کا دور دَور ہونے لگا۔ کہانیاں ایک خاص نظریے کے تحت لکھی جانے لگیں۔ میں مارکسزم کے خلاف

نہیں ہوں (جو ایک انصاف پر مبنی معاشی نظام ہے) مگر مارکسی ادب کے خلاف ضرور ہوں۔ اسی طرح میں مسیحی ادب، اسلامی ادب اور دھارمک ادب کے خلاف ہوں۔ سیاست یا تبلیغ کو ادب سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ "مہالکشمی کا پل" کرشن چندر کا ایک اچھا افسانہ ہے مگر جب اس کے خاتمے پر مصنف پڑھنے والے سے سوال کرتا ہے کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟ تو اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ افسانے کا سارا تاثر غائب ہو جاتا ہے۔ اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایک افسانہ نہیں بلکہ ایک بہتر لکھا ہوا مارکسی پمفلٹ پڑھا ہے۔ نئے ترقی پسند ادیب ایک دوسرے کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے تھے۔ اور جو کوئی بھی اس مارکسی شعور سے ہٹ کر لکھتا تھا، رجعت پسند کے لقب سے نوازا جاتا تھا۔ اور اسے خوب بے بھاؤ کی پڑتی تھیں۔ اسی طرح نظم میں سرخ سویرا اور عظیم سٹالن (جسے اب عظیم کروشیف نے لینن کے روضے سے اٹھوا کر ایک اور قبرستان میں منتقل کرا دیا تھا) مستقل موضوع بن گئے۔ وہ شاعر، جو یہ مصنوعی میکانکی، بے روح نظمیں لکھتے تھے دنوں میں عظیم شاعر بن گئے۔ اور ان کی فنی خوبیوں پر اتنی تنقیدیں لکھی گئیں کہ آخر میں لوگوں نے ان کو پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک تحریک کے ضوابط کے تحت لکھا جانے والا خاص قسم کا "ترقی پسند ادب" اب مر گیا ہے۔ زندہ وہی رہے جن کے ہاں شاعرانہ خلوص تھا۔ ندیم نے بھی خود کو اس تحریک سے منسلک کیا مگر اس لیے کہ وہ انسانیت پرست تھا اور ایماندارانہ طور سے سوچتا تھا کہ یہ ادبی تحریک عوام میں ایک وسیع بیداری لے آئے گی۔ یہ شکر کا مقام

ہے کہ اس نے اپنے نئے عقیدے، اور اپنے فن کے درمیان ہمیشہ ایک حدِ فاصل رکھی اور جو ایک دو مارکسی نظمیں بھی اس نے کہی ہیں وہ بھی اپنے الفاظ کے ترنّم اور گرمیِ احساس کی وجہ سے زندہ رہنے کے لائق ہیں۔ "چلی مشین چلی" ایسی ہی ایک نظم ہے۔ جسے اس نے اپنے کسی مجموعے میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کونسے محرکات تھے جنہوں نے ندیم کو اس تحریک میں شامل ہونے پر تیار کیا۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ تخلیقی فن کاروں کو جماعت بندی سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے جب ایک لکھنے والے کو ایک خاص نظریئے یا مقصد کے تحت لکھنا پڑتا ہے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اچھی اور سچی تخلیق کے لیئے ضروری ہے کہ لکھنے والے کو اپنے دل کی بات کھُل کر کہنے کی آزادی ہو۔ خواہ وہ بات مرّوجہ اخلاقی قدروں کے مطابق پوچ یا لغو یا فحش ہی کیوں نہ ہو۔ ایک جنونی۔ خواہ وہ مذہبی جنونی ہو یا مارکسی جنونی، سچا ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ ندیم کو اب بھی دعویٰ ہے کہ وہ ترقی پسند شاعر اور ادیب ہے مگر اس کا شعر و ادب اب تک پوری شان سے زندہ ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی ترقی پسندی سیاسی نہیں، جذباتی اور مخلصانہ ہے۔

میں انگلستان میں تھا جب "جلال و جمال" چھپی۔ اس میں ندیم کی چند ایک وہ نظمیں بھی ہیں جنہیں ہم کالج کے زمانے میں اس سے سُنا کرتے تھے: "آخری سجدہ"، "جرولہ" اور چند ایک اور ہمارے ادب کی لازوال چیزوں میں سے ہیں۔ "جلال و جمال" حد درجہ "غیر ترقی پسند" ہے۔ جب میں انگلستان میں تھا تو ندیم نے مجھے لکھا کہ میں اس کی کہانیوں کا

گریزی میں ترجمہ کروں ۔ اس نے مجھے "بگولے" کی ایک جلد بھجوائی ۔ میں ان دنوں ذہنی
نفسیاتی طور پر دیوانگی کی سرحد پر منڈلا رہا تھا اس کے باوجود میں نے ایک کہانی کو انگریزی
ں ڈھالنے کی ایماندارانہ کوشش کی، لیکن جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ میرے بس کا روگ
نہیں ۔ اگر ندیم نے اس کو محسوس کیا تو اس نے فوراً مجھے معاف کر دیا ۔ تقسیم اور فسادات
کے دنوں میں وہ ایک سخت ذہنی اذیت میں سے گذرا ۔ اس نے اپنے کئی پیارے
دوستوں کو کھو دیا جن کی وجہ سے زندگی میں رنگ اور چاشنی تھی ۔ ایسے حساس دل پر اس
وحشیانہ طوفان کا جو اثر ہوا ہوگا وہ بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اب وہ عمر اور شعور میں
پختہ ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ گو زندگی شدید کرب و اندوہ سے پُر ہے، پھر بھی زندہ رہنا
اور اُمید سے مسلح ہو کر جدوجہد کرنا ہر انسان کا فرض ہے ۔ اپنے دوستوں سے جو اس پار
چلے گئے ۔ اس کے تعلقات اسی طرح گہرے رہے ۔ اور اب تک بھی وہ ان کو باقاعدہ
لکھتا رہتا ہے ۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۶۲ء تک کی مدت میں ہم بہت ہی کم ایک
دوسرے سے ملے ۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس بار ! ہمارے درمیان خط و کتابت
تقریباً بند ہو گئی ۔ ہمیں دراصل اطمینان تھا کہ ہماری دوستی کا رشتہ اتنا مضبوط ہے
کہ اگر ہم برسوں نہ ملیں اور مہینوں ایک دوسرے کی خبر نہ لیں ۔ پھر بھی اس میں فرق
نہیں پڑ سکتا ۔ یہ سال اس کے لئے مسرت و کامرانی کے تھے ۔ اور سخت بدنصیبی کے بھی !
ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور جنہیں اُردو ادب کی برانٹی بہنیں
کہنا چاہیئے ہجرت کر کے اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ لاہور آئیں اور نسبت روڈ کے

ایک متروکہ مکان میں رہنے لگیں۔ ندیم ان دنوں پشاور میں تھا۔ ان کی آمد کا سنا تو یہ محسوس کرکے کہ پورے پاکستان میں وہی ان کا سہارا ہے' وہ ۱۹۴۸ء کے شروع میں ریڈیو کی ملازمت ترک کرکے لاہور آ گیا۔ دونوں ذہین، قابل اور سلجھی ہوئی لڑکیوں کی بہنوں کی سی چاہت نے اس کی زندگی میں رونق سی پیدا کردی ——— تین ادبی جینئس اب ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوگئے تھے۔

انہی دنوں شاید جولائی ۱۹۴۸ء میں ندیم کی شادی گاؤں میں اپنے عزیزوں کے ہاں ہوگئی اور اب ندیم تین خوبصورت بچوں کا باپ ہے۔ اب ندیم کی زندگی ذہنی طور پہ زیادہ اطمینان بخش اور بارآور ہوگئی، گو اس کے مالی تفکرات میں کوئی کمی نہ آئی۔ وجہ یہ تھی کہ ندیم کتابیں لکھ کر اپنی روٹی کمانا چاہتا تھا۔ اور اس ملک میں یہ ممکن نہیں۔ ایک آدمی ایک ناچنے والے ریچھ کے ساتھ سڑک پر ایک لکھنے والے سے زیادہ کما سکتا ہے۔ ہمارے سب سے مشہور مصنفوں سے پوچھو کہ ان کو ان کی کتابوں نے کیا کچھ دیا ہے۔ تم حیران ہوگے کہ ان کی اوسط آمدنی بائیس تئیس روپے ماہوار بھی نہ رہی ہوگی (میں اُن کا ذکر نہیں کررہا جو اسلامی تاریخی ناول یا ہوشربا جاسوسی سیریز لکھتے ہیں)۔

ندیم اور ہاجرہ رسالہ "نقوش" کے ابتدائی دور کے مدیر رہے۔ ایک آدھ سال اس نے بحیثیت پبلشر بھی کام کیا۔ اور اس کے "فسانہ خواں" نے خود اس کے اور ہاجرہ کے افسانوں کے مجموعے شائع کیے۔ ندیم ہی کی سرپرستی میں دونوں بہنوں کی شادی ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ایک کی ندیم کے بھانجے ظہیر بابر کے ساتھ جو اس وقت "امروز" کا سب ایڈیٹر تھا۔

اور آج کل ایڈیٹر بنے اور دوسری کی احمد علی خاں کے ساتھ جو اس وقت پاکستان ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ بعد میں ایڈیٹر بنے اور آج کل "ڈان" میں ہیں۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں اس نے 'پنج دریا' کے نام سے اپنا مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اور پھر اپریل ۱۹۵۳ء میں 'امروز' کی ادارت اس کے سپرد ہوئی جس سے وہ ۱۹۵۹ء میں مستعفی ہوا۔

مارشل لاء لگنے پر وہ دوسری بار جیل گیا۔ پہلی بار اُسے ۱۹۵۱ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے جیل ہوئی تھی ۔۔۔ اور اب کے وہ تین مہینے سرکار کا مہمان رہا (کسی بڑے افسر سے غلطی ہو چکی تھی) وہ اب بھی ان دنوں کے واقعات ہنسی اور خوش مزاجی سے دہراتا ہے۔

میں اب لاہور میں تبدیل ہو کر آیا ہوں اور ہر دوسرے تیسرے روز میں اپنے دوست کو 'فنون' کے دفتر میں ملنے جاتا ہوں۔ چھوٹا سا کمرہ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ہمیشہ لوگوں سے اور سگرٹ کے دھوئیں سے بھرا رہتا ہے (ندیم ایک چین سموکر ہے اور ہمیشہ اچھے برانڈ پیتا ہے) پچاس سالہ چشمہ لگائے من موہنا شخص مزاج کا کتنا ٹھنڈا اور شانت ہے۔ رواں باتوں اور انوکھے خیالوں سے معمور! اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے اس کا انداز خوش دلانہ اور گرمجوشی کا ہے۔ اور غریب سے غریب آدمی سے متواضع اور پُرشفقت بلکہ اس پر متنوع کیریرز کے آدمی (محرر۔ ٹیلیفون آپریٹر۔ اکسائز سب انسپکٹر۔ ریڈیو فیچر رائٹر۔ ایڈیٹر۔ پبلشر۔ افسانہ نگار۔ جیل برڈ) میں کتنی بے پایاں قوت

بھری ہوئی ہے ——— ناساعد اور کڑے حالات کے باوجود ہمیشہ مسکراتا ہوا۔ میں نے اسے کبھی غصے میں یا کسی کے خلاف کینے سے جلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک ساتھی ادیب نے جس کی اپنی تحریریں چھچھورپنے کی باتوں اور سستی پھبتیوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اپنے ماہنامے میں اس کی افسانہ نگاری اور فکاہیہ نویسی پر اوچھا حملہ کرنا مناسب سمجھا۔ یہ فی الواقع بڑا ہی اوچھا حملہ تھا۔ ندیم نے بڑے لطف سے اِن فقروں کو ہمیں پڑھ کر سنایا اور کہا کہ اسے حیرت ہے کہ صاحب موصوف نے اس کی شاعری کو معاف کر دیا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ "وہ اب اس کا جواب نہیں دے گا کیونکہ وہ صاحب اب واقعی ناراض ہو گئے ہیں۔ ایک شخص سے جو ناراض ہو گیا ہو نوک جھونک فضول ہے۔" اس کے ابرو پر ایک چین تک نہ تھی۔

اس نے حال ہی میں وہ خطوط اپنے ادارے "کتاب نما" سے شائع کئے ہیں، جو سعادت حسن منٹو نے اسے کئی سالوں کے عرصے میں لکھے تھے۔ وہ ہمیں ان دونوں آدمیوں کے متعلق بہت کچھ بتاتے ہیں۔ میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خطوط بعض جگہ مکتوب الیہ اور اس کی تخلیقات کے بارے میں تنقیص آمیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ندیم اگر چاہتا تو ان جملوں کو حذف کر جاتا۔ مگر اپنی ادبی دیانتداری کی بدولت اس نے انہیں جُوں کا توں چھاپ دیا۔ میں کئی اچھے لکھنے والوں کو جانتا ہوں جو ذرا سا اعتراض بھی برداشت نہیں کرتے۔ اور بچوں کی طرح شیخی خورے اور چڑچڑے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ندیم کی جگہ وہ ہوتے تو ایسے جملوں کو جن سے ان کی سبکی کا پہلو نکلتا، حذف کر دیتے۔

بلکہ ان کو ضمیر کی ہلکی سی چبھن کے بغیر اپنے حق میں بدل دیتے۔

ندیم نے ان خطوط کو جوں کا توں چھاپ کر ایسی دیانتداری اور شائستگی کا ثبوت دیا ہے جو کم از کم ہمارے ادیبوں میں ناپید ہے۔

وہ اپنے میز پر کام بھی کرتا جاتا ہے (تقریباً دو درجن خطوط۔ وز اس کے اپنے ہاتھ میں، پروف ریڈنگ، بک کیپنگ، پیکنگ وغیرہ وغیرہ) اور اپنے دوستوں کے ساتھ باتیں بھی! وہ تمہیں بتائے گا کہ اب اگر "فنون" اسے بند بھی کرنا پڑا تو وہ بیکار نہیں رہ سکتا کیونکہ اس نے اتنے سارے کام سیکھ لئے ہیں۔ اسے کم از کم اکاؤنٹنٹ کی ملازمت کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ اس کی باتیں ادبی لوگوں کی طرح محض کتابوں یا لکھنے والوں کے متعلق ہی نہیں ہوتیں۔ اگرچہ اس کے پاس اپنے مشہور ادبی دوستوں کی بوالعجبیوں اور (Eccentricities) کے قصوں کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ کیسے دلی میں آل انڈیا ریڈیو کی ایک بھری پری پارٹی میں سعادت حسن منٹو نے شرارتاً ایک مشہور شاعر کو چھیڑا اور اپنی عمر سے بڑے آدمی سے مغلظ گالیاں سنیں۔ (پطرس۔ حسرت اور دوسرے اس منظر کو دیکھتے ہوئے!) کیسے ایک مشہور شاعر ایک مشاعرے میں نشے میں اتنے دھت ہو گئے کہ جب انہیں سٹیج پر بلاوا آیا تو وہ ایک چوپائے کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے سٹیج پر پہنچے۔ کیسے ساحر لدھیانوی نے ملاں حسین حلوائی کی دکان پر اپنی کتاب کے پبلشر اور اس کے بیٹے کو ان کے اصرار پر ساڑھے چار روپے کا حلوہ کھلایا (یہ ساڑھے چار روپے ساحر نے آدھ گھنٹہ پہلے بڑی منت سماجت سے

اپنی کتاب کے عنوان کی ایک قسط کے طور پر اسی پبلشر سے وصول کیے تھے!
کیسے جوش ملیح آبادی کو بمبئی میں ایک (MAGNIFYING GLASS) کی ضرورت
پڑی اور وہ کئی ایک کانوں پر آئینہ مکبر الوجہ پوچھتے پھرے (آپ کے پاس آئینہ
مکبر الوجہ ہے ؟)

اس کی یہ ادبی یادیں ہمیشہ پُرلطف ہوتی ہیں۔ دوسری بھی کم دلچسپ اور انوکھی
نہیں ہوتیں۔ مثلاً اپنے خط سے فارغ ہو کر وہ یک لخت کہے گا کہ آج اس کے ساتھ
عجیب واقعہ پیش آیا جب وہ حبیب اشعر صاحب کا دیا ہوا چوڑی دار پاجامہ پہنے گلی
میں گذرا تو سب بچے اس کے پیچھے شور مچانے لگے۔ "ٹیڈی اوئے۔ ٹیڈی اوئے"
اسے جلدی سے تانگہ لیکر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور اس لیے اب وہ چوڑی دار
پاجامہ پہننے سے کتراتا ہے۔

ایسا میرا دوست ہے اور اس قسم کی اس کی باتیں! — میٹھی اور انوکھی،
اور پُرلطف اور معصوم، آدھ گھنٹہ، گھنٹہ یا دو گھنٹے بیٹھ کر میں تنگ سیڑھیاں اتر کر
نیچے سڑک کی روشن رونق میں آتا ہوں، تو اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچتا ہوں
کہ میں اس آدمی کو جان کر کتنا خوش قسمت ہوں — یہ آدمی جو اتنا متحمل، بامروت
خلیق، بہادر اور نیک ہے۔ اور جس نے ایسی کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں جو اس وقت تک
زندہ رہیں گی جب تک اُردو زبان زندہ ہے — کتنا خوش قسمت میں ہوں کہ میں اسے اپنا
دوست کہہ سکتا ہوں، زندگی اپنی مایوسیوں اور تیرگیوں کے باوجود (COMPENSATION) رکھتی ہے۔

میرزا ادیب

حکایت لود بے پایاں

آج کافی مدت گذر جانے کے بعد اپنے ماضی بعید میں جھانکتا ہوں۔ تو آنکھوں تلے جناب احمد ندیم قاسمی کی وہ تصویر ابھر آتی ہے جو بڑی ہی سادہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک دیہاتی نوجوان، سادہ طبیعت اور سادہ لباس، شلوار، کرتہ اور سر پہ کلاہ دار پگڑی۔ چہرے پر ایک بڑی ہی پیاری معصومیت۔ آنکھیں جھکی جھکی لہجہ بڑا دھیما دھیما۔ سر سے پاؤں تک سادگی ہی سادگی مگر نام میں سادگی نہیں تھی۔ بڑا بھاری بھرکم نام تھا۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی! یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا سے لاہور آتے تھے اور اپنے رشتے کے بھائی حضرت مولانا غلام مرشد کے مکان واقع شیش محل اندرون بھاٹی دروازہ لاہور میں آکر قیام پذیر ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ندیم صاحب بے تحاشا لکھتے تھے۔ اکثر وبیشتر رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات بالالتزام شائع ہوتی تھیں۔ کسی میں انکی نظم یا غزل ہوتی تھی۔ کسی میں افسانہ اور کسی میں دونوں چیزیں پہلو بہ پہلو نظر آجاتی تھیں۔ اب یہ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلے پہل انہیں کہاں دیکھا تھا۔ مگر ایک واقعہ اب تک بڑی اچھی طرح یاد ہے۔ ندیم صاحب کا آوازۂ شہرت افق تا افق

پھیلنے لگا تھا۔ رسالوں میں انکی چیزیں نظروں سے گزرتی تھیں تو جی چاہتا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جائے۔ موجودہ زمانے میں ادیب اور قاری کے درمیان وہ رشتہ کم و بیش ختم ہو چکا یا کم از کم بہت حد تک بدل چکا ہے جو اس عہد میں برقرار تھا۔ اس دور میں جب بھی کسی مصنّف کی کوئی تخلیق پسند آجاتی تھی تو لامحالہ اس سے عقیدت ہو جاتی تھی اور ذہن میں اس سے متعلق ایک ایسا ہیولیٰ اُبھر آتا تھا جو دیوتا کے روایتی تصوّر سے کچھ مختلف نہیں ہوتا تھا اور پھر احمد ندیم قاسمی تو پیرزادہ بھی تھے۔ انکی پیرزادگی نے اس ہیولے میں کئی چمکتے دمکتے گہرے رنگ بھر دیئے تھے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اس پیرزادہ احمد ندیم قاسمی سے ملوں جو اتنے خوبصورت شعر کہتا ہے جو اتنی پیاری پیاری دیہاتی کہانیاں لکھتا ہے۔ ان دنوں ندیم صاحب یا تو بہاولپور میں تعلیمی مراحل سے گذر چکے تھے یا اس کے آخری مدارج میں سے گزر رہے تھے۔ میں بھی افسانے لکھا کرتا تھا اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تک بندی بھی کر لیا کرتا تھا۔ اختر شیرانی مرحوم اس دور میں نوجوان نسل کے محبوب شاعر سمجھے جاتے تھے، اختر صاحب اسلامیہ کالج کے قریب فلیمنگ روڈ پر احاطہ فیروزدین میں ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں رہتے ہیں جس کمرے میں اختر صاحب اپنا بیشتر وقت گزارتے تھے وہ صبح سے شام تک ان کے ملاقاتیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان ملاقاتیوں میں انکے بے تکلف احباب بھی ہوتے تھے، شاگرد بھی اور "رومان" کے قلمی معاونین بھی۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد نیچے سے کسی کی آواز آتی تھی "اختر صاحب" اور اختر صاحب معمول

کے مطابق جواب دیتے تھے "آؤ" اور آنے والا آجاتا تھا۔ اس دوران میں خاموشی کا ذرا سا وقفہ آتا تھا اور پھر گفتگو وہیں سے شروع ہو جاتی تھی جہاں وقفہ خاموشی آنے سے پہلے اسے چھوڑا گیا تھا۔ گفتگو صرف شاعری کے متعلق ہوتی تھی۔ اختر صاحب کو صرف اسی موضوع سے دلچسپی تھی۔ کوئی اور موضوع نکل آتا تھا تو ہوں ہاں کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ میں بھی اختر صاحب کے ہاں پہنچ جاتا تھا۔ انتظار یہ ہوتا تھا کہ ملاقاتی چلے جائیں تو اپنی نظم اصلاح کے لئے پیش کروں لیکن ایسا موقعہ شاذونادر ہی ملتا تھا۔ ایک دن وہاں گیا تو اختر صاحب کی چارپائی کی پائنتی کی جانب ایک دیہاتی سے نوجوان کو دیکھا کہ کرسی میں بیٹھا چپ چاپ سامنے کی دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ اس ماحول میں وہ مجھے بڑا اجنبی لگا۔ فضا میں قہقہے گونج رہے تھے۔ آوازوں کا شور بلند تھا۔ کہیں کہیں کوئی سنجیدگی کی بات بھی چھڑ جاتی تھی۔ مگر اس دیہاتی کی یہ حالت تھی کہ اپنے چہرے پر کسی تاثر کو آنے ہی نہیں دیتا تھا۔ جیسے اسے اس ماحول سے کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں۔

اختر صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر دس منٹ بعد گفتگو روک کر بلند آواز سے کہتے تھے "کلّے!" اور تھوڑے وقفے بعد ایک لڑکا ایک پرچ میں پان کا ایک ٹکڑا اور اسی پرچ میں الگ تھوڑا سا چونا بھی لے آتا تھا۔ یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔

اس روز میں معمول سے زیادہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اصل میں مجھے ضد سی ہوگئی تھی کہ یہ معلوم کروں آخر یہ دیہاتی ہے کون جس نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ ملاقاتیوں کا ذرا ہجوم چھٹا تو اختر صاحب نے پان کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر انگلی سے چونا سمیٹ کر اسے ہونٹوں تک

لے جاتے ہوئے مجھے کنکھیوں سے دیکھا اور پوچھا "مرزا انہیں جانتے ہو"۔ اشارہ دیہاتی کی طرف تھا۔ میں نے جب نفی میں سر ہلایا تو وہ بولے "پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی چیزیں تم نے نہیں پڑھیں"؟ اختر صاحب ابھی اپنا فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ایک بھاری ہاتھ نے میرے ہاتھ پر اپنا سارا بوجھ رکھ دیا۔ ندیم صاحب نے اس بات کا بھی انتظار نہیں کیا تھا کہ میں اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھاؤں اور رسماً اٹھ کر انکے قریب جاؤں وہ شپاشپ میرے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ انکے ہونٹ اب بھی خاموش تھے۔ مگر ان پر مسکراہٹ کی ایک لہر رواں دواں ہو گئی تھی۔

ندیم صاحب اظہار محبت میں ہمیشہ پہل کیا کرتے ہیں۔ یہ انکی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ اور اسوقت بھی غالباً ہماری پہلی ملاقات میں انہوں نے پہل کی تھی۔ میں نے انکی نظموں کی تعریف کی، شرما گئے۔ کہانیوں کا ذکر ہوا اور شرما گئے۔ میں نے کہا آپ سے ملاقات کا بڑا شوق تھا۔ تو یہ لفظ سنکر مجھے یک لخت یوں محسوس ہوا کہ احمد ندیم قاسمی تو غائب ہو گئے ہیں اور انکی بجائے کرسی میں صرف "شرمیلا پن" رہ گیا ہے۔

میں نے ندیم صاحب کی عدم موجودگی میں اختر صاحب سے کہا "مولانا! ندیم صاحب تو بڑے شرمیلے ہیں"۔ بولے۔ "مرزا یاد رکھو یہ لڑکا ایک دن بہت بڑا شاعر بنے گا"!

اختر صاحب کے مکان کے علاوہ بھی ہمیں ایک ایسا مقام حاصل تھا جہاں گاہے گاہے دو چار دوست جمع ہو جاتے تھے اور جہاں نشستیں عموماً کافی طویل ہوتی تھیں۔ یہ مقام تھا خوشتر گرامی کا دفتر۔ جہاں سے ان کا ماہنامہ "بیسویں صدی" شائع ہوتا تھا۔ اور یہ

کی منزل میں وہ بیوی بچوں سمیت رہتے تھے اور نیچے رسالے کا دفتر تھا جہاں آنے جانے والوں کا سارا دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ بیسویں صدی کا دفتر شاہ عالمی دروازے کے باہر اس مسجد کے عقب میں واقع تھا جسے شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے تعمیر کر دیا تھا خوشتر صاحب اپنے رسالے کے مضمون نگاروں کو بڑی خوشی سے معاوضہ دیتے تھے لیکن انکے معاوضے کی صورت معاوضے کی عام روایت سے بڑی مختلف ہوتی تھی یہ صورت کیا ہوتی تھی۔ اس کے متعلق واضح طور پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے جو واقعہ لکھنے والا ہوں اس سے میرا مفہوم ظاہر ہو جائے گا۔

جمعہ کا روز تھا۔ میں اور یزدانی جالندھری آوارہ گردی کرتے ہوئے لوہاری گیٹ کے قریب ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں تربوزوں کا ڈھیر راہگیروں کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ تربوز دیکھتے ہی میری نظریں رک گئیں اور یزدانی کی ٹانگوں نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ میری جیب میں کچھ پیسے کھنک رہے تھے اور یزدانی بھی اس دن خلاف معمول مالدار نظر آ رہے تھے۔ ہم نے جیبوں سے ساری رقم نکال لی اور ایک تربوز خرید لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے کھائیں کیسے ؟ دونوں وضعدار آدمی تھے۔ اور نیم شعوری طور پر یہ بھی احساس تھا کہ لوگ ہمیں پہچانتے ہیں۔ آپس میں مشورے ہونے لگے۔ آخر یہ طے پایا کہ خوشتر گرامی کا دفتر قریب ہے وہاں برف بھی مل جائے گی اور چھری بھی۔ چنانچہ آدھا راستہ میں نے تربوز اٹھایا آدھا راستہ یزدانی نے۔ دفتر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت احمد ندیم قاسمی کرسی میں بیٹھے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

"آپ کیسے؟" میں نے ندیم صاحب سے پوچھا

"اور آپ کیسے؟" ندیم صاحب نے ہمارا سوال ہماری طرف لوٹا دیا۔

"ہم ایسے!" میں نے تربوز کی طرف اشارہ کیا جسے یزدانی نے بڑی احتیاط کیساتھ خوشتر صاحب کی میز پر رکھدیا تھا۔ اتنے میں خوشتر صاحب آگئے۔ انہوں نے حسب عادت نعرہ مارا "آیئے" اور چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگے "بہت اچھے وقت پر آئے ہو قاسمی صاحب کو مُرغے کی دعوت دی تھی" شاید ہمارے چہروں پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے، خوشتر بولے "فکر مت کیجئے۔ مُرغا کوئی مریل مُرغا نہیں، پہلوان ٹائپ کا ہے" اور تھوڑی دیر بعد پہلوان ٹائپ کا مُرغا پلیٹوں پر لد کر آگیا۔ میں نے اور یزدانی نے جلدی ہاتھ کھینچ لیے۔ مگر ندیم صاحب برابر مصروف رہے۔ اس کے دو اڑھائی گھنٹے بعد تربوز کی باری آئی یہاں بھی ندیم صاحب نے اپنی پوری توانائی کا ثبوت دیا۔ جب کھانا پینا ختم ہوگیا تو ندیم صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خوشتر کے حوالے کر دیا۔ گویا انہوں نے اپنی طرف سے نظم پیش کر کے خوشتر صاحب کا قرض چکا دیا تھا۔ اور ہمیں بھی خبر تھی کہ جب تک اپنی چیزیں خوشتر صاحب کو نہیں دیں گے ان کا پہلوان ٹائپ کا مُرغا ہمارے کانوں میں برابر بانگ دیتا رہے گا۔ اس لیے وعدہ کر لیا کہ دو تین روز تک یزدانی کی نظم اور میرا افسانہ ان کو مل جائیگا۔ اور یوں ہم نے پیشگی دیتے ہوئے معاوضے کا حق ادا کر دیا تھا۔

مُرغ اور تربوز کھانے کے درمیان ایک جگہ جو بیٹھنے کا موقعہ ملا تو ندیم صاحب نے کھل کر باتیں کیں۔ اور آغازِ گفتگو یوں کیا "یہ شہری لوگ بڑے عجیب ہیں۔ بھوک کے

رہتے ہیں اور اسے تہذیب سمجھتے ہیں۔ ہم دیہاتی اس تہذیب کے قائل نہیں ہیں۔ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں خواہ مخواہ تکلف سے کام نہیں لیتے۔"

اُس دن ندیم صاحب نے بہت کچھ بتا دیا۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے اپنی وادی کا ذکر کچھ ایسے شاعرانہ انداز میں کیا کہ میں بے اختیار کہہ اٹھا:

"ندیم صاحب! کبھی ہمیں اپنی خوبصورت وادی کی سیر کرائیے۔"

"آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ پائیں گے۔"

مجھے ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالے کچھ مدت گزر چکی تھی۔ اس دوران میں ندیم صاحب ہر ماہ ایک افسانہ اور نظم یا غزل بھجواتے رہے۔ ان کی شہرت پر لگا کر سارے ہندوستان میں اُڑ رہی تھی۔ ادبِ لطیف کے قارئین ان کے دیہاتی فضا کے افسانوں اور نظموں کا بڑی بیتابی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ ہر مہینے پڑھنے والوں کے جو خطوط موصول ہوتے تھے وہ ندیم صاحب کی تحریروں کی تعریف سے بھرے ہوتے تھے۔ لوگوں کو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ کیسا شخص میدان میں آیا ہے جو افسانے اور شاعری —— دونوں اصناف پر حاوی ہے۔ بڑے معرکے کے افسانے لکھتا ہے اور اس کی شاعری کا تو جواب ہی نہیں ہے۔

ہمارے درمیان باقاعدگی سے خط و کتابت جاری تھی۔ نہ جانے ندیم صاحب اتنے طویل خط کیونکر لکھ لیتے تھے۔ انکا ہر خط کم و بیش دو صفحوں پر پھیلا ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ سے ان کی دلی محبت اور خلوص کی بُو آتی تھی۔ تیسرے چوتھے مہینے مجھے وادیِ سون پہنچنے

کی دعوت بھی نہ دیتے تھے ۔ اور میں انکی دعوت ٹالتا جاتا تھا ۔

اِس زمانے میں ندیم صاحب نے ایسے خوبصورت، پیارے اور دلآویز قطعات لکھے تھے کہ ان کے پڑھنے والوں میں ایک مسرت انگیز حیرت یا حیرت انگیز مسرت کی لہر دوڑ گئی ۔ یہ قطعات دیہاتی ماحول کے دلکش رنگ لئے ہوئے تھے ۔ میرے دل میں ندیم صاحب کی وادی کی سیر کرنے کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا تھا ۔ چنانچہ انہیں خط لکھا ندیم صاحب کب آؤں ۔ آپ کے یہاں کیسے پہنچوں ۔ فوراً اس کا جواب آ گیا ۔" برادر محترم مجھے آپ کا خط پڑھ کر بے اندازہ خوشی ہوئی ۔ میں خود حاضرِ خدمت ہو کر آپ کو اپنے ہمراہ لے جاتا ۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ آج کل یہاں بڑی خوں ریز لڑائی ہو رہی ہے جس میں چھریاں اور چاقو چل رہے ہیں ۔ اِس حالت میں آپ کا آنا ٹھیک نہیں ہوگا ۔ آپ اطمینان رکھیں میں خود آپ کے پاس آؤں گا اور آپ کو لے جاؤں گا ۔ آپ کا بھائی احمد ندیم قاسمی" ——

خوں ریز لڑائی کی خبر پڑھ کر میں لرزہ براندام ہو گیا اور اس کے بعد ندیم صاحب نے بھی وادی میں آنے کی کبھی دعوت نہیں دی اور نہ میں نے انہیں اس طرف متوجہ کیا! بلکہ اندازہ یہ ہے کہ وہ بھی اب کم ہی ادھر جاتے ہیں ۔

اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک —— ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء سے شروع ہو چکی تھی ۔ مگر ندیم صاحب کا رول اس میں اس وقت شروع ہوا جب قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستانی ادیبوں نے اس تنظیم کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کا اعلان کیا ۔ ندیم صاحب اسمیں پیش پیش تھے ۔ تحریک سے ان کی وابستگی کو ندیم کے ان

بزرگوں نے بھی پسند نہیں کیا تھا جن سے ندیم صاحب کو بڑی عقیدت تھی اور جن میں سے بعض کو تو وہ اپنا ادبی راہنما تسلیم کرتے تھے۔ بزرگوں اور دوستوں کی شدید مخالفت نے ان کے راستے میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کیں لیکن ندیم صاحب نے اپنے لیئے جو راہ منتخب کر لی تھی اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ ان کا عزم ناقابلِ شکست تھا۔ میں یہاں پر ترقی پسند تحریک میں ندیم صاحب کے کردار کا تجزیہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ میرا موضوعِ گفتگو نہیں۔ میرا مقصد تو صرف ان لمحوں کو آواز دینا ہے جو ہمارے ماضی کے مشترکہ طور پر حصّہ دار ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں میرا ندیم صاحب کے ساتھ تصادم ہوا اور اس تصادم کے ردِ عمل میں ہم دونوں کے درمیان کچھ تلخیاں پیدا ہو گئیں جو دیر تک برقرار رہیں۔

میں اپنے طبعی رجحانات کی بنا پر اعتدال پسند ہوں۔ شعلہ مستعجل بننا مجھے کسی صُورت بھی منظور نہیں ہے اور یہ شاید اس لیئے کہ شعلہ مستعجل بننے کی مجھ میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں تو فطرتاً ایسے دیے کا قائل ہوں جو مٹی ہی کا کیوں نہ ہو۔ مگر جو مستقل طور پر اپنی مختصر سی روشنی اگلتا رہے۔ آل پاکستان ترقی پسند مصنّفین کا جو اجلاس لاہور کے باغِ جناح کے اوپن ایر تھیٹر میں ہوا اس میں ایک ایسی قرارداد بھی پیش ہونے والی تھی جس سے مجھے اصُولی طور پر اختلاف تھا۔ اس قرارداد کا مقصد بعض اہلِ قلم کی تحریروں کا بائیکاٹ کرنا تھا۔ اِتفاق سے یہ قرارداد میرے ہی نام کے ساتھ درج کی گئی۔ یعنی کھُلے اجلاس میں اسے مجھے پیش کرنا تھا۔ میں نے یہ قرارداد پیش نہیں کی بلکہ اجلاس

ہی میں شامل نہ ہوا۔

ترقی پسند تحریک کا میں بنیادی رکن تھا اور جب میں نے ایک قرارداد کی مخالفت کی اور اس پرچے میں کی جواب تک تحریک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو ترقی پسند مصنّفین کا ردِ عمل بڑا شدید ہوا۔ ندیم صاحب نے جو انجمن کے جنرل سکریٹری منتخب ہو چکے تھے، میرے اداریہ کی مخالفت میں ایک بھرپور مقالہ "سویرا" میں لکھا اور میری ایک ایک دلیل کا جواب دیا۔

ترقی پسند مصنّفین کی مجلسِ عاملہ نے اپنا ایک خاص اجلاس طلب کر کے مجھے تحریک سے الگ کر دیا اور اس کا اعلان بھی اخباروں میں کر دیا۔ مجھے اس بات کا دُکھ نہیں ہوا۔ دکھ اس امر کا ہوا کہ ندیم صاحب اس مجلس کے کرتا دھرتا تھے۔ مگر اتنی پرانی دوستی کے باوجود انھوں نے بھی میری مخالفت کی۔ ان سے یہ توقع نہیں تھی۔

میں یہ سوچتا تھا کہ یہ قرارداد تحریک کے اپنے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہو گی۔ اہلِ قلم نظریاتی طور پر ہم سے الگ راستہ اختیار کرنے کے باوصف ادیبوں کی برادری میں شامل ہیں جس طرح ہمیں رسائل و جرائد میں اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ ہمارے مخالفوں کو بھی ہے۔ ادبِ لطیف یا کوئی ادبی پرچہ انکی تحریروں کا کیوں بائیکاٹ کرے۔

واقعی مجھے ندیم صاحب پر بڑا غصہ آیا تھا ــــــ آج سوچتا ہوں تو ان کا ردِ عمل فرض شناسی کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ قرارداد مجلسِ عاملہ نے متفقہ طور پر پاس کی تھی۔ اپنے عہدے کے اعتبار سے ان پر تحریک کی بہت بڑی ذمہ داری عاید ہوتی تھی اور

انہوں نے میرے اداریے کی مخالفت کرکے ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔

میں ندیم صاحب سے کھچا کھچا سا رہنے لگا تھا لیکن ندیم صاحب جب بھی ملتے تھے ان کی خندہ پیشانی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا اور آہستہ آہستہ یہ تلخی بھی وقت کے ریلے میں بہ گئی۔

اس دور میں میں کبھی سوچا کرتا تھا کہ ندیم صاحب جو نہیں ہیں وہ تو واقعی نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی نہیں ہیں۔ انکی شخصیت بڑی گہری بڑی پُراسرار ہے۔ بلا جھجک ہر بات کا اظہار کر دیتے ہیں لیکن اس حالت میں بیشمار ایسی باتیں ہوتی ہیں جو انکی گفتگو کے حُدود سے دُور، ہونٹوں کے کناروں سے پرے دل کی گہرائیوں میں چھُپی رہتی ہیں باہر نہیں آتیں۔ مگر عجیب معاملہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں جو کچھ سوچا جائے مُلاقات کے وقت خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ وہ مجھے ایک ایسا گلاب معلوم ہوتے تھے جس کے قریب پہنچیں تو آنکھوں تلے رعنائیوں کی ایک دُنیا آباد ہوجاتی ہے اور اس سے پیچھے ہٹ جائیں تو جھاڑیوں میں چھُپا ہوا ایک ایسا پھُول بن جاتے ہیں جس کی صرف ہلکی سی جھلک ہی دکھائی دیتی ہے۔

ندیم صاحب سے میری دوستی کم از کم پانچ سال پہلے سلور جوبلی منا چکی ہے۔ اس طویل مدت میں ہم ایک دُوسرے کے ساتھ بھی رہے۔ لکھنے لکھانے پر ایک دُوسرے کو اُکساتے بھی رہے۔ ایک دُوسرے کو محبت اور پیار کے لمبے لمبے خط بھی لکھتے رہے۔ ایکدوسرے سے الگ بھی رہے۔ ہم میں کچھ تلخیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن آج ——— آج میرے لئے

ندیم صاحب کی دوستی ایک متاعِ گراں بہا ہے جسے مَیں کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ آج مَیں بڑے فخر، بڑی مسرت سے یقین کرتا ہوں کہ ندیم میرے دوست ہیں۔ میرے اپنے ہیں۔ میرے قریب ہیں اور ان سے قریب رہ کر مَیں خلوص اور پیار کی نکہتوں میں سانس لے رہا ہُوں۔

یہ کچھ ابھی ہُوئی یادیں ہیں جنہیں میں نے اسی انداز میں لکھ دیا ہے جس انداز سے میرے ذہن میں آئی ہیں۔ تقدّم و تاخّر کا بھی فرق پُوری طرح برقرار نہیں رہ سکا۔ جی چاہتا ہے کچھ اور لکھوں مگر یہ داستاں پھیلی تو پھیلتی چلی جائے گی اور موجُودہ مصروف زندگی میں لمبی تحریریں پڑھنے کا کس میں حوصلہ ہے ؎

حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

پیر فضل گجراتی

احمد ندیم

واہ احمد ندیم رموز پرور ، سو سو رمز جس دی اک اک بات وچ اے
اڈوا اڈ رنگ ادب تے شاعری دا جمع ایس استاد دی ذات وچ اے
کوئی جدید قدیم دا ویروا نئیں سب کجھ بند ایہدے ملفوظات وچ اے
اوہ موجود نئیں وڈ رہیاں دے درس اندر ، ایہدی جوڑ کی ملاقات وچ اے
اوہ ادیب اکھوان دا حق رکھے مجلس ایس دی جہدی برات وچ اے
جیہڑے شیشے نوں ایس جلا دتی ، اوہدی مثل نہ حلب ہرات وچ اے
جنہوں ایس ڈٹھا ، ایہدا ہو چکا ، ایسا اثر نظر التفات وچ اے
ظاہر بسر اوقات لاہور اندر ، روشن نام دیہات قصبات وچ اے
اڈو اڈ جدید مضموناں دے ڈھیں قدیم بیٹھا آپ بند اپنی گھات وچ اے
بند شاعری بنیاں نثر تے نظم دیاں بیت بیت سوہنا غزلیات وچ اے

چھایا نُور تحریر تقریر اتے، کُٹ کے حُسن بھریا خیالات وِچ اسے
قلم ایس دی، قلم غلمان دی اے زلف حُور دی صوف دوات وِچ اے

بن کے شمع مشاعرے وِچ جدوں چمکے لکھ جُھکے جان پروانیاں دے
اِک اِک شعر ایہدا بار بار سُندے لوک جھوم کے وانگ مستانیاں دے

(۱۰- اپریل سنہ ۱۹۷۱ نوں ندیم ہوراں دے
نال شام مناں دے سلسلے وِچ ڈسٹرکٹ
کونسل ہال گجرات وِچ پڑھی گئی)

فکرِ ندیم

طرب فزائے تمنا ہے شوخیٔ لالہ
چھلک رہا ہے نگاہوں سے کیف منظر کا
فضائے "دشتِ وفا" میں بہار کا موسم
فروغِ حُسنِ تخیّل کرشمہ ساز ہُوا
یہ ابرپاروں کا جھرمٹ یہ نکہتوں کی پھوار
بسی ہُوئی ہے ہواؤں میں مستیٔ صہبا
دیئے سے جلتے نظر آئے سبز شاخوں پر
خرد کے نور سے روشن ہُوئی گُلوں کی قبا
مئے نشاط کی سرمستیاں ہیں غنچوں میں
بہارِ حُسنِ معانی کی ہیں سربستہ
اِنہی فضاؤں سے حاصل ہوا سرودِ نظر
اِنہی فضاؤں سے ہر رنگ کا مزاج بنا
اِنہی فضاؤں سے ڈھلتا ہے ہر غزل کا بدن
اِنہی فضاؤں سے ہوتی ہے فکرِ شعر رسا
اِنہی فضاؤں سے مہکا ہے ہیر کا آنچل
اِنہی فضاؤں میں وارث کا وصف تابندہ

اِنہی فضاؤں میں اقبال کا تجلّی ہے
اِنہی فضاؤں میں شاعر ہُوا فلک پیما
اِنہی فضاؤں میں مہکی ہُوئی ہے فکرِ ندیمؔ
اِسی مہک سے دبستانِ آب و گل پیدا
اِسی مہک سے معطّر ہُوئی قبائے حیات
اِسی مہک سے منوّر ہُوا چراغِ وفا
اِسی مہک سے جلا پائی شیشۂ دل نے
اِسی مہک سے بشر کو ثباتِ عشق مِلا،
اِسی ثبات کا حاصل ہے مقصدِ تخلیق،
اِسی ثبات میں مضمر ہے سِرِّ آبِ بقا"

○

جمالِ سویدا

پرویز سید فنا

فن کار

شب کی گھمبیر سیاہی میں اسے پایا ہے
دن کے بھرپور اجالے میں نظر آیا ہے
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں وہی وجہ نمو
اور دہقاں کے پسینے میں اسی کی خوشبو
کبھی برسات کی "رم جھم" میں اسے ڈھونڈا ہے
"شعلۂ گل" میں کبھی اس کا شرر چمکا ہے،
مردِ مومن کی نگاہوں سے عیاں اس کا "جلال"
قلب شاعر پہ ہے انوار فشاں اس کا "جمال"
تو نے ہر حال میں اس نور کو پہچانا ہے،
تیری دھڑکن نے اسے اپنا خدا مانا ہے

تو نے اِس نورؔ سے ہر شعر کو چمکایا ہے
تیرے گیتوں میں وہی نورؔ اتر آیا ہے

تیرے زخموں کے دِیے "دشتِ وفا" میں چمکے
تیرے اشکوں کے گُہر شب کی ردا پر دمکے

تیرگی پر تجھے ہر لمحہ اُجالوں کا گماں،
ظلمت و نور کا عرفان! — پھر ایسا عرفاں!

تیرے سینے میں دھڑکتا ہوا فن کار کا دل،
جیسے طوفاں میں سفینے کو یقینِ ساحل

ایک دُنیا سے نِرالا ترا اندازِ جنوں،
لب پہ ہلکا سا تبسم ہے، نگاہوں میں سکوں

تجھ کو بھائی کہوں، ہمدم کہوں، شاعر کہ ندیم
دیوتا فن کا، کہ فن کار کا شہکارِ عظیم

○

جوشؔ (مرحوم)

ندیم — ایک حقیقت پسند شاعر

میاں احمد ندیم قاسمی کو خدا زندہ، تندرست اور شاد کام رکھے ——— میں ان کے باب میں کئی مہینے ہوئے ایک مضمون "نقوش" کے خوب رو اور خوب سرشت مدیر، میاں طفیل کو ڈاک کی وساطت سے روانہ کر چکا ہوں، جو بدقسمتی سے اُن تک نہیں پہنچا۔

میں نے وہ مضمون، بڑے موڈ میں لکھا تھا۔ جو اسوقت پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اسوقت تو میں سوختہ جاں، دہلی میں بیٹھا دہلی و لکھنؤ کی تہذیبی و شعری بربادی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہوں اِس عظیم اندوہناکی میں وہ پہلا سا موڈ کہاں سے لاؤں، اور احمد ندیم کے باب میں کس صورت سے قلم اٹھاؤں۔

برو، بکارِ خود اے خواجہ ایں چہ فریاد است
مرا فتادہ دل از کف، ترا چہ افتاد است

اِس ماتمی حالت میں، لے دے کر صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری کی دیوی اس بلا کی مغرور ہے کہ ہر نفس کو اپنا مہبط نہیں بناتی، اور درجہ اول کے خلوتیانِ ملکۂ انسانیت کے علاوہ دنیا میں کسی اور کو بھولے سے بھی مُنہ نہیں لگاتی ہے۔

لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ لاکھوں بدجنس انسان اپنی پیشانیوں پر شاعری کا تاج رکھے ہوئے مشاعروں میں گا اور مطابع میں اپنا کلام چھپوا رہے ہیں تو فرطِ حیرت سے سر چکرانے لگتا ہے۔ اور جب اس عبرت ناک صورت حال پر غور کرتا ہوں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شاعر موزوں طبع ہوتا ہے۔ لیکن ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوتا۔ قدرت بے شمار لوگوں کو طبع موزوں اس غرض سے عطا کرتی ہے کہ وہ اپنی طبع موزوں سے گز کا کام لیکر شاعری کے قامت کو ناپیں۔ اور نقاد کے فرائض انجام دیں۔ لیکن یہ غلط کار لوگ، اپنے گزوں کو ٹیکسٹائل ملوں میں تبدیل کر کے شاعری کے تھان بنانے لگتے ہیں۔ اور ان کی غلط کاری کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب وہ گویئے، مشاعروں میں گلوں کی چلت پھرت سے کام لیکر الاپتے ہیں۔ تو "کن رسیے" عوام ان کو سچ مچ کا شاعر سمجھ کر سُبحان اللہ کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں۔

اِس غلط ماحول میں عوام کے واسطے یہ کام ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر و متشاعر کے مابین امتیازی خط کھینچیں اور جھوٹے موتیوں کو سچے موتیوں سے پرکھ کر جدا کر سکیں۔

جہاں تک اربابِ نظر کا تعلق ہے وہ تو ایک نظر میں پہچان جاتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، وہ متشاعر۔ اب رہی عامۃ الناس کی بات۔ سو اِس باب میں یہ عرض کروں گا کہ جب وہ کسی مدعیِ شاعری سے دوچار ہوں تو سب سے پہلے۔ اس بات کی تحقیق کریں کہ اس کا کردار کیا ہے۔ اس کا اقارب و احباب سے برتاؤ کیا ہے۔ اور اس کھوج میں اگر ان کے علم میں یہ بات آجائے کہ وہ دروغ گفتار، خلوص بیزار، جفا شعار، زر پرستار، فریب کار اور غدار ہے تو آنکھیں بند کر کے

یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ ہرگز شاعر نہیں ہے۔ شاعری و انسانیت کے اس پیمانہ معیار پر نگاہ کرکے جب قاسمی کی جانب نظر اٹھاتا ہوں تو بلا خوف ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر، اور انسانیت و بشریت کا ایک ایسا دل کش سنگم ہے جس کا اور چھور نہیں مل سکتا۔

مجھ نامراد کی یہ آرزو ہے کہ قاسمی پھولے پھلے، پروان چڑھے اور اُس کی شاعرانہ برتری کو دُنیا جانے اور ماننے کی طرح مانے۔ لیکن میری یہ آرزو شاید پوری نہیں ہوسکے گی۔ اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں بدنصیب ملکوں میں ادبی نقطۂ نگاہ سے اس قدر اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خط و خال دیکھنے سے قاصر ہو چکے ہیں۔

الے چراغ جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

فراقی

ندیم قاسمی

اب میں مستقل طور پر بیمار رہتا ہوں جسم، دل، دماغ سبھی تھکے تھکے سے رہتے ہیں۔ یہ سب میری عمر کا تقاضا ہے۔ اچھی شاعری کے نکات اور محاسن تو اس حالت میں بھی براہ راست محسوس کر لیتا ہوں۔ لیکن اپنے آپ میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ کاوش غور و فکر کے ساتھ ان نکات و محاسن کو الفاظ کا جامہ پہنا سکوں۔

برسوں سے اس دور کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی کے دلآویز کلام پر میری نظریں پڑتی رہی ہیں۔ اس کلام کی دلکشی نے بجا طور پر جناب احمد ندیم قاسمی کو ہر دلعزیز شاعر بنا دیا ہے۔ ان کا کلام ایک حساس دل و دماغ کی پیداوار ہے جس نے ان کے لہجہ میں ایک چٹیلاپن اور ان کے انداز فکر میں ایک خلوص اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی شاعری میں تقلید، فرسودگی، باسی پن روایت زدگی اور پیش پا افتادہ باتیں نہیں ہوتیں۔ ان کے بجائے اک تازگی کا احساس ہوتا ہے جو محض جدت سے نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ ایک انفرادی وجدان سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

ان کی شاعری کی ایک شخصیت ہے جس کے مخصوص خد و خال ہیں۔ اس شاعری کی

ایک سیرت ہے اور ایک پہچان لیا جانے والا کردار ہے۔ اس شاعری کی شرافتِ نفس اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کو ہم پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دل سے اس کی عزت کرتے ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کا ایمان زندگی ہے جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ اس شاعری کی رگیں بہت حساس ہیں۔ اس کی ادائیں بہ یک وقت سادہ و پُرکار ہیں ہم اس شاعری کو ایک قیمتی انسانی دستاویز ماننے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس شاعری نے اُردو ادب کو توانائی اور تونگری بخشی ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی اُردو ادب میں تنہا وہ آدمی ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری اور شاعری دونوں اصنافِ ادب میں نئی سمتوں اور نئی منزلوں کی نشان دہی کی ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

دور افراز شاعر

جناب احمد ندیم قاسمی کی میرے دل میں انتہائی قدر و منزلت ہے ۔ میں جب ان سے ملتا ہوں تو اپنے اطوار سے اُن پر یہ ظاہر بھی کر دیا کرتا ہوں ۔ احمد ندیم اس دور کے واقعی "دور افراز" شاعر اور ادیب ہیں ۔ میں اُن سے پیار کرتا ہوں ۔ سیاسی طور پر جس جتھے یا گروہ سے ان کا تعلق بیان کیا جاتا ہے ۔ مجھے اس سے کوئی تعرّض ندیم صاحب کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ ندیم کچھ اور ہیں ۔ وہ خوش خلق ہیں ۔ کم از کم میں نے تو انہیں کبھی بداخلاقی سے ملوّث نہیں پایا ۔ اکثر و بیشتر ان سے مُلاقات یا بہت ہی معمولی علیک سلیک یا بات چیت کسی مشاعرے ہی میں ہوتی رہی ہے ۔ وہ شعر و شاعری میں بھی، اسلوب میں بھی "براعت" میں بھی اپنے ان جنادری ساتھیوں سے قطعاً الگ ہیں جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ۔ اُن سب میں ندیم ہی ایک فرد وحید ہیں کہ ان کے شعروں میں جدتِ خیال کے علاوہ شدتِ احساس بھی ہے اور قلوب کی تہہ تک پہنچنے والی گہرائی بھی ۔

کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں ۔ اُن کے قرب و جوار اور ارد گرد ہجوم کرنے والے یا بیٹھنے اور منڈلانے والے شاعروں میں سے جن کے رنگ برنگے جھنڈے بس فضا ہی تک تھی

یا لال گلابی جھلکیاں دکھانے کے لیے لہراتے نظر آتے ہیں۔ اُن میں سے کسی جھنڈے کو تھامے بغیر استوار رہنے کا شرف اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف احمد ندیم قاسمی کو۔

اِن دنوں طبیعت اچھی نہیں۔ لکھنے کے قابل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندیم کے معیارِ کمال سے اِنصاف نہیں کر سکتا۔ بس اتنا ہی کہہ دینے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ندیم ایک پیاری شخصیت، ایک بڑے مقام کا شاعر، ایک راست نویس، افسانہ نگار اور ایک دردمند صحافی ہے۔

ندیم عوام کے لیے اپنا خون کاغذ پر لا رہا ہے۔ لہٰذا اپنے ہی ایک شعر پر ندیم کے بارے میں، جو حفیظ کہہ رہا ہے۔ وہ حفیظ ہی کی زبان سے سُنیے، نہیں تو پڑھ لیجیے ؎

کبھی تو رنگ لائیگا، کبھی تو گُل کِھلائے گا
ہم اپنا خون صرفِ گلشن ایجاد کرتے ہیں

فیض احمد فیض

بے تکلف فنکار

ناؤمی طفیل صاحب

آپ نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ یہی فرمائش آپ اور عزیز دوست نے اب سے پہلے بھی کی تھی اور ہم کسی طرح ٹال گئے تھے۔ اس کی وجہ خلوص کی کمی یا نیت کا فتور نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے قریبی دوستوں کے بارے میں لکھنے کا ڈھب نہیں آتا اور کچھ اس وجہ سے بھی قلم رکتا ہے کہ اگر محض توصیف کی تو لوگ غالب کا طرف دار کہیں گے۔ اور اگر کسی بات میں تنقیص کا کوئی پہلو نکل آیا تو دوستی میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔

خیر ندیم صاحب کے بارے میں اس دوسری بات کا اندیشہ تو نہیں لیکن ایسے یک پہلو آدمی کے بارے میں لکھیں کیا اور کیسے۔ مثال کے طور پر اگر میں یہ کہوں کہ ندیم صاحب نہایت شریف انسان ہیں، حلیم ہیں، خلیق ہیں، ملنسار ہیں، وضعدار ہیں، اچھے دوست ہیں، بہت پائے کے افسانے لکھتے ہیں اور بہت عمدہ شعر کہتے ہیں تو ان سب باتوں سے کسی کا کیا بھلا ہوگا؟ اور ندیم کی شخصیت کیسے اُجاگر ہوگی۔ ویسے آپ کو بہت اصرار ہے تو میں ندیم صاحب کی صرف ایک صفت بیان کروں گا جس پر ہم لوگوں نے اکثر رشک کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ندیم صاحب جو کام

بھی کرتے ہیں شاعری ہو یا صحافت ، دوستی ہو یا وضعداری ، دشمنی تو وہ کرتے نہیں ، انکسا
ر ہو یا افتخار ، لطیفہ بازی ہو یا بیان بازی ، ہمیشہ اس بے تکلفی سے ادا کرتے ہیں جیسے پہلے
سے اسی پہ اُدھار کھائے بیٹھے تھے ۔

شاعری اور افسانہ نویسی کی حد تک تو خیر سمجھ میں آتا ہے کہ مشق سے قادر ہو گئے ہوں گے لیکن ان باقی سب اعمال کو انھوں نے بائیں ہاتھ کا کھیل کیونکر بنا لیا کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا ۔ ادبی تخلیق کے بارے بھی اوپر والا جملہ میں نے یوں ہی لکھ دیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری نوجوانی کے زمانے میں بھی جو ندیم صاحب کی ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا ان کا نام قریب قریب ہر معتبر ادبی پرچے میں دندناتا نظر آتا تھا حالانکہ ان دنوں ان پرچوں کے صفحات تک نو مشق لکھنے والوں کی رسائی کچھ آسان نہ تھی ۔ اس پہ ان کے بعض ہمعصر جھلاتے بھی تھے خوش بھی ہوتے تھے ۔ اور کبھی کبھی فقرے بازی بھی کرتے تھے ۔ مثال کے طور پر ایک بات مجھے یاد ہے ۔ میں ، مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم اور راجہ مہدی علیخاں مرحوم عرب ہوٹل میں چودھری نذیر احمد کا (جو ان دنوں "ادب لطیف" کے مینیجر تھے) کسی سلسلے میں انتظار کر رہے تھے ۔ جب کافی انتظار کر چکے تو حسرت صاحب بولے "شاید مولانا وہ کسی اور کام میں لگ گئے ہوں گے" اس پر راجہ مہدی علیخاں نے کہا "جی نہیں اور کام کیا ہے ، ریلوے اسٹیشن پر احمد ندیم قاسمی کی بلٹیاں چھڑا رہے ہوں گے"

جب ندیم سے میری ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر کہیں مقیم تھے اور پھر شاید وہاں منتقل ہو گئے [illegible] سے ایک آدھ سرسری ملاقات رہی ہو تو ذہن میں نہیں تقسیم کے بعد افسانہ نوازی میں پہلی [illegible] تفصیلی بات کرنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ یہ بلٹیاں کے

حساب سے لکھنے کی سہولت ندیم صاحب کا اکتسابی کمال نہیں فطرت کی غلط بخشی ہے۔ غلط بخشی اس لئے کہ زیادہ لکھنے والے بیشتر بُرا لکھتے ہیں اور ندیم صاحب یکساں اچھا لکھتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ ندیم صاحب میں نہ کوئی شریف آدمیوں کا سا شرعی عیب ہے نہ غیر شریف آدمیوں کی سی کوئی اخلاقی کمزوری۔ اس پر اضافہ یہ کہ ہم جیسے دوستوں کی سالہا سال کی کوشش انہیں گمرہی پر آمادہ اور بندگان تقصیر کی صفوں میں شمولیت پر مائل نہیں کر سکی۔ فطرت کو چاہیے تھا کہ ان کا قلم رندوں اور چاک گریبانوں کے بجائے واعظوں اور ناصحوں میں لکھوایا ہوتا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ندیم صاحب نے بہت سے نہایت مؤثر عاشقانہ اشعار اور افسانے لکھے ہیں لیکن ایسے سہل ممتنع شخص نے وصل و ہجراں، یہ جو دو منزلیں ہیں راہِ عشق کی، کیسے طے کی ہونگی۔ اور انہوں نے کبھی عاشقی کی بھی ہے یا نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ نہیں کی۔

احسان دانش

ندیم

جہاں تک یاد پڑتا ہے ندیم سے میری پہلی ملاقات ملتان شہر کے باہر ایک چوراہے پر ہوئی تھی۔ وہ اِن دنوں کسی سرکاری محکمے سے منسلک تھے۔ جب میں نے ندیم کو دیکھا تو ایسا محسوس کیا جیسے وہ کسی دُور دھندلے منظر کے خد و خال پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ حالانکہ اُس وقت تک میں نے اُن کی شاعری یا نثر کو نہیں پڑھا تھا۔ مگر محسوس یہ ہوا کہ اس شخص میں سیکڑوں بے زبان خوبیاں کلبلا رہی ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی مسافر ادیب سے کہا کہ یہ شخص دفتر میں زیادہ دنوں نہیں رہے گا۔ اِس میں تو سیکڑوں قیامتیں رستے تلاش کر رہی ہیں۔ اِس کے بعد پھر کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی اور میں نے ہر ملاقات پر یہی محسوس کیا کہ وہ کسی خوش آہستہ رو آنے والے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اب ان کی شاعری میں نزاکتوں اور لطافتوں کے اکھوے پھوٹ چکے تھے۔ وہ جو بیان کرنا چاہتے تھے وہ بظاہر تو خد و خال آج جیسے تیکھے نہیں رکھتا تھا مگر اس کا مفہوم ایک بجلی کی طرح جگر تک اتر کر رہنے لگا تھا۔

آخر ایک ایسا وقت آ گیا کہ ندیم کو سرکاری ملازمت ترک کر کے ادبی صحافتی زندگی میں آنا پڑ گیا۔ سچے اور حقیقی ادیب یا شاعر کبھی اس کے دُور سے ایسے ہٹتے نہیں ہیں۔

ندیم بھی اِسی صف کے اِنسان تھے ان پر بھی معاشی گرفتیں اور اقتصادی تنگیاں آئیں۔ مگر انہوں نے اپنا انداز نہ بدلا کیونکہ وہ ادب کی تقدیس سے آشنا تھے اور شعر کی عظمت و برکت سے آگاہ تھے۔ ندیم زندگی اور اُس کے حقائق کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ آثار و قرائن کے رُخ پر آگے کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ جدید دَور کے شاعر ضرور ہیں لیکن قدیم محرکات سے بھی بخوبی آشنا ہیں اور دونوں کے درمیان رہ کر وہ اپنے ادب کی بلندی پر اُسی طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے دُور سے اُٹھنے والی آندھی کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اُسے اپنے اندازِ بیان سے سجا کر اُس میں ایسی فسُونی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس سے دُکھی دل، بیدار دماغ اور بیتاب رُوحیں ایک کیف میں گُم ہوتی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ندیم نے جبرِ بیان وزبان پر سختیاں بھی اُٹھائیں اور زندانوں کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ لیکن ان کے دل میں وطن کی محبت اور انسان کے قحط کا احساس جو بیدار ہو چکا تھا وہ جوں کا توں رہا۔ ان کے دل میں طبقاتی کشمکش نہیں بلکہ آفاقی درد ہے جو رنگ و نسل اور زمین و زمان کے احاطے نہیں کھینچتا۔ وہ ایک دائرے سے نکل کر بین الاقوامی زندگی کا بھلا چاہتے ہیں اور اسی کے متعلق اپنی شاعری کے سانچے استعمال کرتے ہیں۔

ان کے یہاں تیغ و تبر ہی نہیں بلکہ لب و رخسار کا تذکرہ بھی موجود ہے لیکن اس میں ان کا اندازِ بیان ایک حسین اور خوبصورت ابہام لیے ہوئے ہوتا ہے جس سے ان کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شاعری میں محذوفات کا ایک حسین امتزاج ہے جو انہیں اردگرد کے [illegible] کرتا ہے لیکن وہ اخلاق اور نرم دلی کے باعث [illegible]

کو بھی نہیں ہٹا سکتے۔ ان کی نظر میں کانٹا بھی پھول کی طرح خوشنما ہے اور وہ دونوں کی آبیاری کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ کانٹوں کی آبیاری سے پھولوں کی جگہ تنگ ہو جاتی ہے۔ اور پھول کی طرح کانٹا خوشبو کی تقسیم سے عاری ہے بلکہ برہنہ پا دیوانوں کا دشمن۔

مگر ان کا مشرب تو یہی ہے۔ اُن کی نظر اب بھی کسی دور کے آنے والے موسم پر ہے اور یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں ایسا چوکھا اور لچکدار ابہام ہے کہ جو حال و استقبال دونوں پر حاوی رہتا ہے اور اس میں حزن و ملال کی ایسی ہلکی چاشنی ہوتی ہے جس کا ہر شخص بھوکا ہے۔

ندیم کے نقش قلم کئی کتابوں کی صورت میں آ چکے ہیں۔ اگرچہ ان کاغذی پیرہنوں میں قطع و برید اور تراش و خراش کا تنوع موجود ہے اور الفاظ کی بناوٹ میں کہیں کہیں پھول بوٹے نظر کو دعوت دیتے ہیں، لیکن ان کے لہجے میں جو روح بیتاب ہے وہ ابھی پورے طور پر نطق کی گرفت میں نہیں آ سکی اور وہ ہر نفس پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے بیان کے اعتبار سے ان کا کلام انہیں سمجھنے کے لیے رہنمائی تو ضرور کرتا ہے لیکن اُن کے اُس جذبے اور محبت کا پیمانہ ابھی ناپید ہے جو اُن کے سینے میں مہک رہی ہے۔

ندیم اپنے ادب میں اخلاقی قدروں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں لیکن اُن کے یہاں وہ قدریں نہیں جنہیں عام لوگ قدریں کہتے ہیں۔ اُن کے سینے میں ایک فنکار کا نہیں بلکہ خالق کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے جو انسان کی محبت میں بے تاب ہے۔

عبدالرحمن چغتائی

سربلند

مجھے ندیم قاسمی سے دلی اُنس ہے اور اس کے فن کا پورا پورا اعتراف ہے۔ وہ ایک عالمگیر حیثیت سے روشناس ہیں۔ علم و ادب میں کونسا جذبہ ہے جو ان کی بصیرت سے اوجھل ہے۔ غزل، نظم، افسانہ، نثر اور تنقیدی مضمون تو اِدھر اُدھر لکھنے والے نظر آجاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ حرف و حکایت اور پُرمعنی طنز و مزاح لکھنے والے خال خال بھی نظر نہیں آتے۔ میرے تاثرات کچھ خوداعتمادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ندیم قاسمی نے اُن استادوں کا بھی رتبہ بلند کیا ہے جن سے وہ عقیدت رکھتے ہیں۔

میں خیال کرتا ہوں، ہو سکتا ہے۔ مجھے ان کی اس کمزوری سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ مطالعہ کچھ یہی ظاہر کرتا ہے۔ قاسمی کو جذباتی عشق سے اگرچہ نہیں تو عشق کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بھی عادت نہیں۔ اور اگر تڑپنے تڑپانے کا موقع ملا بھی ہو تو وہ داستانِ عشق کو جذباتی طور پر دُور رکھنے کا کامل تجربہ رکھتے ہیں۔ ندیم قاسمی نے شاعر رہ کر شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا ہے، اور ان جذبات پر حکیمانہ نگاہ ڈالی ہے جن سے شاعر اور اس کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ اور حقیقتیں بنکر مختلف صُورتوں میں نمُودار ہوتی ہے، جو ظاہرداری، قیاس آرائی، جذبات آرائی اور خودستائی سے الگ رہ کر

رجائیت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ رجائیت خود آرٹسٹ کے لئے ایک ایسا لامتناہی راستہ تخلیق کرنے میں مددگار ہوتی ہے کہ قنوطیت کی لذت پسندی، نمائش آرائی، ہزار خود فریبی کے باوجود شاعر کے فکر تخیل کے پاس بھی پھٹکنے نہیں پاتی۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں ایک انفرادیت ہے، ایک جنون ہے، والہانہ عشق کا اظہار ہے اور وہ انسان دوستی اور انسانیت کا عشق ہے۔ اس کی نظموں میں اس کی غزلوں میں اس کے ادب اور فن میں، یہاں تک کہ وہ جب سڑکوں، بسوں، رکشوں، راہ چلنے والے لوگوں اور معاشرے کی خرابیوں کے متعلق اپنے جنون، اپنے نقطۂ نظر اور اپنے فرائض کا اظہار کرتا ہے تو اس کے سامنے اچھے انسان، اچھے لوگ، ان کی انسانیت اور انسانیت کے تقاضوں کا خفقان ہوتا ہے، ایک ایسے معاشرے کا تصور جس سے زندہ قوموں کی ثقافتی قدروں کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی مسکراہٹوں میں زہر آلود تلخی، معاشرے کی برائیوں کے لئے تریاق کا اثر رکھتی ہے۔ اور ایک ایسے تریاق کا درجہ جو آبِ حیات سے کم نہیں۔

اگرچہ میرے اور اس عظیم دوست کے تعلقات مجلسی طور پر کچھ فاصلے پر ملتے اور ابھرتے رہے ہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ میرے اس قدر قریب رہے ہیں کہ کبھی دوری کا احساس بھی نہیں ہوا۔

مجھے ان کی ہزاروں ملاقاتوں کی ایک ملاقات یاد ہے۔ اور اس ملاقات کی یاد میری نظروں میں آج بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک برقعہ پوش عورت کے ہمراہ میرے ہاں تشریف لائے۔ دیکھتے دیکھتے وہ برقعہ پوش اس انداز اور اس ادا سے ہاجرہ مسرور کے

رُوپ میں محفلوں اور انجمنوں کا سنگار بن گئی۔ کہ حصولِ ادب کے مدِنظر، ذاتی نشوونما کو نظرانداز کرتے ہوئے۔ دوش بدوش خلوص وعقیدت سے وہ ادب کی برتری کے لئے ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوئے۔ توانائی نے اُفتادِ طبع میں ایک ایسا آہنگ بھر دیا ہے کہ زندگی کے کسی رُخ پر نہ کوئی پردہ ہے نہ کوئی فرار نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی میں فلاحِ عامہ کے لئے شدید جذبہ موجود ہے۔ اور وہ ہمیشہ مجھے ان شاہراہوں پر چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ جو محض اس کے سایہ سے نہیں۔ اس کی آنند روشنی سے آراستہ پیراستہ ہیں۔ اس کا صحت مندانہ عزم ادب، ثقافتی مشن، ان عظیم مقاصد کی نمائندگی کرتا ہے جن کی اُبھرنے والی قوموں کو اشد ضرورت ہے۔

سید عابد علی عابد

ندیم — احترامِ آدمیّت کا نقیب

احمد ندیم قاسمی صاحب کے متعلق گفتگو یُں شروع ہونی چاہیئے کہ وہ پہلے انسان ہیں پھر شاعر ہیں۔ فن کار ہیں۔ نقاد ہیں۔ مزاح نگار ہیں۔ دوستوں کے دوست ہیں۔ دشمنوں کے دشمن باسلیقہ۔ باقرینہ (اچھے خاندان کی دلہن کی طرح) اور گفتگو یوں ختم ہوگی کہ وہ آخر میں بھی اِنسان ہیں، اور درجہ اوّل کے۔ نقال یا مصنوع یا خانہ ساز نہیں۔ ان کی انسانیت جتنی ترقی کرتی چلی گئی ہے، وہ اپنے فن کے تنوع میں اسی نسبت سے واراداتی اور جذباتی معاملات میں انفرادی خودداری کو احترام آدمیت میں تبدیل کرتے چلے گئے ہیں میں نے ان کو ہر مرحلے سے گذرتے دیکھا ہے۔ شوریدہ سر جھنجلایا ہوا فن کار ایک اعتدال اور رکھ رکھاؤ کے دائرے میں بہت دوزخوں سے گذر کر داخل ہوا ہے۔ ان دوزخوں کی آگ نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو کندن کی طرح نکھار دیا ہے۔

افسانہ نگاری اور شعر گوئی دونوں اصناف ادب میں وہ زندہ رہیں گے۔ ان کے باقی مشاغل کچھ جذباتی ہیں کچھ ذاتی، کچھ معاشیاتی۔ تاریخ ان کو الگ کر دیگی اور انسانیت کے احترام کے نقیب کو پہچان کر ایک محراب خاص میں جگہ دیگی۔

بعض اوقات ان کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ اُمید ہے دور ہوگئی ہوگی۔ میں اب عُمر کے اس حصّے میں ہوں جب اپنی اوقات سے آدمی خوب واقف ہوجاتا ہے۔ یہ بصیرت کہ دُوسروں کی اوقات پہچان لیں، صرف فنکار کو نصیب ہوتی ہے۔ قاسمی نے اگر مجھے جانا اور پہچانا ہے تو انہیں معلوم ہوگا کہ میں قصیدہ خوانی کا معتقد نہیں، نہ وہ خود ہیں۔

میں نے استدلال نہیں کیا۔ ذاتی تاثرات قلم بند نہیں کیے۔ نقاد (نام نہاد) کی حیثیت سے کچھ عرض کیا ہے کہ قاسمی صاحب کن اصناف میں جاوداں رہیں گے۔ انسان ایک شعر سے غیر فانی ہوتا ہے۔ اُنہوں نے تو مجموعے کے مجموعے قلمبند کیے ہیں جن میں ابدیت کی جھلک گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہے۔ وہ اس کے محتاج نہ تھے نہ ہیں۔ بہرحال "پاسِ مزاجِ دوستاں" اپنی روش ہے۔ طفیل صاحب بضد ہیں اور میں بطیبِ خاطر یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں۔

شاہد احمد دہلوی
مدیر ماہنامہ "ساقی" کراچی

ندیمؔ — ہلالِ مطلعِ ادب

احمد ندیم قاسمی صاحب کی ۴۵ سالہ ادبی زندگی میری نظر میں ہے۔ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو جن ادبی رسائل کو اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے منتخب کیا ان میں "ساقی" بھی تھا۔ وہ زمانہ ادب کے لیے سازگار تھا اردو ادب کی ہر صنف اپنے شباب پر تھی۔ ادب سے لوگوں کو پیار تھا۔ اس لئے ادیب اور شاعر وقیع نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ادب کے اسی سنہرے زمانے میں احمد ندیم قاسمی مطلعِ ادب پر ہلال کی طرح نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بدر بن کر چمکنے لگے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک شاداب قلم تھا جو رنگ برنگ پھول کھلاتا تھا، اور چمنستانِ ادب کو مہکاتا تھا۔

لکھنے والے عموماً ایک رُخے ہوتے ہیں۔ ادیب ہوتے ہیں تو شاعر نہیں ہوتے اور شاعر ہوتے ہیں تو ادیب نہیں ہوتے۔ پھر ایک ہی صنفِ ادب کے ہو رہتے ہیں۔ اپنی اپنی اُفتادِ مزاج کے مطابق افسانہ، ڈرامہ، ناول، طنز، مزاح، مقالہ، تنقید یا شعر شاعری میں امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ مگر قاسمی صاحب چو مکھے قلمکار ہیں۔ انہوں نے ہر صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ قدرِ اوّل کی تخلیقات پیش کی ہیں۔ اد

جب اُنہوں نے اخباری دنیا میں قدم رکھا تو اس ہفت خواں کو بھی تیزی سے طے کر کے صفِ اوّل کے صحافیوں میں آ گئے۔

قاسمی صاحب یقیناً جی نی اس (GENIUS) ہیں کہ بے انتہا زحمتیں گوارا کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں جو کام بھی سونپا گیا اسمیں محنت استقامت سے اُنہوں نے چار چاند لگا دیئے۔ یہ سلیقہ خُدا کی دین ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر ہم بڑے ناگفتے لوگ ہیں۔ سچا اعتراف نیکی کو ابھارتا ہے۔ اعتراف تو کُجا ہم کسی جوہر قابل کی چمک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ شاید ہم بہت ہی چھوٹے دل کے لوگ ہیں۔ قاسمی صاحب کو اپنی بے لوث خدمات کا صلہ مخالفتوں پریشانیوں بلکہ قید و بند کی صورت میں ملا۔ مگر وہ دُھن کے پکے تھے۔ تمام اذیتوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کرتے اور مخالفت کی آگ میں تپ کر قاسمی صاحب کندن بن گئے۔ جو جی نی اس ہوتے ہیں ہمت نہیں ہارتے۔ قاسمی صاحب کو بادِ مخالف روک نہ سکی اور ان کی ہمت کا سفینہ آگے ہی بڑھتا رہا ؎

سہارا موجوں کا لے لے کے بڑھ رہا ہوں میں

سفینہ جس کا ہو طوفاں وہ ناخدا ہوں میں

ناسازگار حالات اور مخالفتوں نے اِنہیں سخت کوش بنا دیا۔ اور اس سخت کوشی نے انہیں منتہائے عروج پر پہنچا دیا۔ ع

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو

خدا کے فضل سے قاسمی صاحب نے اپنی تشنج بھری زندگی کے پچاس سال پورے کر لئے ہیں۔ ہم سب کے لیے یہ نہایت خوشی کی بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس یمن و مسرت کے موقعے پر ہم قاسمی صاحب کی خدمت میں پیش بہا تحفے بھیجتے۔ مگر ادب اور آسودگی کا سنجوگ، اتنا ہی کالعدم ہے۔ تاہم ہم یہ تو کر سکتے ہیں۔ کہ قاسمی کی خدمت میں ہم صمیمِ قلب سے مبارکباد پیش کریں۔ اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہزاری عمر دے ؎

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مجلسِ اربابِ فن کا قیام ایک صحت مند علامت ہے اس امر کی کہ قوم کا خوابیدہ ضمیر جاگ اُٹھا ہے اور اربابِ ادب کی قدردانی کی طرف اہلِ وطن مائل ہو رہے ہیں۔ اُن کی شاندار ادبی خدمات کے احترام میں ان کے شایانِ ایک تقریب کا اہتمام کیا جائے۔ اس تقریبِ سعید کے لئے میں جملہ اراکین مجلس کی خدمت میں عموماً اور مجلس کے خوش صفات کنوینر جناب محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کی خدمت میں خصوصاً ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

پروفیسر آل احمد سرور

ندیم — بلند مقام ادیب و شاعر

مجتبیٰ تسلیم :

خط ملا۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مجلس ارباب فن احمد ندیم قاسمی کی پچاسویں سالگرہ پر ان کی ادبی خدمات کے احترام میں ایک تقریب کا اہتمام کر رہی ہے۔

احمد ندیم قاسمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ندیم اپنے افسانوں، اپنی نظموں، غزلوں، قطعوں اور دوسری تحریروں میں اس طرح جھلکتا ہے کہ ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے اور اس کی عظمت کا اندازہ کر سکتا ہے۔

ندیم اچھا ادیب اور اچھا آدمی ہے۔ اُردو افسانے اور اُردو شاعری دونوں میں اس کا بلند مقام ہے۔ اس کی خدمات کا اعتراف ذوقِ سلیم کا ثبوت ہے۔ مُردہ پرستی کے اس دور میں زندوں کے کارناموں پر بھی توجہ دینا اچھی بات ہے۔ مگر نظر بہر حال فن کار سے زیادہ اس کے فن پر رہنا چاہیے۔

آپ کی تقریب کی کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ دوسرے اُمور کا جواب علیحدہ دونگا۔

مخلص

آل احمد سرور

محمد احسن فاروقی

احمد ندیم قاسمی — ادیب و انساں

احمد ندیم قاسمی کو سب سے پہلے میں نے ان انتخابات کے ذریعے جانا جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر سال چھپا کرتے تھے۔ اور جن میں ہر سال کی بہترین نظمیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک پر میں نے سیر حاصل ریویو بھی "ساقی" میں لکھا تھا۔ ان سالانہ انتخابات میں سب ہی نئے شاعروں کا کچھ نہ کچھ ضرور رہتا تھا۔ مگر مجھے قاسمی صاحب ہی کی نظمیں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ ہر ایک میں ایک نیا تجربہ اور ہر ایک میں وہ روانی، وہ آمد اور وہ دلکشی تھی جو دوسروں کی نظموں میں نہیں نظر آئی۔ میں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ نمایاں انفرادیت کے مالک ہیں۔ اور یہی ان کی عظمت کی میرے لیے دلیل تھی۔ اسی زمانے میں وہ "ادبِ لطیف" سے کسی طرح پر متعلق ہو گئے تھے۔ ان کی نظموں کے اثر سے مجھے بھی نظمیں لکھنے کا شوق چرایا تھا اور میں نے ایک نظم لکھ کر انہیں بھیجی۔ وہ نظم واپس آئی اور اس پر لکھا تھا "مشقِ سخن بڑھائیے نا" مشقِ سخن بڑھانے کے بجائے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں نظم کرنے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا ہوں اور اس کے بعد سے میں نے شاعری کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس زمانے میں میں اور آل احمد سرور، بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کے یہاں ہر وقت ہی ادب کا چرچا رہتا تھا اور جدید

شاعری پر ضرور بات چیت ہوتی تھی۔ میں احمد ندیم قاسمی کا ذکر ضرور چھیڑتا اور وہاں موجود لوگوں کی عام طور پر رائے ہوتی "اچھے شاعر ہیں مگر بہت زُود نویس" زود نویسی کوئی عیب نہیں ہے' میں کہتا۔ بلکہ گوئٹے تو اسی کو سچے شاعر کی پہچان بتاتا ہے۔ اس کے لفظ (ERSPRUNGLICH KEIT) کے یہی معنے ہیں اور وہ خود بھی کس قدر زود نویس تھا؟ مجھے محسوس ہوا کہ قاسمی صاحب کی زُود نویسی پر وہی لوگ اعتراض کرتے ہیں جن کی طباع طبیعتیں واقع ہوئی ہیں۔ پھر محسوس ہوا کہ ان کے کلام پر یہ اعتراض بہت ہی عام ہو گیا ہے اور شاید ان تک بھی پہنچا ہو جس کی بنا پر شاید اُنہوں نے نظم کہنا کم کر دیا یا پھر شائع کرانے سے گریز کیا۔ بہرحال معیاری رسالوں میں ان کی نظمیں کم ہی نظر آئیں۔ پھر بھی جہاں کہیں بھی ان کی کوئی نظم نظر آتی میں اسے شوق سے پڑھتا۔ اب میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ نئے شاعروں میں آخرکار دو سب سے اہم ٹھہرے' ایک فیض اور دوسرے احمد ندیم قاسمی۔ میں اکثر دونوں کا مقابلہ کیا کرتا ہوں اور میری رائے یہ ہے کہ قاسمی صاحب نے جدتیں فیض صاحب سے کم کی ہیں۔ مگر اسی بنا پر وہ بھٹک جانے سے بھی باز رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی شاعری زد میں فیض کی شاعری سے کم ٹھہرے مگر صحت اور نفاستِ کلام میں وہ فیض سے ضرور آگے ہیں۔ نہ وہ دوڑ کر چلتے ہیں اور نہ گر پڑتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک معیاری سطح قائم کر لی ہے۔ اور اس پر ان کے کلام میں وہ پختگی، متانت اور دلکشی آگئی ہے جو انہیں کا حصہ ہے۔ وہ غالب اور اقبال کے زمرے کے شاعر نہیں بلکہ میر اور میر انیس کی قسم کے شاعر ہیں۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں ایک آدھ دن کے لیے حیدرآباد آئے تھے اور ان کے اعزاز میں ایک محفل

ہوئی تھی۔ جسمیں انہوں نے اپنی بیاض سے ایک نظم پڑھی تھی۔ اِس نظم نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں سوچنے لگا تھا۔ کہ کچھ ذاتی وجوہات سے انکی شہرت فیض وغیرہ سے کم ضرور ہے مگر آگے چل کر انہیں ان لوگوں سے اونچا مقام ضرور دیا جائیگا۔

اِسی زمانے میں جب میں ان کی شاعری سے متاثر ہوا تھا میں نے "نقوش" میں ان کا افسانہ "ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" بھی پڑھا تھا اس سے زیادہ واقعاتی اور معنی خیز افسانہ اسوقت تک اُردو میں میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اور اب بھی شاید ہی اُردو کا کوئی افسانہ ہو جس کو میں اس پر ترجیح دینے کے لیئے تیار ہوں۔ ظاہر ہے کہ اسوقت اُردو کے مقبول ترین افسانہ نگار کرشن چندر تھے اور اب بھی ان کی مقبولیت کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ مگر میں ترقی پسند ادب کو ادب سے زیادہ صحافت کے دائرے میں رکھتا رہا۔ اور اس کی سب سے زیادہ نمایندہ مثال شاعروں میں علی سردار جعفری اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کو بتاتا رہا۔ قاسمی صاحب کا یہ افسانہ بھی کرشن چندر کے افسانوں کی طرح ایک دہشت ناک جدید واقعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ایک اخباری واقعہ کو دائمی زندگی سے اِس طرح وابستہ کر دیتا تھا اور وقتی قدروں کی دائمی قدروں کے ذریعہ اس طرح ترجمانی کر دیتا تھا جیسا کہ کرشن چندر کے بس کی بات نہ تھی۔ اِسی زمانے میں "نگار" میں میرا ایک مضمون نکلا تھا "ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے" اور اِس پر ادبی حلقوں میں جو زیادہ تر ترقی پسند لوگوں کے ہی تھے برابر بحث رہتی۔ میری غرض یہ ہوتی کہ صحافتی اُمور کو ادبی چیزوں کا موضوع بنانا ضرور چاہیئے مگر ان کو صحافتی درجہ ہی پر نہ چھوڑنا چاہیئے بلکہ وہاں سے آنا چاہیئے جہاں وہ وقتی دلچسپی سے بالاتر جا کر انسان کی زندگی کے دائمی پہلوؤں

کو سامنے آتے ہیں۔ ادیب کا کام اپنے دور کی زندگی کی ترجمانی اپنے دور ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر دور کے لیے کرنا ہے۔ اسی مثال میں ہیں ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد کو پیش کیا گیا تھا۔ ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر جاپانیوں کو شکست دینا دوسری عالمگیر جنگ کا شدید ترین واقعہ تھا۔ مگر احمد ندیم قاسمی نے اس واقعہ کا ہی نہیں بلکہ تمام جنگ کا اثر پنجاب کے دیہات کی زندگی پر دکھایا تھا۔ ایک گمنام نہایت معمولی گھر میں جو انقلاب آگیا تھا وہ ساری جنگ کی اشاریاتی ترجمانی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کی بربریت گاؤں کی زندگی میں اتر آئی ہے۔ اور صدیوں سے ایک ہی طرح پر قائم معاشرہ ایک عجیب چکر کھا کر رہ گیا ہے۔ ہیرو کا باپ انسان کے دوام کا نمائندہ ہیرو کی بیوی میاں کے مرنے کی خبر سن کر دوسرے مرد کی ہو جانے والی انقلاب کی نمائندہ اور ہیرو خود وقت کے ساتھ برباد ہو جانے والی انسانیت کا اشارہ۔ یہ سب مل جل کر گاؤں کی ایک چھوٹی سی دنیا میں زندگی کی وہ ترجمانی پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے سپاٹ واقعیت حقیقت میں ادبی واقعیت ہو جاتی ہے۔ اور اس لئے یہ افسانہ اس ادب میں اہم اضافہ ہو جاتا ہے جو پیدا تو وقت ہی سے ہوتا ہے مگر وقت سے اس قدر بالاتر ہو جاتا ہے کہ لافانی چیزوں میں جگہ پاتا ہے۔ اس طرح نہایت خاموشی کے ساتھ قاسمی صاحب چوٹی کے افسانہ نگاروں سے بھی اپنے مخصوص انفرادی طریقہ میں ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔

پھر میں نے ان کا تنقیدی مضمون "میرے بھی صنم خانے" پر پڑھا۔ اردو کے تنقیدی مضمون چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں مجھ سے پڑھے نہیں جاتے اور مشہور نقادوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کے مضمون کو میں پڑھنے بیٹھا ہوں اور کچھ ہی حصہ پڑھنے کے بعد کوئی نہ کوئی ایسی سرے سے

غلط کم علمی اور کم فہمی کی بات پر نہ آگیا ہوں کہ اِکدم غصہ میں آکر اس کو پٹخ نہ دیا ہو۔ قاسمی کا مضمون کافی طویل نہیں بلکہ بہت طویل تھا اور میں اسے شروع سے آخر تک بڑی محویت کے ساتھ پڑھتا گیا اور ختم کر کے ہی دم لیا۔ ہمارے نقاد شاعری پر تو کچھ کہہ بھی لیتے ہیں مگر ناول یا افسانے پر آکر وہ قلابازیاں کھاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ قاسمی صاحب کا مضمون ایک ناول پر تھا اور اس میں ناول کے فن سے جس صحیح واقفیت اور جس بالغ نظر کا مظاہرہ تھا وہ کہیں اور نظر نہیں آئی۔ عام طور پر جو لوگ تخلیق کے عادی نہیں اور محض کچھ علم کی بنا پر تنقیدیں لکھتے ہیں وہ منشی گیری سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہاں بھی وہ مثل صحیح آتی ہے کہ جو کرتا ہے وہ جانتا ہے۔ اس مضمون سے صاف واضح تھا کہ وہ شخص تنقید کر رہا تھا جس نے شاعری بھی کی ہے اور افسانے بھی لکھے ہیں اور ان کے گُروں سے عالم ہی نہیں بلکہ عامل کی حیثیت سے واقف ہے۔ میرا ایک فقرہ "منشیانِ تنقید" جو سب میں پہلے میں نے اپنی تصنیف "اُردو میں تنقید" میں استعمال کیا تھا اب کافی عام ہو گیا ہے اور اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ اس دائرے میں کون کون آتے ہیں۔ میرے یہ جواب دینے پر کہ وہ سب لوگ جو محض تنقید ہی کر رہے ہوں۔ یہ سوال ہوتا کہ پھر وہ کون جانتا ہے تو میں جواب دیتا ہوں "احمد ندیم قاسمی"۔

وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں جن کی یہ تخلیق تنقیدی شعور پر مبنی ہے اور جن کی تنقید تخلیقی عمل کا بھی ثبوت دیتی ہے۔ اِس معنے میں وہ مکمل مصنف ہیں یعنی اس دائرے کے جو پیدائشی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اُن کو اونچے درجہ پر اٹھانا بھی جانتا ہے۔ ایک افسانہ نگار نے مجھ سے پُوچھا "کیا آپ پہلے سے سوچ لیتے ہیں کہ فلاں افسانے کو فلاں اصولوں سے لکھوں گا اور بعد میں دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اصول برتے گئے ہیں؟" میں نے اِن کا جواب ایک سوال سے دیا: "کیا آپ جب اُردو

بولتے ہیں یا غیر زبان انگریزی بولتے ہیں تو آپ کو خیال ہوتا ہے کہ دلیر نے کون کون سے اصول برت رکھے ہیں؟" انہوں نے کہا "اس سلسلے میں یہ ہے کہ مجھے مختلف اثرات سے صحیح زبان بولنے کی عادت پڑ گئی ہے" میں نے کہا "یوں ہی تخلیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ چلنے کو سمجھ لیجیے ہم بھی اسی طرح رویں اگر رکھتے ہیں جیسے آپ گرامر یاد کر کے صحیح اصولوں پر چلنے کی عادت ہو گئی جیسے ہماری زبان کو صحیح گرامر سکھاتی ہے۔ میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا کہ ہمارے یہاں بے شمار لکھنے والے ہیں کہ پیدائشی مصنف مانا جاتا ہے اور اس وقت جب میں قاسمی صاحب کے تنقیدی شعور کی اہمیت جتا رہا ہوں۔ تو یہ سمجھ لیا جائیگا کہ میں انہیں اکتسابی فنکار بتا رہا ہوں ایسے فنکاروں میں آمد اور آورد ویسے آہنگ میں ہوتی ہیں کہ جدت طرازی میں ایک وقعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہیں سے فن میں عظمت کا دور شروع ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ٹھہراؤ اور توازن اور نرمی میں طوفان چھپا نظر آتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں ضرور ہیں جن کے تجسس کی موجوں میں کمال اضطراب ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک مخصوص رخ کی طرف چلا کر مفید عام بنانے کا بھی شعور ہے۔ ہمارے یہاں محض طبع زاد لکھنے والوں کی کمی نہیں مگر ہمارے ادب کیسی ادب کی ترقی کے لئے قاسمی صاحب سے ادیبوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے میں انہیں ماڈل ادیب مانتا ہوں۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ادیب کو انسانیت سے خارج مان کر خوش ہوا جاتا ہے اور اس معاملے میں بھی قاسمی صاحب عام معیار کے خلاف اتنے مکمل انسان اور انسان دوست ہیں جتنا کہ شاید ہی کوئی اور اردو ادیب ہو۔ انہوں نے ادیبوں کی پرورش کرنے اور ان کی مدد کرنے

میں جس خلوص اور نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے اسکے سب لوگ مداح ہیں۔ اپنی منہ بولی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کو جس طرح اُنہوں نے بالکل سگی بہنوں کی طرح رکھا وہ اِن کی سوانح کا ایک اہم باب رہے گا۔ اِس کے علاوہ بھی بہت لوگ اُن کے مرہونِ منت کہے جاسکتے ہیں۔ اِن کے دِل میں بہت بڑی جگہ ہے اور یہی اِن کی انسانیت کی بڑی دلیل ہے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اُنہوں نے کوئی ناول کیوں نہیں لکھی۔ آخری دفعہ جب میری ان سے مُلاقات ہُوئی تو میں نے کہا "آنگن" بڑی اچھی ناول ہے۔ مجھے اِس کی ایک جلد بھیجدیں۔ میں اِس پر سیر حاصل مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے مجھے بھیجدی اور میں نے مضمون لکھ دیا جو اُنہوں نے "فنون" میں شائع کیا۔ "آنگن" میں تجربہ اور تخلیقی قوت تو تمام تر خدیجہ مستور ہی کی ہیں۔ مگر مجھے خیال ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً قاسمی صاحب بھی اسے سُنتے ضرور ہونگے اور اس کے شعوری پہلو کو اس اعلےٰ پیمانہ پر لانے میں ان کی رائے کو ضرور دخل ہوگا۔ یہ بھی اِن کی ادیب دوستی کا اہم ثبوت ہے۔

وہ آجکل "فنون" کے ذریعہ ادب کی اہم خدمت کر رہے ہیں۔ میں اس پرچہ کے لِئے ہمیشہ لکھتا رہتا ہوں۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ میری لکھی ہُوئی چیزوں پر اُنہوں نے نہایت خلوص کے ساتھ کچھ ترمیم کرنے کی اجازت طلب کی۔ مجھے ان کے شعور اور خلوص پر اتنا اعتماد ہے کہ انہیں ہر قسم کی تبدیلی کر دینے کی پُوری اجازت دیدی ہے اور میں نے یہ دیکھا کہ ان کی رد و بدل سے میری تصنیف کی قیمت میں ضرور اضافہ کر دیا۔ میں دیکھتا ہُوں کہ مدیر کی حیثیت سے ادب میں وہ بہت ہی مناسب ڈائریکٹر یا مُصلح ہیں اور اس کام کو وہ جس انسانیت سے انجام دے رہے ہیں وہ انہیں کا حق ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

پیام مسرّت

مجلس اربابِ فن بھی قابلِ مبارکباد ہے اور جس کے اہتمام میں یہ تقریب ہو رہی ہے وہ بھی خوش قسمت و لائقِ ستائش ہے۔ مجلس اس لئے بھی قابلِ مبارکباد ہے کہ وہ مُردہ پرستی کی روایت پر خاک ڈال رہی ہے۔ اردو دنیا کے دامن پر یہ دھبّہ تھا کہ وہ "قدرِ مردم بعدِ مردم" کو اپنی قدردانی کا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ عہدِ حاضر کے شعراء و ادیب کو نظرانداز اسوقت تک کرتی رہتی ہے جب تک وہ اس دنیا کو نہ چھوڑ دیں جس کے لئے مرتے ہیں جس کی خدمت کے انہماک میں کبھی کبھی وہ مذہبی فرائض سے بھی بیگانہ وار گزر گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ مولویانہ اندازِ نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری دنیا ان ادب کے خدمت گذاروں کو تارک الصلوٰۃ ہونے پر سخت سزائیں دیگی۔ صورتِ حال یہ ہے تو غریب ادیب نہ اس دنیا کا رہا نہ اُس کا۔ مجلس اربابِ فن کے اس کارِ خیر نے کم از کم "اس دنیا" کی بے پرسی کے انداز بدلنے کی کوشش کرکے زندہ ادیبوں کو یہ اطمینان دلا دیا کہ وہاں جو کچھ بھی ہو، عالمِ بالا اپنی روایات بدلے یا نہ بدلے وضع داری میں ترمیم پسند کرے یا نہ کرے مگر ہماری یہ دنیا تغیرات کا گہوارہ اور ہمہ انقلاب زندہ باد کے قائل اس نظامِ کہن و روایاتِ فرسودہ کو حسبِ ضرورت بدلنے میں مسرت محسوس کرتے

ہیں۔ اور آج احمد ندیم قاسمی کی ادبی خدمات کو سراہنے کے لیئے یکجا بھی ہوئے ہیں۔ اگر عالم بالا ہماری اس کاوش میں دخل انداز نہ ہو تو ہم اور بھی ادیبوں کے لیئے ایسا ہی اجتماع کرتے رہیں گے۔

احمد ندیم قاسمی کو میں نے خوش قسمت اس لیئے بھی کہا کہ وہ انگریزی مقولہ "نبی کی عزت کبھی گھر پر نہیں ہوتی" کے دار و گیر سے بچ گئے بلکہ اس سیلاب کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اس قول کے برعکس اپنے وطن میں اجتماعی ستائش کے اہل سمجھے گئے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ وہ ان کو غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی توفیق نہ دے۔ لیکن چونکہ میری دعا اثر سے بیگانہ ہے' ڈر معلوم ہوتا ہے کہیں وہ درِ قبول سے واپس نہ کر دی جائے۔ اس لیئے احمد ندیم قاسمی سے یہ کہنا ہے کہ تم ہی سن لو اگر خدا نہ سنے۔ اگر آپ کی گوناگوں صلاحیتوں میں غلط فہمی بھی کوئی جزو ہو تو ایسے موقع پر اس کو کام میں نہ لائیے۔ راستے کو راستہ ہی سمجھئے اسے منزل سمجھ کر کہیں رک نہ جائیے گا۔

احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں تقریب کا ہونا اہل لاہور پر واجب الادا ہو گیا تھا۔ وہ ایک مدت سے اردو ادب کی ایسی خدمت کر رہے تھے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ نظم و نثر دونوں میدانوں میں کامیابی کے ساتھ وہ گامزن ہیں۔ جتنی ان کی نظموں میں گیرائی اور گہرائی ہوتی ہے اتنی ہی انکی نثر میں صاف گوئی و بیباکی۔ اور پھر ہمت کے سپاہی کی طرح یہ قلم کا سپاہی بھی نہیں تھکتا۔ کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا ہے۔ اس کی ذہانت اور وسیع النظری اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ نہ مواد کی کمی ہونے پاتی ہے نہ اس کی فکر ہوتی ہے کہ کب نظم کہی جائے، اور کس وقت نثر لکھی جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رہگذر کا ہر ذرّہ اس سے کچھ نہ کچھ کہتا ہے

کرتا ہے۔ اس کے بازارِ حیات میں ہر وقت جلال و جمال کی بارش ہوا کرتی ہے جس وقت جس چیز کا اثر اس ذہن پر طاری ہوتا ہے وہ بے تحاشا اس کو اپنی فنکاری سے نظم یا نثر بنا دیتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ وہ چیز خود متقاضی ہوتی ہو کہ میں اسلوبِ بیان کے کس جامہ میں جلوہ گر ہونا پسند کرتی ہوں اور قتیل کا سپاہی اس کے حسنِ طلب سے اتنا متاثر ہوتا ہو کہ تقاضا کو بھی ادائے حسن سمجھ کر مواد کو اسی پیکر میں پیش کر دیتا ہو جس کی خود مواد کو خواہش ہو۔ اپنی پسند کو جذبات کی تہ میں دبا دیتا ہو کیوں کہ وہ شاعر بھی ہے۔ کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا۔ بہرحال ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا کہ کیوں کسی بات کو آپ شعر بنا دیتے ہیں اور کس لئے کسی موضوع کو نثر کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو فضیل صاحب فی الحال آپ ہی میری طرف سے تکلیف کر کے ان سے یہ سوال پوچھ لیجئے مگر ان کو اجازت دیجئے کہ وہ جواب خواہ نظم میں دیں یا نثر میں ویسے میں خود اس سوال کا جواب کچھ سوچ سکتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں ذاتی طور پر ان سے واقف ہوں۔ وہ اس وجہ سے بھی نہیں کہ میں نے ان کا کلام دیکھا ہے اور اس کی نزاکت میری نظروں نے جاننے کی کوشش کی ہے۔ نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی ابتدائی زندگی جس انتشار اور پراگندگی میں گذری اس کو میری سرگذشتِ حیات سے بڑی مماثلت ہے۔ آپ نے میری سوانح حیات 'میری دنیا' ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ آپ میری زندگی کے اس رخ کو بھی دیکھ چکے ہوں گے۔ آپ میری اس بات کو دعویٰ بے دلیل نہ سمجھتے ہوں گے۔ اسی انتشار و پراگندگی نے مجھے لکھنے لکھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں بھی نثر اور نظم لکھ کر کچھ دل کو تسکین دینے کا عادی ہو چکا ہوں اس لئے سمجھ سکتا ہوں کہ کیوں اور کب کیا لکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے احمد ندیم قاسمی

کا جواب میرے تجربے سے الگ ہو۔ اِس لئے چاہتا ہوں کہ وہ اِس بات کو راز سربستہ نہ سمجھیں تو زمانے کو کچھ بتا دیں کہ کیوں اور کس وقت وہ نظم یا نثر لکھتے ہیں ۔

احمد ندیم قاسمی مختصر سی ادبی زندگی میں اُردو کی جتنی خدمت کر چکے ہیں وہ قابلِ رشک بھی اور قابلِ فخر بھی ہے ۔ رشک اِس لیئے کہ اور لوگ بھی محسوس کرتے ہیں کہ نظم و نثر سے ہم نے اب تک دنیائے اُردو کو کتنا آباد و شاد کیا تو ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ یہ خیالات کی بستی بسانے کی تو کوشش حسبِ توفیق ہم نے بھی کی مگر کوئی مقام ایسا نہ ملا کہ جو ہمارے نام کی نشان دہی کرتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تو شاد نہ ہو سکے ۔ ممکن ہے کہ بستی کے لوگ جب سارے کاموں سے فرصت پاتے ہوں تو ہمارے کلام سے چند لمحوں کی مسرت حاصل کر لیتے ہوں ۔ ویسے کہنے کو تو ہم نے بھی کافی کہا ۔ ہم بھی پُر گو تھے ۔ فنِ عروض سے بھی واقف تھے ۔ اشاعتِ کلام کے لیئے روپیہ بھی تھا ۔ تعریف کرنیوالے احباب بھی جام و مینا کے گرد اکٹھا ہو جاتے تھے ۔ مگر باوجود ان اوصافِ اضافی کے کلام کی ضخامت اور ہماری پُر گوئی "بہارستان" سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ ہماری فارغ البالی و بے فکری دُنیائے ادب میں داخل ہونے کا پروانہ راہداری نہ دلا سکی ۔ برخلاف اِس کے ندیم کی اُلجھنوں ، کوچہ گردی ، پریشاں حالی نے اِس کو بانگِ درا اور بالِ جبریل کے خالق سے قریب کر دیا ۔

اِن رشک کرنے والوں کو اِس کی کہاں خبر کہ جس کو اُنہوں نے ندیم کی زندگی کا انتشار سمجھا وہی تو اِس کی شاعری کی جان تھی جس کو اُنہوں نے کوچہ گردی سمجھ کر حقارت سے دیکھا وہی تو اِس کے مشاہدہ و مُطالعہ کا ذریعہ بن گئی ۔ اسی نے ندیم کو انفرادیت کا

مالک بنایا۔ یہ کون بتائے کہ فارغ البالی تعیش۔ دولت و ثروت ہر شعبۂ حیات میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے نہیں دیکھے جاسکتے۔ اگر حیات ابدی سے ہمکنار ہونا ہے تو مال و زر نہیں علم و فن کی سرپرستی حاصل کرنا ہے۔

دیرپا شہرت شادمانی خوش حالی کے بجائے خلوت کی بحالی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی اس لحاظ سے بھی قابل مبارک باد ہیں۔

سیّد احتشام حسین

احمد ندیم قاسمی — کچھ یادیں

مَیں نہ تو نادیدہ عشق کا منکر ہوں اور نہ پہلی نگاہ کی محبت کا، اور کیسے ہو سکتا ہوں جب کہ احمد ندیم قاسمی کے معاملہ میں خود اس جذبہ کا شکار اور اس حقیقت سے آشنا رہا ہوں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، نہ مَیں نے انہیں دیکھا تھا اور دیکھا تو آج تک نہیں ہے!) نہ اِن کی کوئی تصویر نظر سے گذری تھی اور نہ کسی مشترک دوست کے ذریعہ تعارف ہوا تھا نہ جب قاسمی جلال و جمال اور دشتِ وفا کے طُرّے آویزاں کر کے شاعری کے بازار میں اپنا مول بڑھانے آئے تھے اور نہ طلوع و غروب، آبلے، سناٹا اور برگِ حنا کے طبل و علم لیکر افسانہ نگاری کا میدان جیتنے نکلے تھے۔ سن بھی یاد نہیں، یہی بیالیس تینتالیس ہو گا کہ الطاف مشہدی کے مرتب کیے ہُوئے منتخب افسانوں کے مجموعے تازیانے میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ طلاقی مُہر نظر سے گذرا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی پھانس سی چُبھ گئی۔ معلوم نہیں قاسمی کے فن کا مطالعہ کرنے والے رئیس خانہ، ماتم، الحمد للہ اور سناٹا پڑھنے کے بعد طلاقی مُہر کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے لیکن میرے ذہن میں اس پہلے تاثر کی یاد اب بھی تازہ ہے، سچے تپے ہُوئے اور دمکتے ہُوئے سونے کی طرح جس پر زنگ نہیں لگتا!

شاید اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی ادب لطیف سے متعلق ہوگئے۔ یا شاید اس وقت ادب لطیف ترقی پسند ادب کا ترجمان سمجھا جاتا تھا اور کچھ نئے سے نئے ادیب اس سے وابستہ تھے۔ اب جو احمد ندیم قاسمی کا خط ملا   خط جو ایڈیٹر کی طرف سے ایک مضمون نگار کے نام نہیں تھا۔ ایک شاعر کا خط تھا شاعر کے نام، دوست کا دوست کے نام، قبیلے کے ایک فرد کا دوسرے فرد کے نام۔ خلوص کا خلوص کے نام۔ ایک خواب دیکھنے والے کا دوسرے خواب دیکھنے والے کے نام۔ ایک حقیقت جو کا دوسرے پرستار حقیقت کے نام ــــ تو اس نے اس نادیدہ عشق کو اور استوار کر دیا جس کا میں نے تذکرہ کیا۔ معلوم نہیں قاسمی کو یاد ہے کہ نہیں، میں نے انہیں لکھا تھا کہ آپ کا خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ہم سینکڑوں برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے مجھے نہیں معلوم لیکن کبھی کبھی ہوتا یہی ہے ذہن اور جذبے کے کچھ رشتے کے تار ایک دوسرے کو چھوتے اور قریب کرتے ہیں۔ کوئی نادیدہ نصب العین کی جستجو ہم طرز اور ہم خیالی پیدا کرتی ہے۔ اس وقت تک میں نے مشکل سے قاسمی کے کچھ افسانے، چند نظمیں اور قطعات دیکھے تھے۔ کچھ انہوں نے اور اس سے زیادہ فن کار کی ذات، اس کی شریفانہ محبت اور خطوں کے اندر سے آواز دیتے ہوئے خلوص نے گرویدہ کیا۔ مومن کا یہ شعر یاد آتا ہے :

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ جانیں صید کیا صیاد کیا۔

اگر خیالی وجود ہی سے دلچسپی لینا مقدر ہو۔ نہ ملاقات ہو نہ بات، تو اس کی تلافی یہی

صورت سے ہو سکتی ہے کہ اس کے وجود کے مظاہر کو مرکزِ توجہ بنایا جائے۔ قاسمی کی کہانیاں نظمیں اور غزلیں پڑھنے میں لطف آنے لگا۔ یہ ان کے تخلیقی ارتقار کا دور تھا اور وہ بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ دھڑکنیں چھپ چکی تھی۔ چوپال۔ بگولے اور طلوع و غروب کی اشاعت ہو چکی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طلائی مہر کا خالق زندگی کی وسعتوں اور پیچیدگیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ مخلصانہ افراد کے خوابوں اور خیالوں، حادثوں اور وارداتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُسے پنجاب کے دیہاتوں سے شاعرانہ بانکپن اور وفورِ شوق کی دولت ملی ہے، اس کے گداز دل نے اپنے گردوپیش کی دُنیا اور اس کے کرب والم کو محسوس کیا ہے اور اس نے وقت کو چلتے اور اپنی لپیٹ میں حالات کو تبدیل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ احساس کی سچائی کے بغیر ادب میں جان نہیں آسکتی اور زندگی کی رفتار کو اپنے تجربہ اور شعور کے آئینے میں دیکھے بغیر بیانِ واقعہ فن نہیں بن سکتا۔ قاسمی میں یہی سچائی اور اس کی طرف یہی انسانی میلان ہے جس نے ان کی فنکاری کو ہر لمحہ روشنی اور توانائی بخشی ہے۔

اُن دنوں میں برابر سوچا کرتا تھا کہ قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری میں کسے زیادہ اہمیت دی جائے۔ ایک دفعہ کوئی نظم ایک پلہ جھکا دیتی تو دوسری بار کوئی افسانہ ذہن کو دوسری جانب موڑ دیتا۔ اسی زمانے میں افسانوں کے مجموعے میں "گرداب" کا اضافہ ہوا۔ نظموں کا پلہ پھر ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور میں نے اس نئے مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اس تذبذب کا اظہار بھی کیا اور شاید کسی خط میں خود قاسمی سے بھی اپنی اس ترجیح کا ذکر کیا۔ یاد آتا ہے کہ انہوں نے جواب میں کوئی ایسی بات لکھی جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انہیں اپنی

شاعری زیادہ یادگار ہے کہ اپنے افسانوں سے بڑی پسند ہے۔ میں اس کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں صحت کی خرابی اور بعض دوسری وجوہ سے قاسمی ادبِ لطیف سے الگ ہو کر پھر انگہ میں قیام پذیر تھے۔ وہ اپنا مجموعہ "جلال و جمال" ترتیب دے رہے تھے شاعری کی فضا ان پر طاری تھی۔ اور نظمیں تھیں جن کی میں نے جان بنی ہوئی تھیں اس نے اگر انہیں ان دنوں اپنی نظمیں افسانوں سے زیادہ پسند تھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں نے بھی اس وقت کہ آپ کے تبصرے میں یہ بات جس طرح کہی تھی اس سے مفاہمت کی ایک صورت پیدا ہوتی تھی:

"ابھی کل کی بات ہے کہ احمد ندیم نے افسانے لکھنا شروع کیا۔ رسالوں میں افسانے دیکھے جو انہیں کے پہلو بہ پہلو ان کی نظمیں نظر آئیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل معلوم ہوا کہ قاسمی اچھے افسانہ نگار ہیں یا اچھے شاعر۔ پھر افسانہ نگار احمد ندیم نے شاعر احمد ندیم کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد یہ سوال بھی پیدا ہو رہا ہے کہ افسانہ نگاری نے ندیم شاعری کو نقصان پہنچایا یا شاعری نے افسانہ نگاری کو فائدہ؟ سو جس نے بھی احمد ندیم کے افسانے دیکھے ہیں وہ نہایت آسانی سے فیصلہ کر لے گا کہ ان افسانوں کا خالق شاعر بھی ہے۔"

یہ غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہوگی۔ اس کے بعد کچھ ویران دن آئے۔ جلنے، کڑھنے، اور خونِ دل پینے کے دن۔ زخموں اور جراحتوں کے دن۔ کچھ دنوں تک کسی کو کسی کی خبر نہ رہی پھر زخم اپنے نشان اور داغ چھوڑ کر اچھے ہو گئے یا خراب ہو کر ناسور بنے۔ حالات کسی قدر

رُوبراہ ہوتے تو یادوں کے بادل پھر گھرے اور برسے۔ مخلص چہرے پھر سامنے آئے، دِلوں کی دھڑکنیں پھر قریب سُنائی دیں اور کانپتے ہاتھوں نے پھر زندہ رہنے، محبت اور انسانیت کے راستے پر چلتے رہنے اور دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کے عہد نامے لکھے۔

قاسمی نے اطلاع دی کہ وہ ادارہ فروغِ اُردو لاہور سے نکلنے والے نئے ماہنامے "نقوش" کی ادارت کر رہے ہیں ـــــ تو گویا ارادہ اور عمل کی قوتیں بیدار ہیں۔ کام کا حوصلہ باقی ہے حالات بہتر ہو رہے ہیں اور فضا سازگار ہے! کچھ دنوں بعد "نقوش" کے امن نمبر کا اعلان ہوا ترقی پسندوں اور ان کی مخالف قوتوں کی صف آرائی کی خبر ملی۔ قاسمی کے مجاہدانہ سرگرمِ عمل ہونے اور مطعون کیئے جانے کے چرچے ہوئے اور آزادیٔ رائے کے لیے جیل جانے کا حال معلوم ہوا دل نے کہا یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا! ان حالات میں بھی وہ اُسی لگن اور تخلیقی جوش سے لکھتے رہے حالانکہ اب اُن کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے نقش بھی اُبھرنے لگے۔ تجربہ کی جھولی میں زندگی اصلی اور نقلی جواہرات اور زیادہ ڈال رہی تھی۔ لیکن اسوقت مجھے قاسمی کے دیہات ہی اچھے لگتے تھے شاید اس لیئے کہ مجھے خود بھی دیہات سے ایک باطنی ربط ہے، میری رُوح وہیں کہیں گندی گلیوں، کچے مکانوں، اُجڑے کھنڈروں ہریالے کھیتوں اور بگولے اُڑاتے میدانوں میں بستی ہے۔ طلائی مُہر کے پسند کرنے میں کیا یہ جذبہ شامل نہ رہا ہوگا؟ معلوم ہوتا ہے کہ قائم چاندپوری نے میرے ہی لیئے کہا تھا:

موافقت کی بہت شہریوں سے مَیں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

میں نے گرداب کے تبصرے میں کچھ اس کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ لیکن اب تو میں ذکر کر رہا ہوں تقسیم کے بعد کا، جب جلال و جمال اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور قاسمی کا قد بحیثیت شاعر کے بہت اونچا ہو گیا۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں ریڈیو سے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا:

"احمد ندیم قاسمی نے اپنے فنی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے جو تمہید لکھی ہے وہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے۔ اگرچہ انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سو فیصدی قابلِ قبول نہیں ہیں۔ مگر ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے نظموں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے رومانیت، غنائیت، حقیقت نگاری، انقلابی شاعری اور غزلوں کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں اور جس تنقیدی قوت کا ایثار کر کسی مخصوص طرزِ فکر کے ساتھ بہنے سے گریز کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور آزادیٔ فکر و صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے —— دس سال میں کہی ہوئی ان نظموں کے مطالعہ سے یہ پتہ آسانی سے چلتا ہے کہ احمد ندیم کے خیالات میں تغیر اور ارتقا کے کئی دور آئے ہیں اور ۱۹۴۴ء کے قریب وہ خیال اور اندازِ بیان دونوں میں ترقی کی اس سرحد کو چھو آئے جسے شاعری کی زبان میں پختگی کہا جاتا ہے۔ اس موڑ پر ان کے رومانی ابہام پر سماجی حقیقتوں کے سائے بھی منڈلاتے نظر آنے لگتے ہیں اور راستے کا موڑ جیسی نظم جنم لیتی

ہے۔ اس کا نام، اس میں چھپی ہوئی گہری انسانیت، اس کا تیکھاپن اور طرزِ ادا، ہر ایک میں رومانی شاعر کے اندر جنم لیتے ہوئے سیاسی شاعر کے وجود کا پتہ چلتا ہے — ان کے فن میں خامیاں بھی ہیں لیکن ان کی کوشش ایک سچے شاعر کی کوشش ہے — مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ جلال وجمال اُردو کے شعری ادب میں ایک اہم اضافہ ہے جس مجموعہ میں، پرتو، آرزو، کروٹیں، میری زمین، تسنیم کے نام، شکاری، ترکِ محبت کے بعد، حریتِ فکر، افشائے راز، شکست و ریخت، ردِ عمل، راستے کا موڑ، ماہتابِ فردا اور گریز ایسی نظمیں موجود ہیں، اس کے دلپذیر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے!"

یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کر دیا کہ قاسمی کی شاعری کے متعلق میرے اُسوقت کے تاثرات کا اندازہ ہو سکے اور یہ سطریں پُرانے کاغذوں سے نکل کر کہیں محفوظ بھی ہو جائیں۔

اس کے بعد میں باہر چلا گیا اور کچھ دنوں کے لئے رابطے ٹوٹ گئے۔ بس اتنا یاد ہے کہ قاسمی نے اپنی شادی کے سلسلے میں میری مُبارکباد کے جواب میں ایک طویل اور دلچسپ خط لکھا (افسوس کہ میرے بہت سے کاغذوں کے ساتھ یہ خطوط بھی ضائع ہو گئے) اور اپنی زندگی کے ایک نئے اور خوشگوار سفر کا ذکر کیا۔ یہاں سے نقوش کچھ دُھندلے ہیں۔ قاسمی اخبارات میں کام کرنے لگے۔ میں اُن کے افسانے بھی پڑھتا رہا اور نظمیں بھی لیکن باقاعدہ دَور اُسوقت شروع ہوتا ہے جب قاسمی نے کتابِ نُما اور فنون کا سلسلہ شروع کیا اور مجھے

پھر لیا گیا۔ اس درمیان میں میری نظریں اور بعض دقتیں اتنی بڑھیں کہ وہ جو زندگی کی ہر کڑی کو کھینچ تان کر دیکھ لینے کی عادت تھی وہ بھی جل گئی اور حالات نے کتابوں کی دستیابی اور ان کے مطالعہ کی راہ میں دشواریاں پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آبلے کے بعد افسانوں کا کوئی مجموعہ باقاعدہ نہ پڑھ سکا۔ حالانکہ جو افسانے جہاں بھی پڑھنے کو ملے پڑھتا رہا۔ شعلۂ گل نہیں دیکھ سکا لیکن جو نظمیں رسالوں میں پڑھیں دیکھتا رہا۔ دشت وفا کی خوب سیر کی اور اس میں ان ساری فکری اور فنی قدروں کو شگفتہ ہوتے دیکھا جنہیں میں ابتدا سے قاسمی سے وابستہ کرتا رہا ہوں۔

کیا افسانہ نگاری اور کیا شاعری، دونوں قاسمی کے ذہنی ارتقا اور تخلیقی لگن کی ایک دلکش داستان سناتی ہیں۔ وہی مشاہدہ کی گہرائی اور تازگی۔ وہی انداز کی فسونگری وہی اہم اور غیر اہم کا امتیاز۔ وہی رومانی دور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حقیقت پسندی، وہی گداز قلب اور وہی انسان دوستی، وہی احترام فن اور وہی انفرادی انداز نظر — ایک اچھے شاعر اور افسانہ نگار، ایک اچھے دوست اور اچھے انسان کی ساری خوبیاں قاسمی میں جمع ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں پنجاب کے دیہاتوں نے، ماحول کی کشمکش نے، پیرزادگی کے اخلاقی تصور نے، علم و آگہی کی پیاس نے اور انسانی محبت کے احساس نے جو کچھ دیا ہے وہ اس کے حسین اور توانا پہلوؤں کو اپنے افسانوں اور اپنی نظموں کے ذریعہ عام کر رہے ہیں۔

مجھے مسرت اور اعتماد ہے کہ اس تائید محبت میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے!

یہ مختصر سی تحریر محض اظہارِ عقیدت کے لیے لکھ رہا ہوں، یہ نہ تو ندیم کی زندگی کی تصویر ہے، نہ ان کے کلام اور فن کا پورا جائزہ ہے۔

عقیدت کا ذکر کیا ہے تو یہ بتانا ضروری ہو گیا کہ احمد ندیم قاسمی سے میرے نیاز مندانہ اور دوستانہ مراسم بھی ہیں۔ ان روابط کے سلسلے میں اقدام اور استحکام زیادہ تر ان کے خلوص کی وجہ سے ہوا ——— میں عادتاً دیر آمیز اور کم آمیز آدمی ہوں۔ عقیدت ہو تب بھی ظاہر کم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ گمان بھی ہونے لگتا ہے کہ میں بے تعلق ہوں حالانکہ ایسا ہوتا نہیں۔

ندیم صاحب جب "امروز" کے مدیر مقرر ہوئے تو ایک دوست کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ پھر زمانے گزر گئے تاآنکہ اورینٹل کالج کی مشکلات نے پریشان کیا اور مجھے اس کالج کو بچانے کے لیے تگ و دو کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں جن احباب نے سب سے زیادہ دستگیری کی ان میں ندیم اور فیض میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ان کی مہربانی سے "امروز" اور پاکستان ٹائمز کی قلمی تائید حاصل ہوئی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ علومِ مشرقی کے حق میں رائے عامہ کی تنظیم انہی کی بدولت ممکن ہوئی۔

اس زمانے میں میں نے مدیر "امروز" احمد ندیم قاسمی کو مسلسل خط لکھے جو "امروز" میں چھپتے رہتے۔ تعجب یہ کہ ماہنامہ "اوراق" اور ادبیات بارے سے ملتے ہوئے یہ خطوط ان دنوں چھپ جاتے تھے، حالانکہ ان میں کوئی خاص بات نہ ہوتی تھی۔ قدرے دردمندی ضرور ہوتی تھی۔ مگر وہ شاندار پذیرائی جو "امروز" کے کالموں میں میسر آتی تھی خود میرے لئے باعث تعجب تھی۔ اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے آزاد شخصی انشائیہ نگاری شروع کی جس میں کچھ تخیل اور کچھ حقیقت — باہم مل کر، تاثراتی واقعاتی نہج سے آ جاتے تھے   یہ راستہ بھی ندیم نے ہی دکھایا۔

ندیم سے میری ملاقات اب بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر غائبانہ ربط بدستور ہے۔ ندیم دوستی کے مسلک میں بڑے پکے آدمی ہیں۔ اور اس معاملے میں معمولی سا تغافل بھی انہیں برہم کر سکتا ہے۔ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہوا ہے۔۔۔ میں نے بے حد کوشش کی ہے کہ ان کے دل پر اپنا نقش بٹھائے رکھوں ..... میں نے ایک خط میں جس کا عنوان "احمد ندیم قاسمی کے نام نا تمام خط" قائم کیا ہے ..... اور اب وہ میرے مضامین کے ایک مجموعے "درخت اور دریچے" میں چھپ بھی رہا ہے ایسے ہی ایک لمحے کا ذکر کیا ہے۔

یہ تو رہا روابط کا قصہ ..... یہ اس لئے ضروری تھا کہ یہ تحریر "سوغاتِ عقیدت" کے لئے لکھی جا رہی ہے۔ اب مختصراً ندیم کے کلام کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتا ہوں — تاثر میں نے اس لئے کہا ہے کہ تنقیدی مسند بے شمار تعلق پہلوؤں کے باوجود، بالآخر ذاتی تاثر ہی کا سوال بن جاتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کے بارے میں ہر قسم کے سوال اٹھائے جا سکتے ہیں۔ سماجی

عمرانی، فلسفیانہ، معاشرتی، تہذیبی۔ مگر ان کی قدر و قیمت کی بات کرتے وقت فیصلہ بالآخر ذاتی تاثر ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے یعنی بڑا سوال یہی ہوتا ہے :۔

کہ "میں اس شاعر سے کہاں تک متاثر ہوا۔ یا مجھ پر اس شاعر کے کلام کا کیا اثر ہوا؟"

یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ اگر میں متاثر ہوا تو کیوں ہوا یا کن کن وجوہ سے (یا مواد و اسلوب کے کس رُخ سے) میں متاثر ہوا۔ مگر یہ مسئلہ تاثر کے بعد آتا ہے اس کے جواب میں عقلی، عمرانی اور فلسفیانہ رُخ نکالے جا سکتے ہیں مگر ذاتی تاثر سے بچ نکلنا شاید (بلکہ یقیناً) ممکن نہیں۔

سو اہم سوال یہ ہے کہ مجھ پر ندیم کی شاعری کا کیا اثر ہوا؟ —— یا کیا اثر ہوتا ہے، سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ندیم کے کلام کو پڑھ کر عموماً میرے خیال میں اس شاعر کی ایک تصویر اُبھرتی ہے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں —— سیپیاں چننے والا —— فکرمند مگر متبسم —— جگنوؤں سے کھیلنے والا —— چاند تارے سے ہم کلام ہو کر اندھیروں کو بھگانے والا۔ سحر، آفتاب اور دن کا جویندہ۔ ندیوں کے کنارے پھرنے والا مگر شہروں کی زندگی اور اس کے مسئلوں سے پھر بھی غافل نہیں ؎

صُبح کو راہ دِکھانے کے لیئے
دستِ گُل میں ہے دِیا شبنم کا

شبنم کا چراغ ہاتھ میں لیئے ہوئے یہ شخص شہر اور کوہسار میں گھوم جاتا ہے اور بام و در سے یہ آواز سُنائی دیتی ہے ؎

دوستو آؤ قریب آ جاؤ   آ کے دیکھو تو سہی

ایک حلقے میں تھی آنکھوں کو ۔۔۔ لا کے دیکھو تو سہی

شاید آواز پہ آواز آسکے

گا کے دیکھو تو سہی

غرض یہ سیپیاں چننے والا "گا کے دیکھو تو سہی" کی دعوت دیتے ہوئے خود بھی گاتا ہے اور اپنے زمانے کو بھی اس عمل پر ابھارتا ہے ۔۔۔ اس کی آواز میں خوف کے آثار بھی ہیں مگر اس کی دعوت کی تاثیر یہ ہے کہ بھیانک وادیاں اور خوفناک ظلمتیں بھی حسین معلوم ہونے لگتی ہیں

ــ نظر افروز ہے پکتے ہوئے کھیتوں کا شباب

ــ اور دل دوز ہے اجڑی ہوئی فصلوں کا سماں

آندھیاں ہانپتی ہیں جیسے گھنے جنگل میں

گنگناتی ہے اسی طرح گلستاں میں نسیم

ندیم کی شاعری سے یہی دو تاثر بیک وقت ابھرتے ہیں۔ وہ متضاد حقیقتوں کی لو دکھا کر اپنے قاری کو اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ یہ باور کراتا ہے کہ زندگی کے دو پہلو لازمی ہیں ــ

شب حقیقت ہے مگر اس کے بھی دو پہلو ہیں

چاند نکلا ہے سرِ کلبۂ احزانِ ندیمؔ

دوسرے الفاظ میں زندگی کے راستے تضادوں کے ٹکراؤ سے کھلتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ اس کی علامتوں میں چاند اور تارے کے ساتھ ساتھ تیرگی اور ظلمت کا ذکر بار بار آتا ہے۔ رات اور دن کا مقابلہ بھی ہے اور زندگی کی کل حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں ترقی کی منزلیں دوامی جدل کی رہینِ منت ہیں ؎

آدمی کے ارتقا کا مدعا

وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفان ہی لائیگا سحر

آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

مجھے ندیمؔ کے کلام میں دو آوازیں سنائی دیتی ہیں ـــــ یا یوں کہیئے کہ دو دھڑکنیں (رم جھم) سے لیکر جلال و جمال، شعلۂ گل اور دشتِ وفا تک ـــــ ہر جگہ مجھے دو ندیمؔ نظر آتے ہیں ایک ندیم وہ ہے جو ایک نظریئے کا داعی اور مبلغ ہے۔ اسمیں وہ فکر اور سیاسی حقائق کی زبان استعمال کرتا ہے اور اس طرح گفتگو کرتا ہے جس طرح ایک نظریئے کے سلسلے میں ہونی چاہیئے۔ دوسرا ندیمؔ وہ ہے، جو افسانے بُنتا ہے۔ لفظی تصویروں کی مدد سے کہانیاں سُناتا ہے۔ وہ تصویریں بھی بناتا ہے اور بعض اوقات تصویروں پر نغمے کی چاندنی بھی بکھیر دیتا ہے۔ یہ افسانہ خواں اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے والا، اور حقیقتوں کو خوابوں کی شکل دینے والا ـــــ مصور یا رامش گر یعنی نغمے اُبھارنے والا ـــــ ندیمؔ

میں حقائقِ زندگی سے نفور نہیں ہوں، میں ان شاعروں کی بھی قدر کرتا ہوں جو محض نظریوں کے ترجمان ہیں۔ مگر نظریوں کی قدر، نظریوں کی قدر و قیمت کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شاعر کسی نظریئے کا ترجمان ہے تو یہ بھی بہت اچھی بات ہے۔ (اگرچہ اس کی اچھائی برائی کا فیصلہ دوسری بنیادوں پر ہوگا)، مگر مجھے اس سے زیادہ یہ دیکھنا پڑے گا کہ شاعر نے تصویریں کیسی بنائیں

دوسری شکل گویا یہاں تک ادراک یہ ہے کہ فطرت میں کہ جو شاعر تصویر نہیں بنا سکتا وہ شاعر نکما ہے جو شاعر موسیقی پیدا نہیں کر سکتا وہ شاعر نہیں کچھ اور شے ہے۔ میں شاعری میں ان دو باتوں کے علاوہ اگر کسی اور چیز سے دلچسپی رکھتا ہوں تو اس سے، اور یہ بہت بڑی بات ہے، کہ اس ساری نظم و غزل میں شاعر خود بھی کہیں ہے یا نہیں؟ ...... اس کا دل بھی کہیں نظر آتا ہے یا نہیں ——

اس کی نئی شخصیت میں مضمون ہے میرے یہ خیالات کافی وضاحت سمجھے جائیں۔ مگر نظریے کی قدر کرتے ہوئے بھی میں نظریے کو شاعری کا حصہ نہیں مانتا۔ ہر چند کہ نظریے کا احترام اپنی جگہ درست ہے اور میں نظریوں اور عقیدوں کے احترام میں کسی سے پیچھے نہیں۔

ندیم کی شاعری کا سماجی حصہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس طرح جب ندیم کو ایک بلند پایہ شاعر کہتا ہوں تو اس کے سماجی حصے کی وجہ سے نہیں (ہر چند کہ آخری فیصلے میں اس کا بھی کچھ حصہ ہوگا) بلکہ اس وجہ سے کہ ندیم کے کلام میں خود ندیم بھی موجود ہے۔ اس کا دل، اس کا اپنا دل بھی اس میں باندازِ خاص دھڑکتا دکھائی دیتا ہے —— اور اس وجہ سے کہ ندیم تصویریں بھی اچھی بناتا ہے ...... اور یہ اس وجہ سے بھی کہ اس کی تصویریں ایسے نغموں سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتی ہیں جو قاری کے تخیل میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں۔

میں ندیم کے کلام میں یہ ڈھونڈتا رہتا ہوں کہ اس میں ندیم خود بھی کہیں بول رہا ہے یا نہیں (جس طرح اس کے افسانوں کے مطالعے میں بھی میں اس کے سماج کو کم مگر خود اس کو زیادہ ڈھونڈتا ہوں) اس جستجو میں مجھے اصلی ندیم اکثر مل بھی جاتا ہے۔

یہ ندیم حسن کا دلدادہ ہے۔ زندگی کا جلال و جمال اسے مرعوب بھی کرتا ہے اور مسحور بھی کرتا ہے مگر زندگی کا حسن اس کے قلب پر کچھ اس طرح ضوفگن ہے کہ اس کی شخصیت کے تار و پود اس سے منور دکھائی دیتے ہیں ؎

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے ،
اس سیلِ جمال کے سہارے
ماضی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے

چاند ندیم کا خاص استعارہ ہے (تارا یا ستارا بھی اس کا خاص لفظ ہے مگر چاند اور ستارے کا مرجع الگ الگ ہے، چاند سے مراد مرکزِ حسن موضوعِ حسن اور انجم سے مراد حسن کا جوئیندہ خود ندیم) بہرحال چاند کے استعارے سے حسن کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس کا تصور دلایا ہے ـــــ اس بند میں تخئیل کو لفظوں سے ماورا بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ بہت سی یادیں زندہ ہو جاتی ہیں ـــــ با دلیئر پر لکھنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اصل شاعری کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یوں لگے گویا کوئی کھوئی ہوئی شے پالی ہے ـــــ دل میں نئے احساسات ابھار۔ یہ محسوس ہو کہ کوئی شے آس پاس تھی۔ اس کو دیکھ لیا ہے۔ اندھیرے میں کوئی دیا ابھر آیا ہے۔ گنجان صنوبروں کے پیچھے، اک چاند ہزار، چاند بن کر، تاروں کی طرح بکھر گیا ہے۔

ندیم قاسمی کا شاعر اگر ہے تو منافی بات ہے۔ مگر مجھے تو اس کا یہ دوسرا روپ کچھ زیادہ ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ انکار و حقائق بیان کی بات بھی کہتا ہے۔ انسان کی محنت، انسانیت کے احترام کی باتیں بھی کرتا ہے ور تیں اور انقلاب کا ذہنی جنم بھی ہے ـــــ تاریخ و تہذیب کے حقائق بھی بیان کرتا ہے ... مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں کم از کم میرے لئے اوپری اوپری ہیں۔ وہ اپنی شاعری پر زبردستی کس رہا ہے

• ذہن و بدن میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں

• خود کو دیکھ رہے معیار کے آئینے میں

ـ تاریخ کے بدلتے نشانوں میں
تہذیب کے سلسلے رواں ہیں

ـ تاریخ کی آگ جل رہی ہے
اک اور زباں نکل رہی ہے

• پل پل میں تاریخ چھپی ہے گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیم

خط کشیدہ الفاظ حقائق کی زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں نظریئے نے مجبوری پیدا کردی ہے۔ ان الفاظ نے فضا بنانے میں، کھوئے ہوؤں کی یاد ابھارنے میں، تصویر پیش کرنے میں اور نغمہ ابھارنے میں کچھ حصہ نہیں لیا۔

• مگر شاعر ندیم بھی بہت نزدیک ہوتا ہے۔ وہ اکثر نظموں میں رونما ہوتا ہے۔ نظم "سوچتا ہوں" ملاحظہ ہو :-

میری کھڑکی کے شیشے پہ پھولوں کی اک بیل انگڑائیاں بنتے بنتے رُکی
اک حسینہ سمندر کی دھوئی ہوئی ریت سے سیپیاں چنتے چنتے رُکی
اوس کے چند موتی جو پھولوں کے ماتھے پہ جھومر کی مانند رخشندہ ہیں
بیل کی بے حسی سے ہیں بے بس مگر کتنے محجوب ہیں کیسے شرمندہ ہیں
سوچتا ہوں۔ اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چپ چاپ مر جائیں گے؟
میرے ویران کمرے کے یہ قمقمے کیا یونہی تیرگی میں اُتر جائیں گے؟

یہ حسین سے حسین تر کی طرف سفر ہے۔ اس میں فکر زندگی کی خشک اور بے آب و گیاہ دُنیا کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ ان مرغزاروں کی طرف لے جاتا ہے جن کی تخلیق صرف حقیقی شاعر ہی کر سکتا ہے۔ اور پھر اس سوال کی بھی تو داد دیجئے :

سوچتا ہوں، اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چپ چاپ مر جائیں گے؟

اِس کا جواب قدرت کے ذمے ہے۔

میں انسانی دکھ درد کا پجاری ہوں ـــــ مگر غمِ انسان کی اجتماعی آواز والی شاعری بڑے غور و فکر کی محتاج ہے ـــــ اہم سوال تو یہ ہے کہ غمِ انسان کا مسلک محض فکری چیز ہے، یا انسانی دُکھ کے گہرے تجربے سے اُبھرا ہے۔ غمِ انسان محض نظریہ ہے تو ایک اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی حقیقت کی حد تک ہی قابلِ قدر ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کا دکھ سہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ کئی ابوبکر شبلی کئی گوتم بدھ، کئی میرؔ کئی دوستوفسکی اس وادی میں آئے اور غمِ انسان کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔

پس جب صورت یہ ہے تو کیسے معلوم ہو کہ کسی شاعر کے ہاں یہ غم محض نظریاتی نہیں بلکہ ایک رُوحانی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے گہرے احساس سے ابھرا ہے ؎

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دلِ پُرخوں نِکلا تھا

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندیم کے یہاں یہ رُوحانی تجربہ موجود ہے جس طرح میر کے یہاں "نگر کی ویرانی" اور "بجھے چراغ" کے استعارے اس کے رُوحانی تجربے کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی طرح ندیم کے یہاں بھی اس کی دریافت کی کلید موجود ہے ؎

میں بظاہر اک بھنور ہوں چیختے بے بات کا
لیکن اک بپھرے ہوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

بپھرے ہوئے طوفان کا یہ ساحل کہاں ہے؟ یہ اس مقام پر ہے جہاں شاعر شکست کے گہرے احساس میں ڈوب کر پھر ابھرنے کی کوشش کرتا ہے ـــــ شکست کے گہرے احساس سے دبتا نہیں، مگر یہ احساس اس کے دل میں موجزن ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں دل کو دوسرا دل نظر آتا ہے۔ الم کے قلزم میں غوطہ زن ہوئے بغیر الم کی حقیقت کون جان سکتا ہے اس بپھرے ہوئے طوفان کا ساحل یہیں کہیں ہے ؎

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ

اپنے لہو سے بھرے ہوئے چراغوں کے بغیر یہ ساحل نظر نہیں آسکتا۔

یہ دردمندی ہے — غمِ انساں کے بیکراں سمندروں میں شناوری سے پہلے اپنے لہو اور اپنے لہو کے چراغوں کی روشنی لازمی ہے — نظریاتی انسان دوستی محض خیال ہے اپنے لہو کے چراغ جلانا تجربہ، روحانی تجربہ ہے — مگر پھر بھی ابھی دیکھنا ہے کہ انسان کسی اور کے دُکھ سہنے کی طاقت رکھتا بھی ہے یا نہیں؟ بہرحال ندیم شکست کی برکتوں سے آشنا ہے اور اس کے لیے غمِ انسان سے ہمدردی کرنے کا دعویٰ ممکن معلوم ہوتا ہے!

مَیں یہاں قدرے نظریاتی بحث میں اُلجھ گیا ہوں۔ مَیں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ مجھے یہ بتانا تھا کہ ندیم شاعر بھی ہے اور انسان بھی ہے — اور انسان سے مراد یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے دل کے لیے جگہ ہے، اس کا دل دوسرے کے لیے تڑپ سکتا ہے۔ انسان دوستی کے لیے یہی کافی ہے — اور کافی کیا، کافی سے زیادہ ہے — اور کافی سے زیادہ اس لیے کہ دُنیا جہان کے غموں کی بات، صرف کہنے کی بات ہے ورنہ کون اس غم کو برداشت کر سکتا ہے — میری بھی یہ بات مجھے کچھ اوپری معلوم ہوتی ہے۔

دین و دل کے غم کو آساں ناتواں مَیں لے گیا
یا محبت کہہ کے یہ بارِ گراں مَیں لے گیا

تو کہنا یہ ہے کہ ندیم شکستِ غم اور غمِ شکست سے آشنا ہے اور اسی سے اس کی انسانیت اور انسان دوستی اُبھری ہے — یہ اس کا مرتبہ ہے مگر اس مرتبے میں اس کی شکستِ غم کے علاوہ اس کی شاعری بھی حصّہ دار ہے۔ اور شاعری سے یہاں مراد تصویر سازی اور جادوگری ہے۔ تماشا بھی چیز نہیں مگر ادب اور صنعت سے کہہ سکتا ہوں کہ ندیم نے

بہتر معنی رہتے۔ اور ان میں فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ فیض استعارات کو لپیٹ کر اور سکیڑ کر جھلک دکھاتا ہے۔ ندیم (شاید افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے) استعارے میں پھیلاؤ کا میلان رکھتا ہے۔ دونوں میں مزا ہے۔ مگر فیض کو ڈھونڈنا پڑتا ہے (شب گزیدہ سحر میں آپ نے تجربہ کیا ہوگا) اس کے برعکس ندیم آسانی سے اپنی تصویر کی جزئیات تک دکھا دیتا ہے۔ ڈی سیلن کورٹ نے کینٹس پر لکھتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ اچھا شاعر اپنی تصویروں میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ اچھا شاعر مجرد کو محسوس و تجربہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ مجہول و مبہم کو معلوم اور واضح بنا کر پیش کرتا ہے۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ بعض اوقات شاعر کو اپنے موضوع اور محل کی مجبوری سے اُلٹا سفر بھی کرنا پڑتا ہے ـــ ہاں یہ طے ہے کہ عام قاری تک رسائی کے لئے مجرد سے تجربے کا سفر سہل بھی ہے اور کامیاب بھی) ـــ ندیم بھی افکار و حقائق کو تصویروں میں مجسم کرتا ہے۔ اس کی یہ تصویریں گا بھی ہوتی ہیں، گنگنا رہی ہوتی ہیں مگر وہ ڈی سیلن کورٹ کے مشورے کا پابند نہیں۔ میرے نزدیک ندیم کی بہت سی عمدہ تصویریں وہ ہیں جن میں وہ واضح سے مبہم کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس ابہام سے وہ ان خوابوں اور خیالوں کا تصور دلاتا ہے جن کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ تخیل کے لئے بیکراں ہیں مگر یہ التزام حقیقت اور وضاحت سے اس طرح لپٹا ہوا چلتا ہے کہ اسے حقیقت کا مسخ بھی نہیں کہہ سکتے ـــ

ایک روندی ہوئی فصل گل کی طرح
چاندنی شاہراہوں پہ سوتی ہوئی

اک لوٹی ہوئی سلطنت کی طرح
ایک شے دوسری شے میں کھوئی ہوئی

یہ ساری نظم جس کا عنوان ہے "شام کب آگئی" اسی ابہام حقیقت کشا کی آئینہ دار ہے نظم "میں سوچتا ہوں" (ایضاً) نظم "فکر" (ایضاً)۔

ندیم کے یہاں ترقی پسند اور علامت پسند شاعروں کے استعارے بھی آتے ہیں مگر وہ مقلد نہیں۔ رینگتی ہوئی دھوپ اور سسکتے ہوئے سائے اور چیخنے جذبات اس کے یہاں تجربہ و مشاہدہ ہیں، روایات نہیں۔

ندیم نے زبان کو آزادی بھی دی ہے۔ مگر مادر پدر آزادی نہیں دی۔ وہ فکری زبان استعمال کرجاتا ہے مگر اس کی تلافی کے لیے کافی شاعری بھی کرتا ہے، خاصی مصوری بھی کرتا ہے۔ کافی موسیقی بھی دیتا ہے۔

ندیم نے غزل اور نظم کے مابین فاصلوں کو بھی کم کیا ہے ـــــ بعض اوقات غزل لکھ کر عمدہ نظم کے نمونے پیش کرتا ہے اور بالعکس بھی ـــــ مگر مجموعی طور سے وہ شاعری کی خدمت کرتا ہے، اصناف کی اصطلاحی قیدوں میں مقید نہیں ہونا چاہتا۔ غزل بھی اچھی کہتا ہے نظم بھی اچھی ـــــ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ جذبے کی تصویر کس طرح اچھی بنتی ہے۔ اور ہمیں بھی اصطلاحوں کے پیچ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے قطعے اور رباعیاں ـــــ مختصر کہانی کے شاعرانہ سانچے ہیں مگر خود ندیم کو اس کا اقرار نہیں ـــــ اس کا بیان ہے کہ میں نے آہستہ آہستہ یہ اہتمام ترک کر دیا ہے

رم جھم کے پیش لفظ میں اس نے یہی بتایا ہے ۔

۱۹۲۵ء کے بعد کی شاعری میں نظم کو آگے بڑھانے اور غزل میں نئے زمانے کی روح سے آشنا کرنے کا کام کئی شاعروں نے کیا ہے ۔ مگر ندیم کی آواز اور ندیم کا فن منفرد ہے ۔ وہ اچھا شاعر بھی ہے اور اچھا انسان بھی —— اور جو لوگ ان دونوں باتوں کی حقیقت جانتے ہیں وہ تصدیق کریں گے کہ میری نظر میں اس کا رتبہ کیا ہے !

سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد جن دو تین شاعروں کی شاعری میں کوئی کھوئی ہوئی شے ملتی ہے ان میں ندیم بھی ہے ۔ اسکی شاعری میں فکر کی شوکت بھی ہے مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ فکر کی گھن گرج کے اندر یا اسکے سایہ میں چاندنی بکھیرتا رہتا ہے ۔ چاندنی کی یہ کیفیت کسی اور کے یہاں نہیں ملتی ۔

اختر اورینوی

احمد ندیم قاسمی

خودستائی بہت بُری چیز ہے۔ لیکن حقیقت بیانی بھلی بات ہے۔ اگر یہ بات کہی جائے کہ شبلی، حالی اور اقبال کی روایتوں کو ہماری نسل نے نئی زندگی اور شگفتگی دی تو غلط نہ ہوگا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پریم چند اور مرزا رسوا کے سرمایہ کو ہمارے دور کے ادیبوں نے چمکایا۔ تو یہ حق بات ہوگی۔

ایک دفعہ مجاز نے کہا تھا :

ع عندلیب شادانی تیرا دم غنیمت ہے
اور تجھ سے کچھ ہی کم میرا دم غنیمت ہے

ہماری نسل کے ادیب بزرگوں کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھ سکتے ہیں۔ اور کئی جہتوں سے اِس میں ادب کا پہلو بھی موجود ہے۔ میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ اُردو افسانہ نگاری اور ناول نگاری بزرگوں کے دَور سے آگے نکل گئی۔ ہاں شاعری کے میدان میں اقبال جیسی قدآور شخصیت اب تک کوئی نہیں اُبھری۔

احمد ندیم قاسمی اُردو کے ایک جلیل وجمیل فنکار ہیں۔ اور یہ ہماری نسل کی ادبی کہکشاں

کے ایک بہت ہی تابان ستارہ ہیں۔ افق پر اگر صرف ایک ستارہ چمک رہا ہو تو اس کی روشنی آنکھوں میں کھٹکتی ہی ہے۔ لیکن اگر کوئی تارہ ستاروں کے جھرمٹ میں بھی بہت ہی درخشاں نظر آئے تو اہل نظر اس کو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ندیم ایک اختر درخشاں ہیں۔

مجھے بڑی مسرت ہے کہ پاکستان کے فنکار ندیم کی پچاسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ اردو کا ادیب ہندوستان اور پاکستان کا متحدہ سرمایہ ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اردو کے ذریعے ہند و پاک مفاہمت ہوگی۔ زندہ باد اردو! زندہ باد ہندوستان! زندہ باد پاکستان! میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ؎

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ابھی ابھی ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے ایشیائی ملکوں کے متحدہ بازار کی تجویز پیش کی ہے۔ اردو بازار تو متحدہ پہلے سے ہے۔ مسابقت اور رقابت تو ہر بازار میں ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کا ادبی اتحاد ہمارے سیاسی اور معاشی اختلافات سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط ہے۔

محمد طفیل بھی عجیب شخصیت کے مالک ہیں۔ ہیں تو ویسے کاروباری مگر فنکاری بھی جانتے ہیں اور دل داری بھی۔ بازار ادب میں انہوں نے اردو کا بھاؤ بہت بڑھایا ہے۔ پرسوں ان کا خط آیا اور انہوں نے ایک ادبی کمیٹی کی تشکیل کی خبر دی ہے۔ میں نے خوب سمجھ لیا کہ یہ گل انہوں نے ہی کھلایا ہے۔ بہتوں کو انہوں نے رسوا کیا ہے۔ اب بیچتے جی حضرت احمد ندیم کو بھی رسوا سربازار کر کے رہیں گے۔ ندیم قاسمی اس رسوائی کے مستحق ہیں۔ بازار حسن میں آواز لگی

کرنے کا نتیجہ اور کیا ہوگا۔ لیلائے ادب کے لیئے وہ مجنوں بنے ہیں تو لوگ پتھر پھینکنے لگے ہی۔

محمد طفیل نے لکھا کہ میں احمد ندیم قاسمی کی فنکاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں۔ اور اگر اپنی کم توفیقی کی وجہ سے مفصل نہ لکھ سکوں تو چند صفحات میں ہی "ٹرخا دوں"۔ بڑا ظالم ہے طفیل، اس نے میری دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔

لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر اور محمد طفیل کو غیر حاضر جان کر یہ قسم کھاتا ہوں کہ ٹرخانے والی بات پر میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے۔ میں آلسی ہوں، کاہل ہوں، آرام طلب ہوں، بہت برا ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ اپنے ایک ہم عصر ادیب جلیل کی فنکاری کے متعلق مفصل اعتراف پیش نہ کروں۔ مگر کہتا ہوں "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"۔ دس پندرہ دنوں سے "لمباگو" کے درد میں مبتلا ہوں۔ اور یونیورسٹی خواہ مخواہ بند ہو گئی ہے۔ طلبہ کو پتھر پھینکنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ اب لائبریری سے کتابیں کون لادے۔ نورچشموں کو تو سعادت مندی کی سوجھی ہے۔ ہم معلمین کو ابھی سے وہ پنشن دلائے بیٹھے ہیں اور وہ بھی پورے مشاہرہ کے ساتھ۔

میں احمد ندیم قاسمی سے ایک دفعہ لاہور میں ملا ہوں۔ اور ان کی متانت، خموشی اور سنجیدہ گہرائی سے متاثر ہوا ہوں۔ رسالہ "رومان" لاہور میں ان کے افسانے خوب چھپتے تھے۔ اور پھر ملک کے ہر موقر ادبی جریدے میں ان کی نظمیں، غزلیں اور افسانے بڑے تابناک طور پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ قدردانانِ ادب نے ندیم کے افسانوں اور منظومات کے کئی مجموعے دل سے

مجھے ۔ اب جب کہ ندیم نے نصف صدی کی زندگی گزار لی ہے ۔ وہ ایک استوار اور تابندہ مینارِ شعر و ادب بنے کھڑے ہیں صحافت کے میدان میں بھی انہوں نے خوب گھوڑے دوڑائے ہیں۔ رسالہ "نقوش" کی تربیت و تہذیب میں بھی ان کا ہاتھ رہا ہے ۔ اردو دنیا احمد ندیم قاسمی کو بھول نہیں سکتی ۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ندیم افسانہ نگاری میں بڑے حقیقت پسند ہیں۔ لیکن ان کی واقعیت سطحی اور چھچھلی نہیں۔ ان کی حقیقت پسندی تہ دار اور گہری ہے۔ ایک فنکار جب عام حقیقتوں کے اعماق میں جاتا ہے تو وہاں اسے ایک نئی دنیائے حیرت نظر آتی ہے ۔ وہ ان حیرتناکیوں کی تفسیر، تعبیر اور تنقید کرتا ہے۔ دنیا کے سامنے ایک تازہ دنیا آجاتی ہے ۔ اہلِ نظر عام حقیقتوں کے پردے میں دنیائے رومان اور عالمِ مثال دیکھ لیتے ہیں۔ ندیم ایسا ہی فنکار ہے۔ جو حقیقتوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر رومان اور مثالیت کی طرفہ کاری دیکھتا اور دکھلاتا ہے۔ میری رائے ہے کہ منٹو، کرشن چندر، بیدی، اختر انصاری اور ممتاز مفتی کی صف میں احمد ندیم قاسمی کو بہت ہی منفرد جگہ حاصل ہے ۔

ندیم کی شاعری نے مجھے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوش اور حفیظ جالندھری کے بعد احمد ندیم ہی پاکستان میں اردو شاعر کی حیثیت سے بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ تنقید میں مقابلہ اور موازنہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری "نغمۂ زار" اور "سوز و ساز" سے بہت آگے بڑھ گئی ہے ۔ "شاہنامۂ اسلام" کو میں وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔ اور بس۔

ندیم کا نام جوش کے بعد ہی لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوسرے ہم عصر شاعروں سے بڑے فنکار ہیں۔ فیض کا نام ان کے بعد لیا جائیگا۔ اور پاکستان کی کیا بات ہے۔ آج اردو نظم نگاری کی دنیا میں ندیم کو بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔

ندیم کا مشاہدہ گہرا ہے۔ وہ بہت ہی ذکی احساسات کے مالک ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی بھی ہے اور روشنی بھی۔ ان کی شاعری کے شعلے کبھی غیر مہذب طور پر نہیں بھڑکتے ندیم تہذیب جذبات کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بڑی شائستگی ہے۔ ندیم کا تخیل بھی بے راہرو نہیں ہوتا۔ وہ بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ مگر زریں غبار میں گم نہیں ہوتا۔ ندیم نے کلاسیکی رنگ میں بھی لکھا ہے۔ اور انہوں نے ندرت اور جدت کو بھی راہ دی ہے۔ ان کی تشبیہات اور استعارات میں بھی بڑی جدت پائی جاتی ہے۔

ندیم نے فطرت کے مظاہر کا مطالعہ بھی کیا ہے اور انسانی سرشت کا بھی۔ وہ انسانی اعمال اور فطرت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ اور ان کی نئی تعبیریں بھی پیش کرتے ہیں۔ شاعری بغیر تعبیر جدید کے شاعری نہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری اور شاعری پر ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ہم صرف مقالے پر بس کرتے ہیں اور وہ بھی تشنہ مقالے۔ ہم عصر فنکاروں پر اردو میں کتابیں کہاں ملتی ہیں۔ ہماری غفلت کا تو یہ عالم ہے کہ ہنوز ہم نے اپنے ادب انصالیہ پر بھی تنقیدی کتابیں نہیں لکھیں۔ ستم ہے اقبال کی شاعری اور صناعی پر کوئی مکمل اور مبسوط کتاب نہیں۔ علامہ پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان کے آرٹ پر بہت کم لکھا گیا۔

ابھی بھی ہماری نئی نسل کو چاہئے کہ وہ بزرگوں کے ساتھ دوسری پُشت کے فنکاروں پر بھی تنقیدی کتابیں لکھے ۔ ماتم تو یہ ہے کہ ہماری نسل خود بزرگ ہو گئی ہے ۔ ہم میں سے بہت سے مرحوم بھی ہو چکے ہیں ۔ یہ تو محمد طفیل کی ادب نوازی ہے کہ وہ کم از کم نمبر ہی نکالتے رہتے ہیں ۔ لیکن ایک مربوط تنقیدی کتاب کے مقابلے میں منتشر مضامین کا بہتر سے بہتر نمبر بھی نہیں آسکتا ۔ پاک و ہند میں ایسے ادارے ہونے چاہئیں جو ایک پروگرام کے تحت ماضی اور حال کے فنکاروں پر باقاعدہ تنقیدی کتابیں لکھوائیں ۔

بہرحال میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور زندہ دلانِ پاکستان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک ۔

ندیم صاحب ! ہم لوگ بہت جی لیے اور میری ابھی بھی یہ دُعا ہے کہ خدا خدمت گزارانِ ادب کو اور فرصت آہ و نالہ دے ۔ آپ نے زندگی کی آبرو بھی بچائی ہے اور ادب کی بھی ۔

جئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی

تیرے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

میں جانتا ہوں آپ کے دل میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ انساں بھی اور یہی وہ قیمتی سرمایۂ درد و داغ ہے جس نے ہماری آبرو بچا لی اور یہی ایک جوازِ حیات ہے ورنہ زندگی کی کیا قیمت ———

ڈاکٹر عبادت بریلوی

احمد ندیم قاسمی کی شاعری

جدید اُردو شاعری کی روایت میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کی عمر ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس چھوٹی سی عمر میں اس نے جو ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔ اور جو رنگ روپ پیدا کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اس کے ایک ایک انداز میں ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں اُن کے کلام کے چار مجموعے جلال و جمال، رِم جھم شعلۂ گُل اور دشتِ وفا شائع ہو چکے ہیں۔ اور اِن میں سے ہر ایک جدید شاعری کے اُفق پر ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم نے جدید دور کے دوسرے شاعروں کی طرح اپنی شاعری کا آغاز رُومان سے کیا۔ لیکن بالآخر وہ اپنے ارتقائی سفر میں حقیقت کی منزل تک پہنچے۔ اور اس طرح اپنی شاعری میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ ان کی رُومانی شاعری بھی کہنے کو تو رُومانی ہے لیکن واقعیت سے بھرپور ہے۔ اور اُس میں بھی زندگی کے اَن گنت پہلو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں۔ ندیم کی ابتدائی رُومانی شاعری میں انسان اور زندگی کا رُومان ہے۔ اسی لئے یہ رُومان واقعیت سے لبریز نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی ابتدائی رُومانی شاعری میں جہاں میدانوں، کہساروں،

سبزہ زاروں، کھیتوں، گاؤں کی گلیوں اور اُن میں زندگی بسر کرتی ہوئی دوشیزاؤں اور گبھرو جوانوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اُن کی شاعری کی رومانیت ایک بڑی ہی صحت مندانہ واقعیت کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کا نہ صرف مشاہدہ کیا ہے بلکہ ان کے درمیان اس طرح زندگی بسر کی ہے کہ یہ سب کی سب اُن کی زندگی کا بنیادی جزو بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے، وہ اس زندگی کے بعض مسائل کی ترجمانی کے لیے بھی مجبور ہوئے ہیں اور اُن کی شاعری کا یہ پہلو شروع ہی سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ وہ اپنے ارتقائی سفر میں حقیقت کی منزل سے ہمکنار ہونے والی ہے۔

چنانچہ اس منزل سے ہمکنار ہونے میں ندیم کی شاعری کو زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑا وہ جلد ہی اُس کے قریب پہنچ گئی اور اُس نے حقیقت نگاری کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اسی رجحان کے اثرات "جلال و جمال" ہی کی بعض غزلوں اور نظموں میں نظر آتے ہیں لیکن آگے چل کر "شعلۂ گل" اور "دشت وفا" کی نظموں اور غزلوں میں تو حقیقت نگاری کا یہ رجحان اپنے شباب پر نظر آنے لگتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر ندیم کی شاعری میں وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں اس میں تنوع اور رنگا رنگی کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ فکری گہرائی بھی اس میں اپنے آپ کو رونما کرنے لگتی ہے ——— تاریخی اور سماجی شعور بھی اُس میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے لگتا ہے ——— اور ایک انسانی زاویۂ نظر کے اثرات اُس میں اپنی تمام گہرائیوں کے ساتھ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اب ندیم کی شاعری سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست شاعر ہیں۔ وہ انسان اور انسانی زندگی سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور اسی کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں — بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس کو ایمان بنا لیتے ہیں — چنانچہ وہ رُومانیت اور ماورائیت کے صحراؤں میں نہیں بھٹکتے، تخیلات اور عینیت کے ویرانوں کی خاک نہیں چھانتے —— اور یہ کہہ اُٹھتے ہیں ؎

اسی شکستِ تمنا کے دم سے آج مجھے — دکھائی دیتے ہیں کتنے صنم جہانوں میں
رہی عزیز کچھ ایسی جہاں کی لاج مجھے — کہ میں بھٹک نہ سکا تیرہ آسمانوں میں
کوئی گداز نہیں خُلد کے فسانوں میں،
مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں
بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں — لُبھا سکا فقط انسان کا مزاج مجھے

یہ خیالات اِس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ صرف انسان اور انسانی مزاج کے عاشق ہیں —— اور یہ صورتِ حال ان کے مزاج کی حقیقت پسندی اور خیالات و نظریات کی پختگی پر دلالت کرتی ہے۔

ندیم کی شاعری میں انسان کی عظمت کا تصور بہت نمایاں ہے۔ اُن کے خیال میں انسان نے زندگی کے ہر شعبے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اُن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان عظیم ہے۔ کیونکہ اُس کی کوششوں اور کاوشوں سے زندگی ارتقاء کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ وہ زندگی کو سنوارتا ہے۔ اُس میں رنگ بھرتا ہے۔

ندیم نے اپنی ایک نظم "انسان عظیم ہے" میں خدا کو مخاطب کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس کی عظمت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن جو انسان اس کی مخلوق ہے وہ بھی عظیم ہے کیونکہ خدائی ذات کے ساتھ اس کو ایک خاص نسبت ہے اپنے مخصوص شعریت سے بھرپور انداز میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے — تو آگ ہے اور وہ اجالا
تو ذرّہ ہے نور کا پاسباں ہے — تو دشت ہے وہ چراغِ لالہ
انساں نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

تو عینِ حیات ہے مگر وہ — تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام — سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو وقت ہے روح ہے بقا ہے — وہ حسن ہے رنگ ہے صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے — وہ ایک مستقل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

(انسان عظیم ہے)

ان بندوں سے صاف ظاہر ہے کہ ندیمؔ انسان کو فطرت کا شاہکار ہی سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں وہ ارتقار کا پیشوا اور ترقی کا پیامبر ہے۔ اِس زندگی میں اُس کی حیثیت روشنی اور اُجالے کی ہے۔ وہ چراغِ لالہ ہے۔ اُس کا نصب العین تزئین حیات ہے۔ اُس کو فنا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُس کا مقصد تو زندگی کو ثباتِ دوام بخشنا ہے۔ انسان ازل سے اسی کے لیے کوشاں رہا ہے۔ اور یہی اُس کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔

ندیمؔ کے خیال میں زندگی عمل سے عبارت ہے۔ اُن کو خورشید کی شعاعوں میں ایک لرزشِ خفی نظر آتی ہے اور اُن کی نگاہیں ان کے دامن میں ایک سیلِ نور کو جلوہ گر دیکھتی ہیں، انہیں کائنات کی ہر شے میں حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ اِسی نسبت سے وہ فطرت کے شاہکار یعنی انسان میں بھی ایک حرکت اور جولانی دیکھنا چاہتے ہیں —— اُن کے خیال میں انسان اب ارتقائی سفر میں اُس منزل پر پہنچ گیا ہے جس کو وہ اُس کے رقصِ نَو سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسی رقصِ نو میں انہیں زندگی کا نکھار نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

خورشید کی شعاعوں میں اِک لرزشِ خفی ——— کہتی ہے سیلِ نور ہمارے جلو میں ہے!
شبنم یہ کہہ کے صحنِ گلستاں سے اُڑ گئی ——— میں کیسے تھم سکوں کہ ہر اک چیز رو میں ہے
بھڑکے تو کائنات کے گوشے چمک اُٹھیں ——— وہ خواب جو چراغِ حقیقت کی لَو میں ہے
وجدان کی اُڑان میں اب تک نہ مل سکی ——— وہ تابشِ حیات جو اک مُشتِ جَو میں ہے

جینے میں اِک تڑپ ہو تو مرنے میں اِک وقار
اِنسان کا نکھار اسی رقصِ نَو میں ہے

اس قسم کے خیالات ایک ایسے ہی شاعر کے ہاں پیدا ہو سکتے ہیں جو زندگی کو متحرک دیکھنا چاہتا ہے اور جس کے نزدیک حرکت ہی زندگی کا حسن ہے۔ انسان کی بلندی اور برتری اس میں ہے کہ وہ زندگی میں حرکت کے اس عمل کو تیز سے تیز تر کر کے حسن کو پیدا کرتا ہے۔

ندیم نے اسی انسان اور انسانی عمل کے نغمے گائے ہیں۔ انہیں اس انسان کے ساتھ بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ وہ اس کے عزم اور ارادے کی استواری پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان نے زندگی کے خواب آباد کو جنت بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم "نغمۂ انسان" میں اس حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کا بنیادی محور یہ خیال ہے کہ انسان کا عمل، ولولہ اور حوصلہ اس زندگی کو دل و گلزار بناتا ہے وہ زندگی کا سب سے بڑا خالق ہے

چنانچہ انسان اس احساس کا اظہار اس طرح کرتا ہے ؎

اس خواب آباد میں شعلہ بہ جاں آئیں گے ہم — بادہ ریز و رنگ ریز و نغمہ بار آئیں گے ہم
کوہساروں سے بہ رنگ آبشار آئیں گے ہم — اور میدانوں میں بن کر برگ و بار آئیں گے ہم
اوس کے پیکر میں اتریں گے چمن زاروں پہ ہم
برق کی صورت میں کوندیں گے جہانداروں پہ ہم

؎ یہ عروسِ زندگی کی دل ربائی ہم سے ہے — کارگاہِ زیست کی ہنگامہ آرائی ہم سے ہے
جذبۂ تخلیق کی اعجاز سائی ہم سے ہے — کبریائی ہم سے ہے شانِ کبریائی ہم سے ہے
ہم نہ ہوں تو اس طرح اجڑے خدائی کا سہاگ
جس طرح خرمن میں بجلی جس طرح جنگل میں آگ

ہم نے دھرتی کے کلیجے میں نمو پیدا کیا — ہم نے مٹی کے مرکب سے سبو پیدا کیا
خوشۂ انگور سے ہم نے لہو پیدا کیا — ہم نے یہ ہنگامۂ زارِ رنگ و بو پیدا کیا

گو عناصر چیختے چلاتے غراتے رہے
ہم ضمیرِ زندگی میں جذب ہو جاتے رہے

ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال — پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال — ہم نہ ہوتے تو کسے تھی بحر گردی کی مجال

ہم نے ناپیداکرانی کے کنارے پا لیے،
خاک کے ذروں کو یوں چمکا ستارے پا لیے

(نغمۂ انسان)

اِس طویل اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ندیم اِنسان کی عظمت اور برتری کے قائل ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبے کی ترقی انہیں اِس انسان ہی کی مرہونِ منت نظر آتی ہے۔ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا خیال ندیم کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ وہ زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے خواہشمند ہیں۔ اسی لئے سحر کے اشاروں میں جگہ جگہ اِس خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔ اِنسان کا عمل اِس سحر کو لانے کے لئے مصروفِ کار ہے۔ اور اس کے اس عمل ہی سے زندگی کی تاریکیاں چھٹ سکتی ہیں۔ اُن کے خیال میں رات کی تاریکیاں ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ سحر تو بہر صورت آ کے رہے گی۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کہ یہ زندگی کا قانون ہے ؎

طلسمِ شب ابھی ٹوٹنے قدم نہیں
اندھیرا ٹوٹ کے برسے مگر یہ بجھیں

نجوم بجھتے رہیں تیرگی اُمنڈتی رہے
سحر کا نور کسی ذی نفس کے پاس نہیں

ندیم کی شاعری میں سحر کا یہ اشارہ درحقیقت ایک نئے نظامِ اقدار کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ نظامِ اقدار اُن کے خیال میں انسان کی سعی و عمل کے باعث وجود میں آتا ہے۔ اور ہر دور میں زندگی ایک آدمِ نو کے انتظار میں رہتی ہے تاکہ وہ زندگی کو سحر سے ہمکنار کرکے سنوارے اور نکھارے —

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے:

—— (آزادی کے بعد)

اس آدمِ نو کا نصب العین محبت ہوگا۔ اور اس محبت سے نسل و رنگ کے بُت ٹوٹ جائیں گے اور ایک انسان دوسرے انسان کے لئے اجنبی نہیں رہے گا —

یہی یقین کہ انسان کی جبلت میں
بایں شکستہ دلی آشتی ہے قہر نہیں

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر،
کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

غرض ندیمؔ اس طرح اپنی شاعری میں انسانیت اور انسان دوستی، پیار اور محبت کا پیام دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ـــ اُن کی بیشتر نظمیں اور غزلیں اسی قسم کے خیالات و نظریات کے گرد گھومتی ہیں۔ ان خیالات و نظریات میں اُن کے یہاں خالص فلسفیانہ رنگ و آہنگ پیدا نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے ان کو جذبے میں سمو کر پیش کیا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کے یہ خیالات فکری گہرائی کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ندیمؔ نے اپنے آپ کو صرف جذبے ہی تک محدود نہیں رکھا ہے۔ شعور اور ادراک سے بھی کام لینے کی کوشش کی ہے۔

ندیم کی شاعری فنّی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اُس میں مجموعی طور پر ایک سنجیدگی اور وقار، رکھ رکھاؤ اور رسے دیئے رہنے والا انداز ہے۔ وہ ترشی ہوئی اور سجی سجائی شاعری نہیں ہے۔ اُس میں تو وہ حُسن ہے جو تکلف سے بری ہوتا ہے۔ اور جس کو حُسنِ فطرت کہہ سکتے ہیں۔ ندیمؔ کا اسلوب سیدھا سادہ اور انداز صاف اور سلیس ہے۔ اُن کے یہاں بعض دوسرے شاعروں کی طرح پیچیدگی اور ابہام کے پہلو بھی نظر نہیں آتے۔ اُن کے یہاں تو سیدھے سادے انداز میں بات کہنے کا سلیقہ ہے ـــ وہ اظہار و ابلاغ میں علامتوں کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔ اور ان سے اپنی شاعری میں ایک نئی فضا پیدا کرتے ہیں لیکن ان علامتوں اور اشاروں کے نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

ان کی شاعری میں تخیل کی رنگین کاریاں بھی نئے نئے روپ اختیار کرتی ہیں - نظموں کے یہ حصے کس قدر رنگین اور شعریت سے کس درجہ بھرپور ہیں ؎

کنارِ آبِ رواں شبنمی شگوفوں میں — جہانِ رنگ شعلوں کے انتظار میں ہے
ندی کی نرم روی میں نغمے اٹھتے ہیں — اداس چاند نہاں نور کے غبار میں ہے

سحر کا ہے یہ تقاضا کہ آفتاب اُبھرے
یہ جگنوؤں کا اک انبوہ کس شمار میں ہے؟

(سفر جاری ہے)

نجوم بجھتے رہیں تیرگی اُمڈتی رہے — مگر یقینِ سحر ہے جنہیں، اُداس نہیں
افق دھواں تو رہا ہے سجھائی دے کہ نہ دے — شفق ابل رہی ہے، دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاعوں کے انتظار میں ہے — کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں ہے

اتر کر شاخِ گل سے اب گلچیں میں آئے ہیں — گلِ تر ہیں یا ویرانیِ گلشن کی تصویریں
یہ شبنم ہے کہ گلچیں نے گلوں پر غور فرمایا — بجھی آنکھوں میں کانٹے بن گئیں کاجل کی تحریریں
کسی کے بسترِ کمخواب پر کٹ جائیں گی شب کو — عروسِ فصلِ گل کے منتشر خوابوں کی تعبیریں

(بہار اور مہکار)

دلیلِ صبحِ طرب ہی سہی یہ سناٹا — مگر پہاڑ سی یہ رات کٹ چکے تو کہوں
پسِ نقاب ہی پنہاں سہی عروسِ سحر — مگر یہ پردۂ ظلمات ہٹ چکے تو کہوں

(یہ رات)

زندگی عـزمِ زندگی سے تہی، کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہدِ کہنہ سال کی مانند معتبروں کے شمار میں گم ہے

——— (آزادی کے بعد)

مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ ندیم کی شاعری تو اس قسم کے رنگین اور رچے ہوئے انداز بیان سے بھری پڑی ہے۔ اس اندازِ بیان میں جذبے کی اخلاص مندی تخیل کی بلندی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کچھ ایسی گل کاریاں کرتی ہے کہ اُن کی شاعری فنی اعتبار سے بڑی ہی شگفتہ اور شاداب نظر آنے لگتی ہے ——— اُن کے فن کے نقوش بڑے تیکھے اور اس کے رنگ بڑے شوخ ہیں ——— اور یہی اُن کے فن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ایک زمانے میں ندیم تمام تر رُومانی تھے۔ اور اُن کی اس رُومانیت نے اُن کے فن پر وہ کیفیت طاری کر دی تھی جو کسی پر عالمِ سرخوشی میں طاری ہوتی ہے ——— لیکن جیسے جیسے وہ حقیقت پسندی کے قریب آتے گئے۔ یہ کیفیت اُن کے ہاں کم ہوتی گئی اور مجموعی طور پر وہ اعتدال اور توازن پیدا ہوتا گیا جو فن کی جان ہے۔

جدید اردو شاعروں میں ندیم ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے ——— اُس سے محبت کی ہے ——— وہ اُس کے مسائل کی تہہ تک پہنچے ہیں۔ اُنہوں نے اس کی رفتارِ ارتقار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اُس کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا ہے۔ اُس میں جو آویزشیں ہیں ان کا بھی وہ گہرا شعور رکھتے ہیں انہوں نے اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ وہ انسان کی

عظمت کے قائل ہیں اور زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں، اس سے بھی انہوں نے دلچسپی ظاہر کی ہے۔ ——— وہ انسان کو معصوم لیکن عظیم سمجھتے ہیں ... اور انہوں نے اسی انسان کی محبت اور عظمت کے گیت گائے ہیں۔

خدیجہ مستور

ندیم کی عشقیہ شاعری میں عورت کا درجہ

احمد ندیم قاسمی دورِ حاضر کے واحد شاعر اور افسانہ نگار ہیں جنہیں ان کی خداداد صلاحیت اور مسلسل کی انتھک ریاضت نے آج یہ درجہ بخشا ہے کہ انہیں اتنے تھوڑے سے عرصے میں پاکستان کا عظیم شاعر اور افسانہ نگار کہتے ہوئے جھجک نہیں بلکہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ کسی افسانہ نگار، شاعر یا مصوّر کے فن کی قدر و قیمت جانچنے کا پیمانہ اِس کا مستقبل ہے۔ مگر حال کی تابناکی، روشن اور زندہ مستقبل کا بڑا واضح اشارہ ہوتی ہے۔ ندیم کے حال نے انہیں بے اِنتہا شہرت، عزّت اور مقبولیت دی یہ مقبولیت صرف اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی حاصل ہوئی۔ ندیم اس معاملے میں بہت خوش بخت ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ خوش بختی صرف ان کی قوتِ قلم اور انکے خلوصِ فن کا نتیجہ ہے۔

دور کیوں جائیے۔ غالب کے دور سے لیکر موجودہ دور تک نظر ڈالی جائے تو یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ نقّاد اور تذکرہ نویس جانب داری سے کام لے کر شاعروں (یہاں صرف شاعروں کا ہی ذکر مقصود ہے) کے فن کی عظمت یا کم مائیگی کو گھٹاتے بڑھاتے رہے۔ تنقید کے ترازو میں فن کی عظمت کو تولتے ہوئے ڈنڈی مارتے رہے مگر ذوق استادِ شہ کہلانے کے باوجود

قاری کے دل میں غالب کا درجہ حاصل نہ کر سکے۔ شاہ کی اُستادی نے محض وقتی طور پر انہیں غالب سے بڑا شاعر کہلا لیا مگر کیا یہ بڑائی پائدار ثابت ہوئی؟ غالب غالب ہے۔ شاہ کی اُستادی کا درجہ اور نقادوں کی جانب داری لے کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ غالب کے شعر آج بھی اور کتنی ہی صدیاں گزرنے کے بعد بھی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بنے رہیں گے مستقبل کے شاعر غالب کے اشعار پڑھ کر شعر کہنے کا سلیقہ سیکھتے رہیں گے۔ غالب کے اشعار اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک عناصر قدرت انہیں فنا نہ کر دے۔ یہ دُنیا جب سے وجود میں آئی ہے اس نے کیسے کیسے باکمال لوگوں کو جنم دیا ہوگا۔ جانے کتنے غالب، میر، مومن، حافظ، خیام جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہونگے۔ کیسے کیسے باکمال مصوروں نے انسانی تہذیب کی تزئین و آرائش میں عروج حاصل کیا ہوگا۔ کیسے کیسے فلسفیوں نے افکار کے چراغ روشن کئے ہونگے مگر آج ان کا نام تک نہیں۔ ٹھیک ہے کہ ہم ان کا نام نہیں جانتے۔ ہم ان کے افکار و اشعار سے آج محظوظ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ وہ تھے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو سقراط نہ ہوتا۔ شیلے اور کیٹس کہاں ہوتے۔ پکاسو اور چغتائی نہ ہوتے۔ حافظ، خیام، غالب، میر، مومن اور اقبال نہ ہوتے اور آج ہمارے سامنے یہ جیتے جاگتے ندیم اور فیض بھی نہ ہوتے۔ انسان نے عناصر پر بہت حد تک قابو پالیا ہے۔ اور اب اسے نئی دنیاؤں کی تلاش ہے۔ اب کتنا یقین ہوتا جاتا ہے کہ عناصرِ قدرت ناموں اور کارناموں کو صفحۂ ہستی سے نہ مٹا سکیں گے۔

اپنے دور میں ندیم پر کم و بیش وہی گزری جو غالب پر بیتی تھی۔ ندیم پر جہاں غیر جانب دار

نقادوں نے دل کھول کر داد دی، تو ہاں جانب دار نقادوں نے ندیم کے ہمعصر شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نام کو بھی یاد نہ رکھا۔ جانب دار نقاد انہیں افسانہ نگار تو مان لیتے مگر شاعروں کی صف میں لاتے ہوئے کتراتے مگر ان باتوں کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ندیم کی شاعری کو پسِ پشت ڈالنے کے چکر میں وہ خود اپنی تحریروں کی وقعت کھو بیٹھے۔ ندیم نے ادبی حیثیت کی اس چھین جھپٹ کو بڑی سرسری نظر سے دیکھا۔ انہوں نے کبھی گلہ نہیں کیا۔ صرف اس لئے کہ انہیں اپنے قلم پر بھروسہ تھا، اپنے خیالات پر ناز تھا جبھی تو انہوں نے کہا :-

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولھا ہوں میں، ندیم ہوں میں

شاعروں نے اپنے کلام اور اپنی ذات کے لئے ایک آدھ شعر ضرور کہا ہے۔ مگر ندیم نے اپنی ذات کو جس طرح پیش کیا ہے۔ اس میں ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو فخر کی انتہا اور بےجا ناز محسوس ہو مگر یہ حقیقت نہیں۔ ندیم کو ساری دنیا کے انسانوں سے محبت —— گہری محبت اور ہمدردی ہے۔ ان کی محبت میں نسل، ذات پات اور عقیدے کو دور دور دخل نہیں۔ وہ ان کے سُکھ کی تمنا میں مرتے ہیں اور ان کے دکھوں پر تڑپتے ہیں۔ بس اس بنیاد پر وہ خود کو فن پارۂ عظیم کہہ سکتے ہیں۔ لفظ "دولہا" کے ساتھ ایک ایسی نیکی، پاکیزگی، سچائی، عظمت اور حسن وابستہ نظر آتا ہے کہ خود کو اس لفظ سے تشبیہہ دے کر ندیم نے انسانوں سے بلا امتیاز محبت کے بندھن کو اور بھی مضبوط کر لیا ہے۔ صرف یہ ایک شعر ان کے نصب العین کی پوری وضاحت کر دیتا ہے۔

ندیم کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ معزز نقادوں نے ان کی شاعری کے

ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے مگر ان کے عشقیہ اشعار میں عورت کا جو درجہ نظر آتا ہے۔ اس پر اب تک کسی کی نظر نہیں گئی۔ یا ہوسکتا ہے کہ میری نظر سے ایسی تحریر نہ گذری ہو۔ میں نہ تو شاعرہ ہوں نہ نقاد۔ ہاں شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت ضرور ہے اور اسی بنیاد پر قلم اٹھانے کی جرأت کر رہی ہوں۔

عورت اور مرد کا جسمانی اور محبت کا رشتہ ازلی و ابدی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے دور سے لیکر اب تک عورت کو مرد کے ہاتھوں کتنے ہی مدارج سے گزرنا پڑا۔ عورت کو حقیر سمجھ کر باعث بدنصیبی کی علامت مان کر اس کی پیدائش اور موت کے فاصلے کو منٹوں میں طے کیا گیا۔ اسے مصر کے بازاروں میں سجا کر بیچا گیا۔ اسے لونڈی کا روپ بخشا گیا۔ اسے کوٹھوں کی زینت بنایا گیا۔ اسے غلط قسم کی حیا اور پاکیزگی کا کھلونا بنا کر گھروں کی چہار دیواری میں قید کیا گیا۔ لیکن ان تمام صورتوں کے باوجود مرد اور عورت کی محبت کے رشتے کو ٹھیس لگی۔ وہ بھی محبت سے گریز نہ کرسکا جس نے اپنے ہاتھوں عورت کی تحقیر کی اور وہ بھی اس محبت سے پناہ حاصل نہ کرسکی جس نے اس تحقیر کو برداشت کیا۔

یہی حال شاعری میں ہے۔ عشقیہ اشعار عورت کے بغیر پھیکے ہی رہے۔ "عطار کے لونڈے" سے دوا خریدنے کو تو خرید لی جائے مگر شفائے کلی ناممکن۔ بہرحال ادوار کے ساتھ ساتھ شاعری میں محبت کے روپ اور انداز تو بدلتے رہے مگر وہ بنیاد کا جذبہ —— عورت اور مرد کی محبت کا اٹل جذبہ نہ بدلا۔ محبت کو کوئی دوسرا نام نہ دیا جاسکا۔ محبت کا یہی اٹل جذبہ آج بھی شاعری کی جان اور آبرو سمجھا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ محبت کے اسی جذبے

میں عورت کا صحیح وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عصرِ جدید میں جبکہ عورت، مرد کے دوش بدوش کارِ جہاں میں حصّہ لے رہی ہے۔ اس دَور کے معروف شاعروں کی عشقیہ شاعری کا انداز کیا ہے۔ عورت کو کھلے بندوں تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھ کر ان کی شاعری نے کون سا رنگ اختیار کیا ہے؟ کیا اس صورت میں بھی ان کی عشقیہ شاعری کا محور صرف عورت کا جسم اور حُسن ہے یا اس کی اصل رُوح بھی کہیں نظر آتی ہے؟ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ آج بھی عشقیہ شاعری میں عورت سراسر جسم ہے۔ جو پھُولوں سے زیادہ نازک ہے اور شبِ وصال کے مخملیں اندھیروں میں کھویا ہوا ہے۔ محبُوبہ کا دَر آوارگی کا محور ہے یا پھر اِک جبر مُسلسل ہے یا صرف قاتلہ عالم نیبے وفا وغیرہ وغیرہ۔ وہی صدیوں پُرانا تصوّر، جسے آج کے خوبصورت الفاظ میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ ہمیں عورت کا جمال تو نظر آتا ہے مگر اس کا جلال نہیں دکھائی دیتا۔ البتہ ندیم کہتے ہیں ؎

تو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا وجود، میری جاں ہے

ندیم کی محبُوبہ نہ قاتلہ عالم ہے اور نہ جُرم ہے۔ بلکہ وہ شعور اور وجدان کا مظہر ہے اور شعر کا جسم و جاں بنتے ہوئے اپنے صحیح رُوپ میں ندیم کی عشقیہ شاعری میں داخل ہوتی ہے۔

جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے۔ تمام دُنیا کے ادب میں عورت کو کچھ عجیب عجیب

خیالات کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ عورت کہیں عیار اور مکار نظر آتی ہے تو کہیں بے وفا — "تریا چرتر نہ جانے کوئی خصم مار کے ستی ہوئے" کی مثل اسی ذاتِ گرامی کی بدذاتی ثابت کرنے کے لئے گھڑی گئی۔ اور بھی ہزاروں اقوالِ زریں موجود ہیں جن میں عورت کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ رہی عورت کی بے وفائی تو وہ عشقیہ شاعری میں بین الاقوامی شہرت کا درجہ رکھتی ہے۔ عورت اس قدر ظالم اور بے وفا نظر آتی ہے کہ اس کی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے اور شاعر کی ہائے وائے سے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ اس درجہ بےتکی بے وفائی ثابت کرنے سے اگر شاعری میں سوز و گداز اور جان پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ کیا عورت کا کردار بگاڑ کر سوز و گداز پیدا کرنا کم مائیگی کا ثبوت نہیں؟ عشقیہ شاعری میں اعتدال تو مشکل ہی سے نظر آتا ہے اور عورت زیادہ تر صرف دو ہی روپ میں نظر آتی ہے ایک ظالم، بے وفا اور دوسرے مجسم شباب۔

ندیم کی عشقیہ شاعری میں بھی محبوب کی بے وفائی کا ذکر آتا ہے مگر اس طرح کہ وہ ظالم اور بے وفا نظر نہیں آتی بلکہ اس کی بے وفائی مجبوری کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

میری تنہائی کی دعا ہے
تیرے ساتھ بھری دنیا ہو۔

اور: ——

پھول ٹوٹ جائے گا لیکن آنکھیں تو ویراں نہ رہیں گی
بے شک میرے پاس نہ بیٹھو، لیکن اتنی دور نہ جاؤ

اور جب انہیں واقعی بے وفائی کا احساس بھی ہوتا ہے تو کچھ اس طرح کہ شاعری کی رُسوائی
ہاتے والے سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں اور عورت کو باضمیر سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار
کر لیتے ہیں ؎

سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ،
دھوکا دینے والا رو دے ۔ ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

اور ندیم عورت کے سلسلے میں کچھ ایسے نیک خیالات رکھتے ہیں کہ بھڑکانے والوں کی
پرواہ بھی نہیں کرتے ؎

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بہ عنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں

ندیم کی عشقیہ شاعری میں محبت اور تعلقاتِ محبت کے تمام رُوپ نظر آتے ہیں
ان میں ہجر کی تلخی سے لے کر وصال تک کی خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ اس کے باوجود نہ تو
عورت محض شباب نظر آتی ہے اور نہ اس کے احترام اور تقدس کا درجہ مجروح ہوتا ہے۔
محبوب سے ملنے کی تمنا کرتے ہیں تو بھی کس طرح ؎

اک روز اس طرح بھی مرے بازوؤں میں آ
میرے ادب کو، تیری حیا کو خبر نہ ہو

ندیم کی عشقیہ شاعری میں محبت ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے جو ہمیں دوسرے شاعروں
میں نظر نہیں آتی۔ جسم سے لگاوٹ عین انسانی فطرت ہے۔ مگر جان کے تانک اور گھرے

احساسات سے انکار بھی محض عیاشی ہے۔ جسم و جاں کا رشتہ آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔ عورت کو سراسر جسم سمجھنا اور اس کی جان کے نازک احساسات سے منہ موڑنا عورت کے مکمل وجود سے انکار ہے۔ اور یہ انکار ہمیں دوسرے شعراء کی عشقیہ شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاعروں نے عشق کو صرف جسم سمجھ کر اپنے خیالات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اس میں عورت کے احساسات و خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ عورت کی محبت اور اس کے نیک جذبات کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ مگر ندیم کی عشقیہ شاعری عورت کے جذبات و احساسات سے گزر کر ان کے قلم تک آتی ہے اور یہی انکی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اک جست کا فاصلہ ہے شر تک

لیکن ترا پیار درمیاں ہے،

اس شعر میں انتہائی محبت کرنے والی عورت کا احساس بول رہا ہے۔ وہ جو محبت میں کسی برائی کو برداشت نہیں کر سکتی اور محبت کے اسی احساس کی بنا پر شر کا فاصلہ طے نہیں ہوتا۔

پھر : ؎

جب تک نہ جلے چراغ دل کا

ہر شے کا جمال رائگاں ہے،

ندیم کی عشقیہ شاعری میں محبت کو اولیت دی گئی ہے۔ جب تک محبت نہ ہو حسن

حُسن نہیں۔ محبت کے بغیر تو جسم بھی مٹی کا تودہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسی محبت کی نیک کمائی لے کر خُدا کے حضور بھی حاضر ہوتے ہیں ؎

دامن مرا تر ہے، مگر اے داورِ محشر،
اِک دردِ محبت ہے مری نیک کمائی

یہ بات کتنی سچی ہے کہ فن، فنکار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فن کے اس آئینے کو غور سے دیکھو تو کیا کچھ نظر نہیں آتا۔ کہیں ابہام کے دھندلکوں میں تیرتے ہوئے چہرے کہیں فکر اور گہرائی میں ڈوبی ہوئی متفکر آنکھوں والے چہرے، کہیں محبوبہ کو مستقل بے وفا سمجھنے والے المناک نقشے اور کہیں محبت کو آوارگی گرداننے والے پھیکے چہرے۔ میں مانتی ہوں کہ فنکار کی شخصیت کے آئینے میں ایک نہیں۔ کئی چہرے نظر آتے ہیں مگر اس کی شخصیت کا ایک چہرہ ایسا نمایاں ہوتا ہے جس سے مجموعی طور پر اس کے فن کی ایک راہ معین ہوتی ہے۔ مگر جب ندیمؔ کی شخصیت کو ان کے فن کے آئینے میں دیکھتی ہوں تو حیرت زدہ رہ جاتی ہوں کہ وہاں صرف ایک چہرہ نظر آ رہا ہے جس پر محبت کے جذبات کے کتنے ہی پہلو رقصاں ہیں۔ زمین سے محبت، انسان سے محبت، اِس کے کارناموں سے محبت، اِس طرح ندیمؔ کی پوری شخصیت مینارۂ محبت بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

خُدا کے سامنے کِس مُنہ سے جائیں گے خُدا جانے
محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پہ

دُنیا نے محبت کو جُرم ٹھہرایا، محبت کا نقش دھبا کہلایا اور اسی لیے چوہدری صاحب

کی محبت کا رواج ہوا۔ محبت کے اس رواج نے دھوکے اور فریب کو جنم دیا۔ مگر ندیم نہ تو صرف کھلے بندوں محبت کا اقرار کرتے ہیں بلکہ وہ تو ان لوگوں کے لیے بھی متفکر نظر آتے ہیں، جنھوں نے محبت نہیں کی یا جن کے دامن پر محبت کا کوئی دھبہ نہیں۔ اس حد پر پہنچ کر ندیم کی عشقیہ شاعری میں عورت کا درجہ کتنا اونچا اور محترم ہو جاتا ہے مندرجہ بالا شعر اس کی پوری داستان ہے۔

ندیم کی عشقیہ شاعری میں ہمیں کہیں بھی ایسے اشعار نہیں ملتے جہاں عورت کی محبت گراوٹ کا شکار ہو جائے یا عورت کسی بھی پہلو سے حقیر نظر آئے۔ ندیم کی شاعری کا یہ ایک ایسا عظیم پہلو ہے جو ہمیں دوسرے شاعروں کی عشقیہ شاعری میں نظر نہیں آتا۔ یہ بات نہیں کہ ندیم نے عشقیہ شاعری کے تمام لوازمات پر شعر نہ کہے ہوں۔ لوازمات سے میری مراد یہ ہے کہ انھوں نے فراق، وصال، بے وفائی، رقیب اور جسمانی حسن سب پر طبع آزمائی کی ہے مگر کہیں بھی عورت کی ذات پر حرف نہیں آتا۔

عشقیہ شاعری میں عام طریقے سے عاشق محبوبہ کے فراق میں آہیں بھرتا اور آنسو بہاتا ہے۔ تارے گن گن کر یا کسی دوسرے حسرتناک طریقے سے وقت گزارتا ہے۔ مگر اسے محبوبہ کی دلی کیفیت یا فراق کے بارِ الم کو اٹھانے کا احساس شاید ہی کبھی ہوتا ہو۔ ندیم نے اس ضمن میں بڑے پیارے اور احساس سے لبریز اشعار کہے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ محبوبہ بھی گوشت پوست کی بنی ہوئی انسان ہے اور وہ بھی جدائی کی گھڑیوں کو گن گن کر کاٹتی ہے یا وہ بھی آنسو بہاتی ہے ؎

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے،
کہ میری یاد میں تُو بھی تو جاگتا ہو گا
مَیں کھُل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہو گا!

مَیں یہ نہیں سمجھتی کہ مرد فطرتاً بے وفا ہوتا ہے مگر یہ بھی سوچے بغیر نہیں رہ سکتی کہ عورت کو بے وفا اور صرف جسم سمجھنا بھی مرد کے احساس برتری کا نتیجہ ہے۔ معاشرہ مرد بناتا ہے۔ عورت کو سربلند کرنا اور اسے قعرِ مذلّت میں پھینکنا دونوں اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہے ہیں۔ پھر بھلا عشقیہ شاعری اس اثر سے کس طرح مبرّا ہو سکتی تھی۔ مگر ندیم اس ڈگر پر ایک لمحے کو بھی نہ رُکے۔ وہ عورت کی وفا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کا جگہ جگہ اظہار کرتے ہیں ؎

تیرے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو،
مَیں تیرے در سے جو اُٹھوں تو کس کے گھر جاؤں!

عشقیہ شاعری میں اب تک عورت کو جو درجہ حاصل رہا ہے، ندیم کی شاعری اس کی سراسر نفی کرتی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں عورت اپنے صحیح رُوپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ وفا کرتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے فراق میں روتی ہے۔ وہ اسے نیک جذبات سے سرشار کرتی ہے۔ وہ ایثار کرتی ہے۔ وہ دوست ہے۔ وہ اپنے محبوب کے دُکھ کی ساتھی ہے۔ وہ صرف رنگ رلیوں کی مرکز نہیں ہوتی۔ وہ تو قابلِ احترام ہوتی ہے۔

ندیم کی عشقیہ شاعری میں یہ جذبات کہاں سے آئے جو عورت کی فطرت کے

میں مطابق ہیں ؟ ان کے جذبات کا محرک کون ہے ؟ جہاں تک میں نے سوچا ہے، تو
یہی سمجھ سکی ہوں کہ ندیم کبھی یہ نہیں بھولتے کہ ان کی زندگی میں جو سب سے پہلی عورت آئی وہ ان
کی ماں تھی۔ اور ماں کے وجود ہی سے انہیں عورت کی عظمت اور تقدس کے احساس کا سبق
ملا اور اسی تقدس کی بنیاد پر انہوں نے اپنی عشقیہ شاعری کا رُخ متعین کیا۔ موجودہ دور
میں یہ درجہ صرف ندیم ہی کو حاصل ہوا کہ عشقیہ شاعری کی غزلوں میں محبوبہ نے اپنی رُوح کی تابانی سے
جسم کی عریانی کو چھپایا اور فخر سے سر اٹھا کر کہا ... مجھے پہچانو۔ میں ہوں سچی عورت، میں ہوں
اصل محبوبہ ...

جمیل ملک

رُباعی کی چار دیواری اور ندیم

میرے نزدیک رُباعی اپنے زور دار آہنگ، تمکنت اور وقار کی وجہ سے ایک شاہانہ صنفِ سخن ہے۔ ندیمؔ نے اس کے سلسلے میں بڑا محتاط رویہ اختیار کیا۔ اس نے کھیتوں، کھلیانوں، گلیوں اور شہروں کی مانوس فضا کو قطعے کی دُنیا میں بسا لینے کے بعد رُباعی کے اونچے محلوں میں قدم رکھا۔ قطعہ گوئی کے فن کو اپنانے اور اُسے نکتۂ تکمیل تک پہنچانے کے دوران ندیمؔ کو جن آزمائشی مراحل سے گزرنا پڑا، اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب وہ رُباعی کے ایوانوں میں داخل ہوا تو ان کے شکوہ و جلال اور ظاہری آن بان سے مرعوب ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ وہ قطعے کے دبستان سے اپنے ساتھ جو بصیرتیں لایا تھا۔ انہیں مجتمع کر کے اور حال کے نقطے پر رُک کر، اس نے ماضی اور مستقبل کی طرف یوں نظر دوڑائی ہے جیسے وہ مسائلِ حیات اور عصری تقاضوں کو وقت کی میزان پر تول رہا ہو۔ رشتوں اور سیاق و سباق کا جائزہ لینے کے اس عمل سے ندیم کی رُباعی میں ایک ایسا رجحان اُبھر آیا جس کی ترتیب و تکمیل ہی اس کا مطمحِ نظر ٹھہرا۔ اسی لیے ندیمؔ کی رُباعی میں شخصی سطح پر رُومان و محبت کی داستانیں محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان داستانوں نے اپنا آہنگ بدل کر قومیت، بین الاقوامیت

اور انسانیت سے محبت کو اپنے فن کی معراج بنا لیا ہے۔

جوشؔ نے رباعی کو جن فن و حکمت کے جن اسرار و رموز سے آشنا کیا تھا اور فراقؔ کی رباعی میں محبوب کا سراپا جس انداز سے لودے اٹھا تھا، موجودہ دور میں اردو رباعی کی یہ دونوں روایتیں احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین کے حصے میں آئی ہیں۔ جنہوں نے ان دونوں روایتوں میں اپنی شخصیت کا پیوند لگا کر نہ صرف انہیں اپنی آواز میں ہم آہنگ کر لیا ہے بلکہ حال کے نقطے پر ٹھہر کر ان روایات کو نئے مفہوم و معانی سے بھی آشنا کیا ہے عارف عبدالمتین نے اپنی رباعی میں فکر و فن کی آتش سیال سے جو پیکر ابھارا ہے اس کے سراپا پر جمال ہم نشیں کی ایسی پھوٹ پڑ رہی ہے جس میں محبوبہ حیات کی ضو کے ساتھ شاعر کی شریک حیات کا پرتو بھی رقص کناں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی رباعی کے جس مرکزی رجحان کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ روح عصر کا نمائندہ ہے۔ اس نقطے کے ایک طرف تاریخ کے صفحوں پر اسے ماضی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جس میں لاشوں کے تعفن کے سوا کچھ نہیں اور دوسری طرف ہر چیز وقت کی گزران میں تحلیل ہو کر ابدیت سے ہمکنار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان شاعر ایک مفکر زیست کے روپ میں کھڑا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتا ضرور ہے مگر حال کی سطح پر اس کے قدم اتنی مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں کہ روح عصر بار بار اس کے فن میں گونج بن کر ابھرتی رہتی ہے ؎

اک ذرہ قیامتوں کا بانی نکلا   انسان سرافیل کا ثانی نکلا

جب ہونٹ سِلے، گلوں کی بارش ہوئی   جب جسم کٹا تو خُون پانی نِکلا

ندیم نے عصری تقاضوں کو مختلف اور متنوع زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک غالب رجحان کی کارفرمائی کے باوجود، ندیم کی رُباعیوں میں مسائلِ حیات نئے نئے زاویوں سے اُبھر اُبھر کر قاری یا سامع کے رگ و ریشے میں خودداری، عزتِ نفس اور حرکت و عمل کی لہر دوڑا رہے ہیں۔ زندگی کے ان مسائل کی حدود، مروّجہ غلط نظامِ اقدار معاشی تفاوت، مصنوعی تمدن، پُر فریب رہنمائی اور کھوکھلی تعمیر سے لے کر وطن دوستی جمہوریت پسندی، سامراج دشمنی، کسان مزدور انقلاب اور بین الاقوامیت تک پھیلی ہوئی ہیں۔ گو ندیم کے قطعات میں بھی ان موضوعات کا جائزہ موجود ہے جو ندیم کی قطعہ گوئی کے ارتقائی مدارج کی صورت میں مرکوز ہوتا چلا گیا ہے۔ لیکن ندیم کی رباعی میں ان موضوعات کی رنگا رنگی نے ایک قومی رجحان کی صورت میں اُبھر کر ایک طرف اس کی نظریاتی جدوجہد کی نقاب کشائی کر دی ہے اور دُوسری طرف اس کی رُباعی کو ایک ایسا زور دار اور توانا آہنگ بخش دیا ہے جو جوش اور ندیم سے پہلے زیادہ تر درباروں، خانقاہوں اور مدرسوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ندیم نے اپنی پکار کو عصری تحریکوں اور عوام کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر کے، رباعی سے ایک ایسا کام لیا ہے کہ یہ شاہانہ صنفِ سخن جدید انسان کے سائنسی، انقلابی، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی تقاضوں سے اپنا رشتہ جوڑ کر سلطانیٔ جمہور کی صورت پذیر دار بن گئی ہے ۔۔

اِس حال پہ ماضی کے سب آثار نثار   اِس عذر پہ شاہان کا دربار نثار

انساں نے شنگھائی سے واشنگٹن تک — وہ آگ جلائی ہے کہ گلزار نثار
شہروں کی طرح اِک غبار اُٹھے گا — طوفاں نہیں، محشر بہار اُٹھے گا
کھلیان کی دُھول چھانتے دہقانو — دانہ دانہ کبھی پکار اُٹھے گا

رُوئی کی طرح اپنا کلیجہ دھنک دوں — ریشم کی مثال سُرخ شالیں بُن دوں
تا دارِ عروس، آ ترے ماتھے پہ — میں قوم کے آنسوؤں کی افشاں چُن دوں

قابلِ قدر بات یہ ہے کہ عصری تقاضوں سے ندیم کی یہ وابستگی ظاہریت اور سطحیت پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ندیم کی اس وابستگی کی جڑیں اِنسان دوستی کی ازلی و ابدی سرزمین میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ندیم نے محض جذباتی سطح پر اس وابستگی کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ اسے اپنی رُوح اور وجدان کا حصہ بنا کر اس کا رشتہ زندگی کی وسیع حقیقتوں اور تہہ دار بلاغتوں سے جوڑ دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ ندیم کو بحیثیت ایک فنکار اپنے فن کی تزئین و آرائش کا اتنا سلیقہ اور اپنے اسلوب پر اتنی قدرت ہے کہ وہ جس موضوع کو بھی چھُو لیتا ہے وہ اُس کی شخصیت کی پُرخلوص آنچ سے مَس ہوتا ہُوا اجتماع کے ساتھ ساتھ اُس کی اپنی ذات کا بے ساختہ اظہار بن کر جہاں خفیہ ذہنی صلاحیتوں کو جگاتا ہے وہاں رُوح میں ایک زخمی تقاضے کی صُورت پیوست بھی ہو جاتا ہے جس کی مسیحائی کا فریضہ صرف فنکار ہی کا نہیں بلکہ سب کا منصبِ اولیں بن جاتا ہے۔

ندیم کی اِنسان دوستی کی بُنیاد یہ ہے کہ وہ فطرت کے گھناؤنے اور منفی رُخ سے انحراف کرتے ہوئے اِنسان کو انسانِ محض نہیں سمجھتا بلکہ وہ تقدیر کے پھاٹک میں تدبیر کی گرہ

لگا کر خود تقدیر کو پابستہ کر دیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے شب زندہ دار اور جمہوریتِ وقت کے برخوردار خدا کو پانے اور کشف و کرامات کے ذریعے عرشِ بریں کی خبر لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن اُس انسان کو بھول جاتے ہیں جس کی صورت گری خدا نے اپنے جلال و جمال سے کی ہے۔ اور جو اس کا شہپارۂ تخلیق ہے۔ ندیم کی انسان دوستی اسی شہپارۂ تخلیق سے عبارت ہے ؎

دعویٰ ہے اسے عرشِ بریں میرا ہے
وہ سوچتا ہے عرش نشیں میرا ہے
دھرتی پہ اُترنا۔ نہ خدا کے بندو
انسان کو کہنا نہ کہیں میرا ہے

اس شہپارۂ تخلیق سے وابستگی کی بنا پر ندیم کا تصورِ انسانیت متحرک اور متنوع اندازِ نظر کا حامل ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص سمت کے تعین کے باوجود ندیم کی شاعری میں یخ بستگی اور یک رنگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ یہ شہپارۂ تخلیق گنبدِ زر پر بیٹھ کر مذہب کے نغمے الاپنے والوں سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ ہر غریب کے جسم پر گناہ کی آلائش دیکھنے کے باوجود وہ حق و صداقت کی مشعل روشن رکھتا ہے۔ وہ ماضی کے تابوت کو تاریخ کے عجائب گھروں میں سجا کر اس کی پرستش کرنے کی بجائے حال کی سائنسی اور مثبت قوتوں کا ساتھ دیتا اور مشعلِ ماہ پر ہاتھ مارنے کی دھن میں رقصاں و جولاں رہتا ہے۔ وہ صرف حسن و جمال کا پرستار ہی نہیں بلکہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آشنا ہے کہ یوسف کا جمال

پیچ کھانے والے ہوس کاروں اور زر پرستوں کی اپنی زلیخا بھی آخر کار انہیں کے ہاتھوں بک جاتی ہے۔ اسے ہر تخریب کے پس منظر میں تعمیر کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ کلیوں کا خون ہوتا ہے تو گلاب مہک اُٹھتے ہیں۔ ستاروں کی موت طلوعِ فردا کی ضامن بن جاتی ہے سمندروں کے سینے کی جلن دُھواں بن بن کر بادلوں کی صورت آسماں پر چھا جاتی ہے۔ اور یہ بادل جھما جھم برس کر جلتی ہوئی زمین کو شگفتہ و بامراد کر جاتے ہیں۔ ندیم کی رباعی کے اس متصادم پس منظر میں سفر، مدام سفر اور تلاش، پیہم تلاش کی امنگ ہمکتی رہتی ہے ؎۔

تخلیق ہوئی ہیں کائناتیں کتنی
انوار میں ڈھل چکی ہیں راتیں کتنی
سب راز اگرچہ ہیں برافگندہ نقاب
مجھ سے ابھی پوچھنی ہیں باتیں کتنی

اس رباعی کے آخری مصرعے کے استفہامیہ انداز کا ایک رُخ فنکارِ ازل کی طرف ہے اور دوسری طرف وہ اپنی ذات میں چھپے ہوئے فنکار سے بھی ہم کلام ہے۔ جو ہر وقت کسی نئی حقیقت، کسی نئی بلاغت کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ حال کے نقطے پر رکنے کے باوجود ندیم کی رباعی میں بیروں بینی کے ساتھ ساتھ دروں بینی کا عمل بھی جاری رہتا ہے بیروں بینی اس کے شعور و وجدان کا رشتہ مستقبل سے وابستہ اس آدرش سے منسوب کر دیتی ہے جس کی رہنمائی میں انسان کائنات کو اپنا کر آفاق پر چھا جانے کی دھن میں

سرگرداں رہتا ہے۔ جہاں پیاس بجھ جانے کے بعد بھی زندگی کے نئے سرچشموں کا سراغ لگانے کے لئے، صحرا صحرا بھٹکنے کی تمنا اس کے دل میں موجزن رہتی ہے۔ جہاں بھنور میں چکرانے اور موت کی حقیقت سے شناسا ہو جانے کے باوجود، ساحل پر اترنے اور ازسرِ نو زندگی کا حظ اٹھانے کی خواہش ایک پکار اور ایک نشے کی صورت اُسے رگ و ریشے میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں حیات و مرگ کی حدیں مل جاتی ہیں، جہاں انسان سعیِ پیہم اور تلاشِ مسلسل سے چور ہو کر جب موت کی آغوش میں گرتا ہے تو موت خود زندگی کی علامت بن جاتی ہے۔

ندیم کی بیروں بینی کا یہ انداز آہستہ آہستہ باہر سے اندر کی طرف سمٹتا ہوا دروں بینی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اپنی ذات سے ہمکلامی کے ساتھ اُس کے دِل میں فنکارِ ازل کو دیکھنے کی آرزو جاگ اُٹھتی ہے جس سے بچھڑنے کے بعد اس پر کئی زمانے گذر چکے ہیں۔ وہ اس حقیقتِ گریزاں، اس ازلی و ابدی سچائی ہی کو ماضی کے ویرانوں، حال کے آئینہ خانوں اور مستقبل کے نہاں خانوں میں ڈھونڈتا رہا ہے۔ وہ اس اَن دیکھے محبوبِ جمال کی جستجو میں نہ صرف خود بار بار عدم سے وجود اور وجود سے عدم کی طرف لوٹتا ہے، بلکہ اس کے ہاں ہر جستجو بالآخر اپنی اصل حقیقت سے مِل جاتی ہے۔ یہیں سے ندیم کی روح میں ابدیت کا چراغ روشن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی رُباعی عصری تقاضوں کی آئینہ دار ہونے کے باوجود، ماضی و حال، وجود و عدم اور زمان و مکان کے فاصلوں کو سمیٹ کر اپنی روح میں ضم کر لیتی ہے لیکن چونکہ ندیم کی رُوحانی اور داخلی توانائی کا یہ تعدد اس کی

خود آگاہی اور انسان دوستی کا پروردہ ہے اسی لیے وہ وصال کی تجلیوں سے ہمکنار ہو کر بھی عالم فراق میں رہنا پسند کرتا ہے جہاں عزم و عمل کی جولانگاہوں کا ایک متحرک اور باشعور کردار بن کر وہ پھر اسرار حیات کی کھوج میں نکل جاتا ہے حقیقت مطلق سے بار بار اُس کا سامنا ہوتا ہے مگر وہ اپنی انا اور اپنی انفرادیت کے تحفظ کی خاطر اپنی ذاتِ ارضی کے جزو کو اُلوہی حقیقت کے کل میں مدغم ہونے کی اجازت نہیں دیتا، نتیجتاً وہ ابدیت کی حدود کو چھو کر جب حال کے نقطے کی طرف لوٹتا ہے تو اپنی ہی ذات سے ٹکرا جاتا ہے جس سے اس کی بحالی ایک منفرد اور باوقار مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے ۔

رکتی ہوئی سانسوں میں ترانے جاگے
بجھتی ہوئی آنکھوں میں فسانے جاگے
حاصل تھا حیات کا یہی آخری پل،
یہ لمحہ جب آیا تو زمانے جاگے

وہ ٹوٹ کے بجھ گئے شرار آخر کار
وہ چہرۂ گل ہے پرغبار آخر کار
ہر چیز ابد کا ورد کرتی اُٹھی،
ہر چیز کو مل گیا قرار آخر کار

آفاق کو ایوان بنایا اپنا
تقدیر میں کردار رچایا اپنا
مجرے کو فرشتے بھی زمیں پر اُترے
اِنسان نے جب سراغ پایا اپنا

انجامِ تلاش کیا کہوں کیا نِکلا،
ہر راز کا حل رازِ سراپا نِکلا،
آئینہ در آئینہ ہیں اسرارِ حیات
ہر پردے کی اوٹ میں ندیمؔ آ نکلا

برسوں کی شکایتیں نہ دُہراؤں گا
بس ایک نِگاہ خُود پہ دوڑاؤں گا
تم میری طرف قدم بڑھاؤ تو سہی
تم آئے تو مَیں دُور چلا جاؤں گا

یوں تو ندیمؔ کے فن کی ساری تزئین و آرائشِ زندگی ہی کے جلال و جمال کی غماز ہے لیکن رُباعی میں شاعر نے منفی علامتوں میں بھی زندگی کے حُسن کا احساس اور تشبیہ و استعارہ کا جادُو اِس طور پر جگایا ہے کہ یہ بظاہر عملی اور منفی زاویے بھی غیر معمولی اور مثبت کیفیات

کے عالم ہو گئے ہیں۔ رُوحِ عصر کو اپنے فن اور شخصیت کا جزو بنا کر شاعر نے بہار و مہکار
کی مانوس علامتوں سے گریز کا ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اب اُس کے دل میں صحراؤں
سے پھول چننے اور حُسنِ خزاں سے دامنِ نظر بھر لینے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ جہاں کلیوں کی چٹک سے اس کا غنچۂ دل کھل اٹھتا ہے وہاں انسان کی فریاد بھی
اس کے سینے میں سو سو طوفان اٹھا دیتی ہے۔ وہ حُسن کو زندگی کے سراپا میں سمو کر اُسے
ابدیت سے ہمکنار کرنے کا شدت سے قائل ہے لیکن اس حقیقت سے بھی پُوری طرح
آگاہ ہے کہ انسان کی نجات اور تکمیل کے بغیر کائنات کو حُسنِ مجسم کی صُورت میں دیکھنے
کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ندیم کے فن کا یہی دو جہتی انداز، ایک طرف اُس کے
دل میں حسن کی شمع جلا دیتا ہے اور دوسری طرف اس کے دماغ میں زندگی کا چراغ روشن کر دیتا
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ندیم کا اپنا المیہ اس دور کے ہر حُسن کار کا بھی المیہ ہے۔ وہ موتیوں
کی ارزانی اور خزف ریزوں کی گرانی کے تضاد پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ بایں ہمہ زندگی کی فعّال
قوتوں پر اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جب اُس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا
دی جاتی ہیں اس کا جسم احتساب کی سلاخوں سے داغ دیا جاتا ہے تو وہ مغلوب و نا امید
ہونے کی بجائے عزم و یقین کی قوتیں سمیٹ کر ایک ایسے کردار کی صُورت اُبھر آتا ہے،
جس کے صوتی آہنگ اور شعلۂ فن کو پابہ زنجیر کرنا منفی قوتوں کی سعیِ لاحاصل میں بدل
جاتا ہے۔ اور ندیم زنداں کی چار دیواری کی رفاقت میں چار مصرعوں کی اس بلند آہنگ
صنفِ سخن سے اپنا ناطہ کچھ اس انداز سے استوار کر لیتا ہے کہ اس کی آواز رُباعی کے قالب

میں ڈھل کر اپنی ہی نہیں بلکہ عصرِ حاضر کی بھی صدائے بازگشت بن جاتی ہے ۔

آفاق کا سیاح ہے زنداں میں اسیر
ہے پہنے ہوئے شہابِ ثاقب زنجیر
اے آگ کو پھونکوں سے بجھانے والو
شعلوں کے لیے یہی ہوا ہے اکسیر

ندیم کے نظریۂ فن کے بارے میں جو اشارے کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ہر صورتِ واقعہ اور ہر زاویۂ نظر جب اسالیب کے سانچوں میں ڈھلتا ہے تو اس کے مطابق اظہار و ابلاغ کے آئینوں میں منتقل ہوتے ہوئے رمز و کنایہ یا تشبیہ و استعارہ کے معانی بھی بدل جاتے ہیں ۔ ندیم کی رباعی میں رموز و علائم کی ان ندرتوں اور رمز و کنایہ کی ان بدلتی صورتوں کا اپنا ایک مخصوص اور منفرد انداز ملتا ہے ۔ مگر مروجہ نظام اقدار کی نظر میں اُن کا مفہوم وہی ہے جو اُردو ادب کی پٹی ہوئی روایت کا بھی حصہ ہے ۔

کیوں شکوۂ تاراجِ چمن جاری ہے
کیوں صبحِ بہار پر خزاں طاری ہے
حاکم کی زباں میں ادس کہتے ہیں اُسے
یہ برگِ گلاب پر جو چنگاری ہے

مناسب یہ ہے کہ ان رموز و علائم کے چند نمونے دیکھتے چلیں ۔ ذیل کی رباعی میں شاعر نے مجبورِ قفس کی تھکن، اضمحلال اور بے بسی کا اظہار، ٹمٹماتے ہوئے چراغ، اور تھکے ہوئے

بوسوں کے عالم میں یوں کیا ہے کہ فاقوں کے غبار میں لپٹا ہوا مجموعۂ مفلس کا داخلی ہیجان ایک المیہ کی صورت میں اُبھر کر احساس شعور کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ؎

یوں بھی کبھی حسن مسکراتا ہے ندیم
تربت پہ چراغ ٹمٹماتا ہے ندیم
مجموعۂ مفلس کے تھکے بوسوں میں
فاقوں کا غبار کرکراتا ہے ندیم

ایک اور رباعی میں جہاں 'صبح' و 'مہر' کا رشتہ دو انوکھی تشبیہوں سے جوڑا گیا ہے وہاں زنداں کی سحر پہ سلاخوں کے داغ احتساب کا اشاریہ بن گئے ہیں۔ سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر شعاعوں کے کٹنے اور ساتھ ہی ساتھ دماغ کے سمٹنے کے عمل سے ایک ہی ثانیے میں اس ظلم و جور کے چہرے سے نقاب اٹھ جاتا ہے جس کی بیدردی سے کچھ دیر کے لیے فنکار کی ذہنی صلاحیتیں بھی شل ہو کر رہ جاتی ہیں ؎

زنداں کی سحر پہ ہیں سلاخوں کے داغ
کٹتی ہیں شعاعیں تو سمٹتا ہے دماغ
یہ صبح ہے یا نزع میں بچے کی ہنسی
یہ مہر ہے یا تربت شاعر کا چراغ

یہ رباعی دیکھیے، یہاں آثارِ سحر اور چلتے پھرتے سایوں کے پس منظر میں چند افراد اور مجمع کی پیکر تراشی کے ذریعے طبقاتی تضاد اور معاشی تفاوت کو اس طور اُجاگر کیا گیا ہے

کہ شاعر کے کمالِ فن کے ساتھ ساتھ ایک طبقے سے نفرت اور دوسرے سے ہمدردی اور دردمندی کے احساسات بیک وقت بیدار ہو جاتے ہیں ۔

آثارِ سحر چمن کو چونکائے رہے
ساتے سے مگر چار طرف چھائے رہے
دو چار نے بڑھ کے اپنی جھولی بھر لی
لاکھوں کے ہجوم ہاتھ پھیلائے رہے

ایک اور مثال، ذیل کی رُباعی کے ایک ایک مصرعے میں ایک ایک تلازمہ موجود ہے، ہر مصرعے کو شاعر نے مصوّر کے مُوقلم سے ایک مخصوص اور منتخب رنگ کے ذریعے ایک منفرد تصویر کی صُورت میں اُبھار دیا ہے ۔ ہر تلازمہ دوسرے تلازمہ سے اور ہر تصویر دوسری تصویر سے یُوں منسلک ہوتی چلی جاتی ہے کہ رباعی نقطۂ تکمیل پر پہنچ کر ایک چوکور پینٹنگ کے قالب میں ڈھل جاتی ہے ۔ جس کے پس منظر میں شاعر کا فکری اور فنی تانا بانا تصویر در تصویر آپ ہی آپ احساس و وجدان میں آویزاں ہوتا چلا جاتا ہے ۔

آنسو پُونچھے تو ہونٹ زخمی پائے
ہونٹوں کو ملا تو دِل میں بھونچال آئے
دِل کو جو سنبھالا تو خرد جاگ اُٹھی
آنکھیں اُمڈیں، فضا پہ کہرے چھائے

اِس مکالمے سے ثابت ہے کہ ندیم کی رُباعی میں روحِ عصر ایک غالب رجحان بنکر

جس رنگ و آہنگ کے ساتھ اُجاگر ہوتی ہے اُسے شاعر کی فکری، رُوحانی اور فنی آنچ نے کسی مرحلے پر بھی تہی بستگی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ رُوحِ عصر یا حال کے نقطے سے وابستگی کی بنا پر میں نے ندیم کی رُباعی کو رُکنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس تجزیاتی مطالعے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ٹھہرنے کے اس انداز میں ماضی پر نظر دوڑانے، حال کے حقائق کو سمیٹنے اور مستقبل کی طرف پیش قدمی کرنے کے روشن تر امکانات موجود ہیں۔

ندیم نے قطعے کے مقابلے میں رُباعی کو بڑی دیر کے بعد ایک ایسے موڑ پر اپنایا جب وہ زنداں کی چار دیواری اور ایک مخصوص نقطۂ نظر کے قلعے میں محبوس تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر اسی مرحلے پر ندیم کے ہاں رُباعی زنداں ہی کی چار دیواری کی صورت میں کیوں اُبھری۔ یہیں سے رُباعی کا مزاج متعین کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا ندیم اپنی افتادِ طبع کو رُباعی کے مزاج سے ہم آہنگ کر سکا ہے یا نہیں۔ فنی اعتبار سے رُباعی کو پرکھا جائے تو یہ بھی قطعے ہی کی طرح آغاز، وسط اور انجام کے مراحل طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں بھی قطعے ہی کی طرح ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے ہم پیوست ہو کر موضوع کو نقطۂ تکمیل تک لے جاتا ہے لیکن جو چیز قطعے اور رُباعی میں حدِ امتیاز قائم کرتی ہے وہ قطعے کا نرم پذیر گر متوازن لب و لہجہ اور رُباعی کا ٹھاٹ دار آہنگ ہے۔ رُباعی میں ہر مصرعے کے ساتھ صوت و صدا کی ایک بلند سے بلند تر سطح اُبھرتی چلی جاتی ہے۔ رُباعی کا پہلا مصرعہ آغاز، دوسرا مصرعہ وسط اور آخری دونوں مصرعے

انجام سے مشابہ ہیں۔ پہلے اور دوسرے مصرعے میں شاعر کی آواز پوری قوت کے ساتھ اُبھر کر ذات کی چار دیواری سے ٹکراتی اور داخل سے خارج کی طرف جست لگانے کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعے کے مجموعی اور انتہائی زور دار آہنگ کے ساتھ یہ آواز داخلیت کی چار دیواری کو توڑ پھوڑ کر خارجیت کے میدانوں کی طرف جست لگاتی ہے۔ داخلیت کے حصاروں کو توڑنے کا عمل جہاں شاعر کی آواز میں شدتِ احساس کے ساتھ ہیجانی کیفیت یا بے پناہ کرب کو ابھار دیتا ہے وہاں خارجیت کی طرف تیزی سے پیش قدمی کا رجحان اس کی آواز میں دھماکے اور جھٹکے کا بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر رُباعی کے مزاج میں داخلی ہیجانات اور خارجی محرکات دونوں ہی کارفرما ہوتے ہیں، اور انہیں کے اختلاط سے رُباعی کا گھمبیر آہنگ جنم لیتا ہے۔ رُباعی کے اس فنی تجزیے کے بعد اور قدیم کی نفسیاتی تحلیل کرنے سے آہستہ آہستہ یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ زنداں کی چار دیواری میں مقید ہوتے ہی اُس نے اپنا رشتہ لاشعوری طور پر رُباعی سے کیوں استوار کر لیا۔ زنداں کی تاریک اور محبوس فضا میں شاعر کے جذبات اور خیالات اندر ہی اندر لاوے کی طرح پک رہے تھے۔ داخلیت کا یہ آتش فشاں پہاڑ یکایک پھٹ کر اپنا KATHA(RSIS) بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ بے رحم احتساب کے شکنجے میں عملی طور پر ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے شاعر نے ایک ایسی صنفِ سخن سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جس کے بتدریج اوپر اُٹھتے ہوئے چاروں مصرعے زنداں کی بلند سے بلند تر ہوتی ہوئی چار دیواری سے مماثل ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھیں تو دوسرے رُباعی گو شعراء کے

ہیں یہی رباعی کی چار دیواری کسی نہ کسی لحاظ سے زنداں ہی کی دیواروں سے مماثلت رکھتی ہے
ان شعرا نے بھی داخلی توجہات کے پروردہ زوردار آہنگ ہی کے وسیلے سے اس چار دیواری
سے باہر جست لگا کر اپنے محبوس اور مقید جذبات وخیالات کو روشنی اور آزادی سے ہمکنار کرنے
کی کوشش کی ہے۔ جوش اپنی پاٹ دار آواز کی مدد سے رباعی کی چار دیواری سے چھلانگ لگا کر
پُراسراریت، محکومیت اور عدم معاشرت کے زنداں سے رہائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فراق
کی رباعی میں محبوب کا سراپا بھی اس کے لیے زنداں کی علامت بن گیا ہے۔ اس سراپا میں
ڈوب کر ابھرنے کا رجحان اس بات کا غماز ہے کہ شاعر ایک شدید جمالیاتی اور لمساتی وابستگی
کے ذریعے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرکے درحقیقت احساس شکست ہی کے زنداں سے
نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح عارف عبدالمتین جب اپنی شریک حیات کی آغوش
میں پناہ لیتا ہے تو اپنے آپ کو رباعی کی چار دیواری میں محبوس پاتا ہے۔ اور پھر شریک حیات
کو محبوبۂ حیات کا روپ دے کر ذات کی دیواروں کو یوں پھلانگتا ہے کہ کائنات کی کھلی آغوش میں
جا گرتا ہے۔

اس نفسیاتی پس منظر میں بطورِ خاص دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب نَدیم کے داخلی توجہات
کا دھارا خارجیت کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے تو کیا اس تصادم سے اُس کی ذات کا کرب
بھی اس کی آواز میں تحلیل ہو پاتا ہے؟ اور یہ کہ جب وہ ذات کے حصاروں سے نکل کر کائنات سے
رشتہ جوڑتا ہے تو کیا خارجی عوامل سے متصادم ہونے کے بعد اُس کی آواز ایک گونج
بن کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے یا نہیں؟ شعراء کی فنی استعداد کو رباعی کے مخصوص

مزاج کی کسوٹی پر جانچنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک آدھ کو چھوڑ کر بالعموم تمام رباعی گو شعرا اس معیار پر کما حقہ پورے نہیں اترتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں رباعی کے اوزان اور فنی مدارج کا تعین کرنے کی کوشش تو کی گئی ہے مگر ابھی تک اس کا منفرد مزاج متعین کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی چنانچہ کبھی یوں ہوتا ہے کہ رباعی میں شدتِ احساس کے ہمرکاب شاعر کا داخلی کرب یا ہیجان صورت پذیر نہیں ہو پاتا۔ اور کبھی رباعی کا آہنگ تیسرے اور چوتھے مصرعے پر پہنچ کر خارجی عوامل سے متصادم ہونے کے بعد ایک جھٹکے، طنطنے اور دبدبے کے ساتھ نقطۂ عروج سے ہمکنار ہونے کی بجائے ٹوٹ کر رو بہ زوال ہو جاتا ہے۔ رباعی گو اساتذہ کرام اور معاصر شعرا کے شعری محاسن سے انکار کرنا ہرگز مقصود نہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ان سب کے ہاں رباعی کا کوئی منضبط اور متعین تصور ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ جگہ جگہ رباعی کے مزاج سے ناواقفیت اور عدم توجہی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ جوش نے رباعی میں داخلی کرب اور برانگیختگی کو الفاظ کی شوکت اور تراکیب کی بلند آہنگی سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انداز جوش نے اپنی ہی نظم کے خارجی آہنگ سے مستعار لیا ہے جو رباعی کے مزاج سے کلی طور پر مطابقت نہیں رکھتا۔

اے طالبِ امرِ خیر و جویائے نجات

سُن غور سے اربابِ نظر کے کلمات

پیشِ وابستگانِ زلفِ حکمت

جھک جا کہ یہ ہیں عقدہ کشایانِ حیات

فراق کی رباعی میں داخلی اور خارجی تصادم سے مٹھیاں بھینچنے اور رگیں ٹوٹنے کی کیفیت تو نمایاں ہوتی ہے لیکن جلد ہی یہ کیفیت پھر جمال محبوب کے سحر آفریں طلسم میں مقید ہو کر مغلوب ہو جاتی ہے ۔ فراق بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رباعی کا آہنگ بھی حزنیہ لب لہجے سے مماثل ہے جو داخل سے خارج کی طرف جست لگانے کی کوشش تو ضرور کرتا ہے مگر درمیان ہی میں اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور شاعر کی آواز پھر اپنے داخلی انداز سے لپٹ جاتی ہے ۔ دراصل ندیم اور عارف کا مزاج قطعے کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعی سے ایک نمو پذیر اور متوازن لب لہجے کی تخلیق تو ہوتی ہے لیکن بسا اوقات یہ لب و لہجہ بلند سے بلند تر سطح اختیار کرتا ہوا جب رباعی کے آخری دو مصرعوں کی بلند ترین چوٹی سے ٹکراتا ہے تو اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے ۔ اس تصادم سے اندرونی کرب یا ہیجان کا احساس تو ہوتا ہے مگر یہ داخلی تموجات ایک کامیاب جست لگا کر دگنی شدت کے ساتھ خارجی محرکات سے متصادم ہونے میں ناکام ہو جاتے ہیں ۔ یہ بات یوں بھی ثابت ہے کہ ندیم اور عارف نے رباعی کے جن اوزان کا انتخاب کیا ہے وہ اپنی لطافت اور موسیقیت کی بنا پر جمالی کیفیات سے زیادہ قریب ہیں اور ان دونوں شعرا نے اپنے داخلی ہیجانات کے بل بوتے پر ہی جمالی مرکبات کو بروئے کار لانے اور متشکل کرنے کی کوشش کی ہے ۔

بادل تو بہت ہیں ، مینہ کے جھالے کم ہیں

کانٹوں کے مقابلے میں لالے کم ہیں ،

مزدور کا ذکر تو ہزاروں نے سُنا

مزدور کی فکر کرنے والے کم ہیں

(ندیم)

کانٹوں کا وصال اپنا مقدر ٹھہرا

پھولوں کا خیال اپنا مقدر ٹھہرا

ہم سوگئے دامانِ حقیقت تھامے

خوابوں کا جمال اپنا مقدر ٹھہرا

(عارف)

رُباعی کی چار دیواری میں ندیم اور عارف کی حیثیت ابھی نوگرفتاروں کی سی ہے اور ان کی رُباعیات کے فنی تجزیہ و مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ ابھی رُباعی کے زنداں کی صبر آزما فضا میں اس صنفِ سخن کے خدوخال اُبھارنے اور مزاج متعین کرنے کی کڑیاں جھیل رہے ہیں۔

ندیم کی جن رُباعیات میں زنداں کی تاریکی، گھٹن اور درد و کرب کے ساتھ ساتھ باہر کی کھُلی، آزاد اور تر و تازہ فضا میں سانس لینے کی بے پناہ خواہش کا اظہار ہوا ہے، وہاں داخلی کسک اور خارجی چمک کی آمیزش سے بے ساختہ پن کے ساتھ ایک جاذبیت اور پُر وقار آہنگ کی نمود ہوئی ہے لیکن جن رُباعیات میں نقطہ نظر یا زنداں کے عملی تجربے کی جھلک موجود نہیں ہے وہاں ندیم کا لب و لہجہ قطعے کے لب و لہجے سے مماثل ہو گیا ہے۔ شاعر کی مذکورہ بالا رُباعیات سے اِن دونوں پہلوؤں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال

اس میں شک نہیں کہ ندیم نے جس موڑ پر رُباعی کو اپنایا ہے وہاں سے رُباعی کا مزاج متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور خود ندیم کی رُباعی میں لاشعوری کوشش کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔ کیا عجب حال کے زنداں سے نکل کر جب ندیم مستقبل کے وسیع افق کی طرف پیش قدمی کرے تو اُسی کے ہاتھوں قطعے کی طرح رُباعی کا مزاج بھی متعین ہو جائے۔

وقار عظیم

ندیمؔ کے افسانے "سناٹا" کے بعد

فلسفی، سائنس دان، صوفی اور مُلا کسی اور بات پر متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک بات ان سب نے آواز سے آواز ملا کر کہی ہے۔ یہ بات سب کے ایمان کا جزو ہے کہ زندگی میں اور کسی چیز کو ثبات و قیام ہو یا نہ ہو تغیر، ثابت و قائم ہے اور تغیر و تبدل کے اسی اٹل قانون سے فلسفی سے لے کر مُلا تک سب کا بھرم قائم ہے۔ ندیمؔ کے افسانوں کے کرداروں نے بھی یہی بات کہی ہے۔ وہ یہ بات کہتے چلے جاتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ کہنے کا انداز تو یقیناً بدل جاتا ہے لیکن بات نہیں بدلتی:

"زمانہ بڑا بدل گیا ہے دادا! بڑے بڑوں کی عزتیں ٹکے سیر بک رہی ہیں۔ گالی نہ دیا کر" (بازارِ حیات، ۱۷۲)

گاؤں کی سوندھی مٹی کو چھوڑ کر لائل پور کی دُھواں دھار فضا میں رہ جانے اور بس جانے والا دینو کہتا ہے:

"گاؤں میں آ کر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اُٹھ رہا ہے۔ ہم خود چینی کے برتنوں میں چائے پیتے ہیں ——— (برگ حنا ۲۴)

"اصول کی بات" افسانے والا زمیندار ملک کے بٹوارے کو یاد کرتے ہوئے رقت سے کہتا ہے:

"ا! کیا روپیہ تھا۔ سچی چاندی تھی۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو ۔۔۔ ا! کیسے زمانے تھے جو لد گئے" (گھر سے گھر تک، ۶۸)

اور اسی افسانے والا عبداللہ جب بھیک سے حاصل کی ہوئی چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی کے پاس آیا تو بیوی نے کہا:

"کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے۔ پہلے تم خون پسینہ بیچ کے روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہی کا ہے"۔ (گھر سے گھر تک، ۷۵)

اور جب یہی عبداللہ چوپال پر آیا تو وہاں بیٹھے ہوئے سائیں کے حقے کا کش لگا کر بڑے چپکے سے یہ بات کہہ دی:

"بڑا برا زمانہ آگیا ہے چاچا۔ پیٹ کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں"

(گھر سے گھر تک - ۷۷)

زمانہ بدل گیا ہے اور اس نے اپنے ساتھ آدمی کو بھی بدل ڈالا ہے۔ لیکن زمانے کو تو ابھی اور بدلنا ہے اور اسی لیے چنگا جیسوں کے ماں باپ آنے والے زمانے کے تصور کے سہارے جیتے اور کہتے تھے:

"ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آرہے ہیں اور اب تھک گئے ہیں۔ اب ہمارا چنگا منشی بنے گا اور اگلی نسل تک ہم اس قابل ہو جائیں گے

کہ دُوسرے لوگ ہمارا پانی بھریں" (ثواب۔ گھر سے گھر تک، ۳۱)

مستقبل کے متعلق "ہیرا من والے (بازارِ حیات، ۲۴۲) وریام کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

"بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے زینو! یہ بچے بڑے ہوں گے تو ایسے ایسے کام لیے جائیں گے اِن سے، کہ ہم تم سوچیں بھی تو دماغ پھٹ جائیں"۔

لیکن زمانے کو دیکھنے کی ایک صُورت یہ بھی ہے کہ "ہذا من فضلِ ربی" (گھر سے گھر تک، ۵۰) کے کرداروں میں سے ایک یہ کہے گا:

"مَیں دیہات کو اپنے مُلک کے آثارِ قدیمہ میں شامل کرتا ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا تو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے"۔

اور یہ کہ "اصول کی بات" والا عبداللہ دوتی کی جگہ چونی بیل کے لیے پھیلائی ہوئی چادر پر ڈال دے تو زمیندار کے مُنہ سے بے اختیار نکل جائے:

"بھئی لوگو! تم دیکھ رہے ہو اس بُڈھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دوتی دی ہے اور اِس نے یہ میرے سامنے چونی لاکر رکھدی ہے۔ یہ فرق ہے پُرانے اور نئے زمانے میں۔ اِسے کہتے ہیں وضعداری"۔

زمانہ بدلتا رہا ہے۔ وُہ اب بھی بدل رہا ہے اور آیندہ بھی یُوں ہی بدلتا رہے گا۔

"زمانہ بڑا بدل گیا ہے دادا!" "بڑا بڑا زمانہ آگیا ہے دادا!" — "کیا میرے مولا کی دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟" — "بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے زینو!" اور پھر یہ کہ "یہ فرق

ہے پرانے اور نئے زمانے میں ـــــ "اسے کہتے ہیں وضعداری"۔ یہ سب آوازیں زندگی کو دیکھنے اور اسے دیکھ کر اپنا اضطراری ردِ عمل ظاہر کرنے والے ندیم کے افسانوں کے کرداروں کی آوازیں ہیں اور منہ سے نکلے ہوئے ان بولوں میں دل کی دھڑک اور کسک بھی ہے، خواہش اور تمنا کی جھمک بھی ہے اور مسرت کی اکا دکا لہر بھی ـــــ لیکن یہ ساری دھڑک، کسک، جھمک، خوف، اندیشے، آرزوئیں اور تمنائیں اصل میں ان کرداروں کی نہیں جن سے ندیم نے اپنی کہانیوں کی دنیا آباد کی ہے۔ یہ ساری آوازیں اور دل کی دھڑک، کسک، جھمک اور لپک کی ترجمانی یا غمازی کرنے والی جذبے اور احساس کی اترتی چڑھتی لہریں خود ندیم کے دل میں اٹھنے والی لہریں ہیں۔ جس کی ایک شانِ یگانگت یہ ہے کہ لوگوں کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ فن کار بڑا ہے یا انسان اور اس طرح کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا میرے نزدیک ندیم جیسے فن کار کے ساتھ اور ندیم جیسے انسان کے ساتھ سخت قسم کی ناانصافی ہے۔ اس کی انسانیت اور اس کی فنکاری کو بس ایک ہی میزان میں تولا جا سکتا ہے۔ اور اس ناپ تول میں آدمی کو سدا دونوں پلڑے برابر کے دکھائی دیں گے۔ اور یہ بات میں نے ندیم کے متعلق "سناٹا" کے افسانوں پر رائے ظاہر کرتے ہوئے آج سے پندرہ برس پہلے بھی کہی تھی اور یہی بات آج بھی کہنے پر مجبور ہوں جبکہ میں نے "سناٹا" کے بعد چھپے ہوئے افسانوں کے تین مجموعوں کے ایک ایک افسانے کو الف سے ے تک پڑھا ہے ـــــ "بازارِ حیات"، "برگِ حنا" اور "گھر سے گھر تک" کے افسانے ـــــ اب ان سب افسانوں میں مجھے وہ ندیم نظر آیا ہے جس کی عظمت تو اب بھی مسلم ہے لیکن یہ عظمت یا اس کی شخصیت کی دو عظمتوں میں سے کونسی عظمت

زیادہ بڑی ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں عظمت کے اِن دو رُخوں میں سے کسی کسی کے ساتھ بے ادبی کی جسارت سمجھتا ہُوں ــــــ لیکن تجزیہ کیے بغیر کام بھی نہیں بنتا اور جب تجزیہ شروع ہو تو ظاہر بین نظر کو تضاد کے نہ جانے کتنے پہلو دکھائی دینے لگتے ہیں۔

ندیم کی انفرادیت اور یگانگت (بہ حیثیتِ انسان) اور اس کی انفرادیت اور یگانگت (بہ حیثیتِ فن کار) ترازو کے دونوں پلڑوں کو یوں ایک سطح پہ لے آتی ہے کہ وہ اِنسان بھی عظیم تر ہی نظر آتا ہے اور فن کار بھی، اور اس کی وجہ میری اپنی نظر میں یہ ہے کہ ندیم جو باطن میں ہے وہ ظاہر میں بھی ہے اور جو اُس کا ظاہر ہے وہی اس کا باطن بھی ہے اور اسی لیے جیسا وہ اِنسان ہے ویسا ہی فنکار بھی۔ اُس کی شخصیت کے انسانی رُخ میں فن کی وہ لطافت، نزاکت، نرمی، لوچ اور لچک ہے کہ اس کی ذات فن کے حسن کا مظہر بن گئی ہے اور اس کی شخصیت کے اِس پہلو میں کہ جسے فنی پہلو کہنا چاہیئے، وہ خلوص، صداقت اور دیانت داری ہے کہ اسے انسانیت اور اس کی اعلیٰ ترین قدروں کا پیکرِ مجسم کہے بغیر چارہ نہیں۔

آپ کے نزدیک میں نے جذبے کی رَو میں بہہ کر ندیم کی ذات اور اُن کے فن کی بڑی شاعرانہ تصویر کھینچ دی ہے۔ اور آپ کے نزدیک شاید اس تصویر کے رنگوں میں توازن باقی نہیں رہا۔ اسی لیے کچھ باتیں ایسی بھی سُن لیجیے جنہیں آپ سُن کر مجھے معاف کر دیں گے ــــــ میں نے "بازارِ حیات" اور "برگ حنا" اور "گھر سے گھر تک" کے افسانے پڑھتے وقت بعض بڑی عجیب و غریب باتیں دیکھیں اور سچی بات ہے کہ ہم نے جو فنی تخلیق

درخاص کر افسانے یا مختصر افسانے کو پرکھنے کے جو بنت سے معیار ، منگ تانگ کر تنقیدی
سوالی کا جو "جہرم کا ناما" کھڑا کیا ہے ۔ ان تینوں مجموعوں کے بعض پُورے پُورے افسانے
ور کئی افسانوں کے کچھ حصے اس کی تول پر پُورے نہیں اُترتے —— مثلاً میرے سامنے
یذگرامین پو کے دیئے ہوئے اور BATES کے وضع کئے ہوئے اور پھر چیخوف اور پیال
کے برتے ہوئے جتنے قاعدے ، ضابطے اور عملی اور فنی اصول ہیں اُن سب کو الٹ پلٹ کر
ہیں ندیم کے بعض افسانوں پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ "داورِ حق"
بازارِ حیات ۔ ۹۰) اور "بھرم بیک" اور "وحشی" (برگِ حنا ، ۱۱ ، ۱۲۵) نہ لکھے جاتے تو اچھا تھا ۔
س لئے کہ "داورِ حق" اتنا بھیانک اور اتنا ہولناک ہے کہ اسے سچ تسلیم کرنے کی ہمت
ہیں پڑتی اور "بھرم بیک" اور "وحشی" اس لئے کہ انہیں محض تخیل کی تخلیق کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن
راسئے کے اسی اختلاف میں سے ندیم کی ذات کا وہ انفرادی پہلو بھی نکلتا ہے جس کی طرف
یں شروع میں اشارہ کر چکا ہوں ۔ ندیم کو اپنے افسانوں میں میں نے زندگی کے نیک و بد اور
زندگی بسر کرنے والوں کی اچھائیوں برائیوں کا ذکر ایک ایسے انداز میں کرتے سنا ہے کہ یہ سب
چھ ہماری زندگی اور ہماری دنیا سے الگ کسی دوسری زندگی اور دوسری دنیا کی باتوں کا ذکر لگتا
ہے ۔ ہر فن کار کی زندگی میں بار بار ایسے لمحے اور بار بار ایسے وقفے آتے ہیں جب اُس کا فنی
حساس کشش سے بے عمل رہنے کی طلب کرتا ہے اور اس خاموشی اور بے سکوت بے عملی
یں اُسے تخلیقی ادراک اور عملی مصروفیت سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن دُنیاوی تقاضے
تقاضوں سے مروّت اور طمانیت کی مجبوری شاید ندیم جیسے دل نواز انسان کے لئے سب سے بڑی

مجبوری ہے وہ "اسسٹنٹ"، "ہم بیگ" اور "وحشی" لکھ کر اپنا اور فن کا تقاضا نہیں، بے لحاظ اور بے مروت دوستی کا تقاضا پورا کروا لیتی ہے۔ لیکن اگر ہم "بیگ" اور "وحشی" کے علاوہ "وارورن" کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو ان افسانوں کے تخلیقی بحران کی اور بھی کئی توجیہیں نکل آتی ہیں۔

فن میں اور خاص کر کہانی لکھنے کے فن میں یہ بات ضوابط فن کے صحیفے کی آیت بن گئی ہے کہ فن کا موضوع صرف اس چیز کو بناؤ جو خیالی ہونے کے باوجود حقیقی معلوم ہو۔ وہم و خیال۔ حتیٰ کہ مبالغہ دکھائی دینے والی حقیقتیں بھی فن کا موضوع بننے کا حق نہیں رکھتیں۔ ان سے نہ انسان کی خدمت ہوتی ہے نہ فن کی ـــــــ لیکن فن کے اس مسلمہ ضابطے کی صداقت کو تسلیم کرانے والے بھی جانتے ہیں کہ اچھا فن کار کبھی کبھی اس سے انحراف کر کے ہی خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے فنی انا کی تشفی ہی ضابطوں سے انحراف اور ضابطوں کی شکست و ریخت سے ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات فن کے بنیادی تقاضوں سے انحراف کو ندیم کا حق اور اس کے فنی انا کا فطری تقاضا سمجھ کر میں نے تو قبول کر لیا ہے، اب رہی کہیں کہیں فنی توازن قائم نہ رہنے والی بات، یعنی یہ کہ ندیم کہیں کہیں اپنے تجربے کو ایک ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں کہ وہ تجربہ سچ کی حد سے گزر جاتا ہے تو میرے دل کی بات پوچھیے تو ندیم کے افسانوں کا سب سے بڑا حسن ہی یہ ہے کہ یہاں بات سچ کی حد سے بڑھی ہوئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

جن تین مجموعوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کے افسانوں کے کچھ ٹکڑے سن کر مجھے یقین

کہ آپ بھی میرے ہم نغیاں بن جائیں گے ۔ ندیم حسن کا شیدائی، حسن کا فدائی اور حسن کا پرستار ہے اور اس حسن نے جو جو روپ دھارا، ندیم کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا ہے اور اس کی اصلیت میں ڈوب کر بڑی معصومیت اور عبادت گزاری کے انداز میں اس کی تعریف و توصیف بھی کی ہے اور دوسروں کو حسن کی پرستش اور عبادت گزاری کا شعار بھی سکھایا ہے۔

انسان، اللہ کی بہترین مخلوق ہے اور اللہ کی اس سب سے حسین مخلوق کا سارا حسن سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگیا ہے۔ "سناٹا" کے بعد کے وہ سب افسانے جو حقیقت میں اور حسن پرست ندیم کے رومانی مزاج کے ترجمان ہیں آنکھوں کے حسن اور اس حسن کے دل میں ڈوب جانے اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر بے نیاز بنا دینے والے افسانے ہیں۔

انہیں پڑھ کر آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ حسن دنیا کی سب سے بڑی، سب سے دل کش، سب سے دل نواز، سب سے پاکیزہ اور سب سے مقدس حقیقت ہے۔ یہ حقیقت سامنے آئے تو آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اسے صرف آنکھ دکھائی دیتی ہے اور وہ طرح طرح کے جتن کرنے پر بھی اس حسن کا احاطہ نہیں کر پاتا:

• بادی کمہار سوچ رہا تھا کہ کل تک تو نازو بالکل ٹھیک تھی ـــــ آخر آج اچانک اس کی آنکھوں میں چور بتیاں کیوں جلنے لگیں؟ ـــــ اور وہ کوزے کے افق پر سے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ (بیٹے، بیٹیاں ۷)

اُن آنکھوں میں آگ کے شعلوں کا ننھا سا عکس جھانک رہا تھا۔ اتنی سیاہ آنکھوں میں آگ کی یہ چمک بالکل مانس چراغ کی سی لگتی تھی جو گھُپ اندھیری رات میں کہیں دُور ٹمٹما رہا ہو" ——

یہ ہیں گل رُخ کی آنکھیں —— (بازارِ حیات ، ۴۲)

مَیں نے گھبرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں کتنے ہی چاندوں کے عکس تھے اور اُس کے چہرے پر کتنے ہی چاند بھاگے جا رہے تھے"

یہ ہے "بدنام" افسانے والی نُوراں کی آنکھ۔ (بازارِ حیات ، ۱۲۴)

اتنی کالی اور بڑی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں مَیں نے صرف تصویروں میں دیکھی ہیں"

اور یہ ہے "نزہت فضل ربی" والی مالن کی آنکھ۔ (گھر سے گھر تک: ۴۹)

یہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے تکنے لگیں۔ —— ان آنکھوں پر دُنیا کے ساتوں سمندر قربان —— کیا تاروں سے جھلکتی ہوئی اندھیری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟" —— یہ ہیں "نزہت فضل ربی" والی تابندہ کی آنکھیں" جو مالن کی آنکھوں سے بہت ملتی جلتی تھیں مگر وہ زیادہ کالی تھیں" —— (گھر سے گھر تک ، ۶۰)

"میں نے اس کی آنکھوں کو اُس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہان نظر آ گئے ــــ وُہی ابہام جو غمّاز شکن بھی ہے اور غمّاز آور بھی، اور جب اُس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں"

یہ آنکھیں "بھاڑا" وال ملکھاں جھیورن کی ہیں۔ (گھر سے گھر تک، ۲۱۴)

اور "بھاڑا میں ہر طرف" خاموشی چھا گئی ــ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی، کالی، سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں" (گھر سے گھر تک، ۲۱۶)

اور اسی ملکھاں کی شعلہ بار آنکھوں کا ایک رنگ یہ ہے کہ:

"جب اُس کی مُندی ہوئی آنکھیں کُھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی تھیں"

(گھر سے گھر تک، ۲۲۱)

اور ملکھاں کی یہی آنکھیں ہیں کہ جنہیں دیکھ کر افسانہ نگار بے اختیاری کے انداز میں کہہ اٹھتا ہے:

"اللہ اکبر! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں۔ (گھر سے گھر تک، ۲۱۰)

دل کو موہ لینے، دل میں سما جانے اور دل کو سدا اپنا کر لینے اور اپنا پجاری بنا لینے والی آنکھوں کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وُہ ایک ایسے انسان کی تصویر ہے جس کی زندگی شاید انہیں آنکھوں کا حسن دیکھنے اور اسی کو زندگی کا اپنا سب سے بڑا مشغلہ سمجھنے میں بسر

ہوتی ہے۔ لیکن جنہوں نے ندیم کو دیکھا اور جانا پہچانا ہے وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ کوچہ و بازار میں آنکھیں جھکا کر چلنے والا یہ افسانہ نگار اس کا اہل ہی نہیں کہ وہ آنکھوں کو گھور کر یا جی بھر کر دیکھ لینے کے عصیاں کا مرتکب ہو سکے۔

ندیم کے انسانی مسلک میں مصلحتاً بھی جھوٹ بولنا ناقابلِ عفو تقصیر ہے۔ اسی لیے اُس نے ملکھاں کی آنکھوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی، کہ اگر وہ اِن آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ لیتا تو وہ ان آنکھوں کی ہتک ہوتی، البتہ اس پاکباز انسان نے آنکھوں کی عظمت اور تقدس کا اعتراف کرتے ہوئے ہی ایک ایسی بات کہدی ہے جو اس نیک دل کے اندر چھپے ہوئے فن کار کی کہی ہوئی بات ہے۔ یہ بات خود اُس کے لفظوں میں سن لیجیے:

"مَیں نے اِن چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اُس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا" اور چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے کسی چیز کا مطالعہ کر لینے کی استعداد اللہ کی دین ہے اور اسی نے ندیم کو، کہ جو عظیم انسان ہے، عظیم فنکار (اور اس جگہ یوں کہنا چاہیئے کہ عظیم افسانہ نگار) بنایا ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے اُس کے افسانوں پر کچھ کہنے سے پہلے میرا یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آنکھوں کے متعلق ندیم کا ایک واضح فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ ندیم نے ایک جگہ پوری طرح مکمل کر بیان کر دیا ہے۔ ندیم کے الفاظ یہ ہیں:

"انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اُس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی ——— لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ

نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے
پہلے میری آنکھیں اُس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں
مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحرا ——— کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں
اور کہیں چراغ بجھتے ہیں ——— ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو
تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔ (گھر سے گھر تک ۲۱۳)

——— (گھر سے گھر تک، ۲۱۳)

آنکھوں میں ندیم نے سب کچھ دیکھا اور سب کچھ پایا ہے اور اسی دیکھنے اور پالینے نے انہیں اپنے گرد و پیش کا مبصر، مفسر، مصور، ترجمان اور وکیل بنا لیا ہے، ایک ایسا وکیل جو خوشیوں کا وکیل بھی ہے اور غموں کا بھی، راحتوں کا بھی، کلفتوں کا بھی۔ زندگی میں جہاں حسن ہے وہ اس کی وکالت میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس حسن کو اللہ کی دی ہوئی نعمت سمجھ کر اس سے پوری طرح لطف اٹھاؤ، اور زندگی میں جہاں کہیں حسن نہیں ہے یا جہاں کہیں کسی نے کسی کا حسن (جسکا دوسرا نام اکثر اوقات حق بھی ہے) چھینا ہے یا اُسے اچھی زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم کیا ہے، اسے مجبوری اور بے بسی کا صیدِ زبوں بنایا ہے۔ زندگی کو حسن سمجھنے والے ندیم کا دل تڑپ اُٹھتا ہے اور وہ مظلوم، مجبور اور بے بس کا وکیل بن گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ نے ندیم کے فکری مسلک کے نزدیک آنکھ کو دل کا آئینہ بنایا ہے۔ دل میں طوفان اُٹھتے ہیں تو آنکھوں میں طوفان اُمڈ آتے ہیں اور دل میں بہاریں کھلتی ہیں تو آنکھوں میں ان کی شگفتگی اور رنگینی چمک

اُمڈتی ہے۔ انسان کا دل خوشی کی گرمی سے پگھل جائے تو آنکھوں سے گرم موتیوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے اور دل غم کی آگ سے جلنے لگے تو آنکھوں کے اِن پیمانوں سے شعلے چھلکنے لگتے ہیں۔ ندیمؔ کی زندگی میں اور اِس لیے اُس کی لکھی ہوئی کہانیوں میں آنکھ دل کا سفیر ہے اور اِس سفیر کی ترجمانی کا وسیلہ ——— پرمیشر سنگھ کے "وہ آنسو ہیں جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے (بازارِ حیات، ۲۷،

شیرازہ" وائلن بجاتے بجاتے رونے لگی۔ پھر ایک دم اُس نے وائلن کو صوفے پر پھینک دیا اور دُوسرے کمرے میں بھاگ گئی" ——— (بازارِ حیات، ۴۰)

اِس رونے کو تم کیا سمجھو گے کہ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ وہ صرف میرے لیے رو رہی تھی (نوشابہ کے اَن دیکھے آنسوؤں پر خونِ جگر والے مالک کا تبصرہ) ———
(بازارِ حیات، ۱۵)

" نیکاں نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا وہ رو رہی تھی (بازارِ حیات، ۱۵۰)

" اُن کے (یعنی کفن دفن والے میاں سیف الحق کے) چہرے پر غیر قدرتی سی سُرخی آگئی تھی اور داڑھی کے بالوں میں اٹکے ہوئے آنسوؤں نے آنسوؤں کے لیے جگہ خالی کرتے ہوئے اُن کے سینے پر ٹپک رہے تھے۔" (بازارِ حیات، ۲۵۶)

اور جب روتی ہوئی زینو نے پڑوس میں جا کر معافی مانگ لی تو زخمی پڑوسن بھی رو دی۔ (بازارِ حیات ۲۵۶)

" کیا ہوا؟ کسی نے پوچھا؟ اور پھر بھاگاں نے جیسے ایک مژدہ سُناتے ہوئے کہا: "بی بی رو رہی ہے" (برگِ حنا، ۳۹)

ندیمؔ کے افسانوں کے کرداروں کی آنکھیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور ان آنکھوں

کی نمی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس اضطراری بلاوے میں ایک طرف تو اِس نازک لطیف اور تعامل بےشک احساسِ جمال اور ادراکِ جمال کو دخل ہے جس کا ذکر میں نے بڑی تفصیل سے ابھی آنکھوں کے نقش دکھانے کی کوشش کرتے وقت کیا ہے اور دوسری طرف اُس رقتِ قلب کو جو آنسو بن جانے کے ہزار بہانے ڈھونڈتی ہے۔ آنسو کہنے کو تو غم کا ترجمان ہے لیکن ندیم کے انسان دوست اور انسانیت پرست دل نے اِس سے نہ جانے کیا کیا معنی اور مفہوم نکالے ہیں اور معانی اور مفاہیم کی اس کثرتِ تعبیر سے اُن کے افسانوں کے ہر صفحے میں نرمی بھی پیدا ہوئی ہے اور گرمی بھی اور جس افسانہ نگار کے مزاج میں نرمی اور گرمی کی یہ کیفیتیں اس طرح جمع ہو جائیں جیسے ندیم کے دردمند دل میں تو اِس کی رومانیت اور حقیقت پسندی کی حدیں جمال پرستی اور مثالیت پسندی سے جا ملتی ہیں اور اُس کی آنکھیں زندگی میں وہ سب کچھ دیکھتی ہیں جو انہیں نظر نہیں آتا۔ آرزوئیں حقیقتیں بن جاتی ہیں اور لوگ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ افسانہ نگار نے ہمیں وہ دکھایا ہے جس کا ہماری دیکھی ہوئی دنیا میں وجود نہیں۔ اس نے ہمیں وہ دکھایا ہے جسے ہمارا تجربہ ممکن نہیں سمجھتا۔ لیکن کسی کو کیا خبر کہ افسانہ نگار کی بصیرت بیں نظر نے جو کچھ دیکھا ہے اور جس کی تصویر کھینچی ہے وہ اُس کے لیے سچ مچ ایک زندہ حقیقت ہے —— وہ اس عالمِ تحیر سے گزر چکا ہے جس میں اُس کا قاری اب تک بھٹک رہا ہے۔ اور اِس لیے اُس نے کبھی کبھی ایسی باتیں کہی ہیں جنہیں مشاہدے سے آگے بڑھ کر ادراک کی باتیں کہا جا سکتا ہے اور جن میں تحیر، آرزو اور جستجو کے پہلو سے ایک ایسی حقیقت کا رنگ غالب ہے جس میں جذب و استغراق یعنی عارفانہ

کو حقیقی تجربات سمجھنے لگتا ہے۔ ندیم کے افسانوں میں کہیں کہیں حقیقت سے ماورا۔ ایک اور حسین تر حقیقت کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ملتی ہیں جسے کوئی اور اپنے مکمل روپ میں نہیں دیکھتا، اُسے ندیم کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے احساسِ فن اور احساسِ جمال نے مکمل دیکھا ہے اور دنیا کی بے یقینی کے عالم سے باخبر ہونے کی بنا پر ایک ذی ہوش انسان کی طرح دوستوں کو وہ اس بات کا یقین بھی دلانا چاہتا ہے کہ اُس کا مبالغہ، مبالغہ نہیں، سچ ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے بیان سُن لیجیے اور دیکھیے کہ ندیم نے حُسن کی ٹھوس حقیقت کو کس کس طرح مکمل حقیقت کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور پھر اسے اپنا مزاج بنالیا ہے:

"میرا ذہن اتنے مکمل حُسن کو گرفت میں لانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا" (بازارِ حیات، ۴۴)

"میرے دل میں اُبال سا اُٹھا کہ خان کو بتادوں کہ اُس کی بیٹی ناقابلِ یقین حد تک حسین ہے"۔ (بازارِ حیات، ۴۵)

"تمھیں یقین دلانے کے لیے میرا قسموں پر قسمیں کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ کہ شیر آزہ دُنیا کی حسین ترین لڑکی ہے"۔ (بازارِ حیات، ۶۰)

"...بہت بھرائی کی تخلیق کرتے وقت قدرت نے اپنے اُوپر کوئی اِلزام

نہیں لینا چاہتا تھا۔" (بازارِ حیات ، ۱۴۱)

" میں نے ایسا حسن پچاس سال کی عمر میں اور کہیں دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔" (بازارِ حیات ، ۲۷۰)

" راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا تو اُسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔"

—— (گھر سے گھر تک ، ۴۰)

حُسن کے حسین اور مقدس ہونے اور اُس کے قرب کی ساعتوں کو زندگی کی سب سے خوبصورت اور سب سے پاکیزہ ساعتیں سمجھنے کا احساس اور ادراک ندیم کی رُومانیت ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے کوئی عیب کی بات سمجھ لیجیے۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا، اور وُہ یُوں کہ حُسن کے وجُود کے اسی غیر معمولی ادراک ہی نے اُسے زندگی کو ایسی حقیقت سمجھنے کا عادی بھی بنایا ہے جس کا بسر کرنا انسان کی سب سے بڑی اذیت اور اُس کا سب سے بڑا عذاب ہے اور انسان خود انسان کے ہاتھوں اس عذاب میں مبتلا ہے —— اُس کی توہم پرستی اس کی رواج پسندی، اُس کا طبقاتی اُونچ نیچ کا وجُود، وہموں، رواجوں اور ناداریوں کے جال میں جکڑی ہوئی دُنیا میں ہر لمحے ایک طبقے اور دُوسرے طبقے کا تصادم، کشمکش، پیکار کو جنم دینے اور مجبوروں اور بے بسوں پر ہمیشہ غالب آجانے والا وُہ خونیں پنجہ جسے

آپ عادتاً استحصال کے بجائے EXPLOITATION کہنا شاید زیادہ پسند کریں' انسان کا گلا گھونٹ رہا ہے اور ندیم جسے قدرت نے صرف حسن کے رُوپ دیکھنے اور دکھانے کے لیے پیدا کیا تھا، قسمیں کھا کھا کر آپ کو یہ یقین دلانے کے باوجود کہ انسانی حسن میں "مسجدوں کی محرابوں اور گنبدوں کا سا تقدس ہے"۔ (بازارِ حیات) اُس زندگی کا ترجمان بن گیا ہے جو انسان کے لیے عذاب سے بھی بڑا عذاب ہے۔

"سناٹا" کے افسانوں کا تجزیہ کرتے وقت بھی میں نے یہی بات کہی تھی اور یہی بات "سناٹا" کے بعد کے تین مجموعوں کے افسانوں سے بھی ظاہر ہے کہ قسامِ ازل نے جس ندیم کو حسن کے تقدس اور پاکیزگی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے والی چشمِ بینا کی دولت عطا کی ہے اُسی نے اُس کے سینے کو' ایک دلِ دردمند کا مسکن بھی بنایا ہے اور یوں اِس کے افسانے اب بھی بہ یک وقت مقدس رُومانیت اور تلخ حقیقت کے افسانے ہیں۔ ندیم نہیں بدلا اِس لیے اُس کی کہانیاں بھی نہیں بدلیں — لیکن یہ دعویٰ بھی آپ کو میرے بہت سے دعووں کی طرح مجنونانہ معلوم ہوگا کہ ندیم نہیں بدلا۔ لیکن میں اپنے اِس جنون کا ڈھنڈورا پیٹ کر کہتا ہوں کہ ندیم نہیں بدلا۔ اِس لیے کہ وہ بدل ہی نہیں سکتا۔ اُس کا دل بدل جانا قانونِ قدرت اور منشائے الٰہی کی نفی ہے۔ منشائے الٰہی نے اسے دو رُوپ دے کر پیدا کیا تھا، آنکھوں والا رُوپ اور دل والا رُوپ — اِس کے وہ دونوں رُوپ اب بھی اپنے افسانوں میں اُسی طرح اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں جیسے ۱۹۵۲ء میں' لیکن قدرت کا ایک قانون اور بھی ہے کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی دُنیا انسان کے رُوپ کر

غیر محسوس طریقے پر بہت آہستہ آہستہ بدلتی بھی رہتی ہے کہ اُس کی اساس تو جُوں کی تُوں رہے لیکن اس کے رنگ میں نکھار اور رُوپ میں اُبھار بھی آ جائے اور یہی نکھار اور اُبھار ہے کہ جس سے انسان کے سوچنے اور اس سوچ کو ظاہر کرنے کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں جن کا اسوقت ذکر ہے احساس کی شدت زیادہ گہری ہے اور بیان کا جوش زیادہ نمایاں ہے بشریت مبالغہ بن گئی ہے اور طنز جو سوز و گداز کا ایک پردہ ہے، زیادہ تیکھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس مبالغہ نما شعریت میں بلا کی اثر انگیزی ہے کیونکہ دونوں کا سرچشمہ فن کار کی آنکھوں کی سچائی اور دل کا خلوص ہے۔ "بازارِ حیات"۔ "گھر سے گھر تک" اور "برگِ حنا" کے افسانے پڑھ کر کوئی ندیمؔ کو اس عہد کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانے یا نہ مانے لیکن اُس سے یہ ہٹ دھرمی ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ اُس کے عظیم انسان ہونے سے انکار کرے اور اُس کے عظیم افسانہ نگار ہونے والی بات کو اختلافی مسئلہ سمجھ کر خاموش ہو جائے۔

کوئی مجھ سے ندیمؔ کے زیرِ بحث افسانوں کا خلاصہ دو جملوں میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گا کہ اُن کی کہانیاں زندگی کے زہر اور اُس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کی بہترین قدروں کی غیر واعظانہ تلقین کی کہانیاں ہیں۔ اور میں آپ کی طرح اس بات پر بھی ایمان رکھتا ہوں کہ بے عیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔۔۔ کہئے تو یہ بات میں قسم کھا کر بھی کہہ دوں۔

اسلوب احمد انصاری

احمد ندیم قاسمی اور اُردو افسانہ

پریم چند کے دَور کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے سستے پروپیگنڈے کا آلۂ کار نہ بناتے ہوئے زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لیے استعمال کیا۔ اِن میں احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو افسانے نے تدریج نہیں بلکہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کی ہیں۔ اور اس کے نشو و ارتقا میں غیر ملکی افسانوں کے ترجموں اور خود یہاں کی سُرعت سے بدلتی ہوئی معاشی اور اجتماعی زندگی کے حالات نے خاصا حصّہ لیا ہے۔

افسانے کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ اِس میں ایک منفرد تجربہ، مُشاہدے کی ایک قاش، تاثر کی ایک تھرتھراتی شعاع ہی بس سکتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ، یہ مشاہدہ، یہ تاثر ایک جامِ جہاں نُما ثابت ہوتا ہے۔ جس کی تجسیم کے وسیلے سے حقیقت کے بے شمار گوشے سمٹ کر روشنی میں اُبھر آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار زندگی کے خلفشار میں سے چند جاذب نقطوں کو چُن کر علیحدہ کر لیتا ہے اور پھر انہیں ایسی دلآویزی، شدّتِ تاثیر اور قیمت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان پر طاری خارجی اور اندرونی حقیقتوں کا

ادا کر سکے۔ غالب کے الفاظ میں قطرے میں دجلہ کا نظارہ کرنا اور دوسروں کو کرانا افسانہ نگار کے لئے ایک بنیادی فنی تقاضا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، ندیم قاسمی کے یہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے اور ان کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کے ابتدائی اور بعد کے دور کے افسانوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مقصد کا اظہار برملا ہوتا تھا اب فنی آداب کے پردوں میں چھپ کر سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب افسانے ایک سطح اور معیار کے نہیں ہیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں لیکن ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جسے محض حسنِ نگارش کی کرشمہ سازی کہا جا سکے۔ یا تفریحِ طبع، لذتیت اور برہنگی کے جذبے کی نمائش کا نتیجہ کہہ کر اس پر فردِ گیری کی جا سکے۔ کیونکہ ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی ایسے تجربے یا حادثے پر کی گئی ہے، جو انسانی روابط کے ڈھانچے کو بہت دیر تک اور دور تک متاثر کرتا ہے۔ ان افسانوں میں سے بیشتر پنجاب کے دیہاتوں میں بسنے والوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہیں۔ اس زندگی کے پیچھے برسوں کی روایات، نظامِ معاشرت، عقائد اور توہمات کا سہارا ہے۔ اور افسانہ نگار اس فضا میں سانس لینے والے کسانوں اور زمینداروں، ان کے بیوی بچوں، ان کے کھیت اور کھلیان، ان کی چوپال، ان کے کنوؤں، چشموں اور جانوروں تک سے ایسی دلچسپی اور ہمدردی رکھتا ہے جو پریم چند کے علاوہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی ان افسانوں کی کامیابی اور تاثیر کا راز بھی ہے۔ اس لئے کہ جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت صحیح اور براہِ راست ہو اسے

اگر خام مواد کے طور پر کام میں لایا جائے۔ اور تخیل کی قوت کو اس بُنیاد پر عمل کا موقع دیا جائے تو اس طرح حقیقت تخیل کی مطیع بھی رہے گی اور تابناکی بھی حاصل کرے گی۔ شاید افسانہ نگار نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ متوسط اور زیادہ تر نچلے طبقوں کی زندگی میں، جو زمین سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ بُنیادی انسانی محرکات کا مُطالعہ جس بے ساختگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اتنا شاید ان لوگوں کے سلسلے میں ممکن نہ ہو جن کی فطرتِ اصلی کو تہذیب کی چمک دمک ملوث کر دیتی ہے شہری زندگی سے متعلق ندیم قاسمی کے افسانے کمزور ہیں۔ ان میں فنی ربط کی کمی ہے۔ کردار نگاری پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط نہیں اور ان میں وہ رچاؤ ہے جو مشاہدے اور نقطہ نظر میں نکھار اور تیکھا پن پیدا کرتا ہے۔ "ہزا من فضل ربّی" "بھرم" "بندگی بے چارگی" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں میں ایک عمل ارتقا ملتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شروع کے افسانوں میں وہ چیزوں کو جیسا دیکھتے ہیں، ان کی کم و بیش ویسی ہی عکاسی کر دیتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ ان کے محرکات کا پتہ لگائیں اور انہیں بے نقاب کریں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ محض صورتِ حال میں افسانہ نگا کی دلچسپی کچھ عرصہ بعد کرداروں میں دلچسپی کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ پھر یہ آخری دلچسپی بھی اعمال کے مطالعے سے تجاوز کر کے داخلی کیفیتوں کے تجزیئے میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح انسانوں اداروں اور مروجہ اور جکڑے ہوئے نسلی اور طبقاتی میلانات کے خلاف احتجاج، جھلاہٹ، اور کبیدگی ایک ایسے خاموش اور موثر طنز میں بدل جاتی ہیں جس کی نوک تیز اور جس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ ندیم قاسمی کے افسانوں میں متانت، میانہ روی، دلسوزی اور سمت و رفتار

کا توازن ہمیشہ نمایاں خصوصیات میں رہا ہے۔ اِن سب کی تہ میں انسان دوستی کا وہ جذبہ ہے جو انہیں گرد و پیش کی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنے دیتا۔ انسان اپنے عقائد، تعصبات اور برتاؤ میں جیسا کچھ ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن یہ خواہش بھی افسانہ نگار کا دامن نہیں چھوڑتی کہ وہ ان بندشوں سے اُونچا اُٹھ کر ان امکانات کو آزمائے اور پُورا کرے، جو اس کے اندر چھپے ہوتے ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں کے موضوعات وہ مُعاشی ناہمواریاں ہیں، جو ہماری زندگی میں قدم قدم پر موجُود ہیں، ان کی وجہ سے ظلم و استحصال کی بے شمار شکلیں بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور سیاست اور مذہب کے ٹھیکیدار ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر انہیں ہوا دیتے رہتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریاں ہیں۔ جن کا نشانہ وہ ضرورت مند بنتے ہیں جو اپنی مادی ضروریات سے مجبُور ہو کر بہ خوشی حکومت کے مقاصد کی برآری کے لئے اپنے آپکو پیش کر دیتے ہیں۔ فسادات اور ان کے عواقب ہیں، جو آزادی کی نیلم پری اپنے جلو میں لیکر آئی تھی، انتقام اور رقابت کی وہ آگ ہے جو قبائلی انسان کے کردار میں اتنی نمایاں تھی اور اسے معمُولی سے عذر پر انسانوں کو خاک و خون میں ملا دینے پر اکساتی رہتی تھی۔ یہ آگ آج بھی دیہاتوں میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتی ہے۔ اور فطرتِ انسانی کی وہ عجوبہ زائیاں ہیں، جو نہ انسان کو ایک مرکز پر ٹھیرنے دیتی ہیں، اور نہ کسی ایک وسیع شاہراہ پر چاہے وہ اخلاق کی ہو یا مذہب کی، یا انسانیت کے سوز و ساز کی، گامزن ہونے دیتی ہیں۔ عشق و محبت کا موضوع انسان کی زندگی میں اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہمیشہ موجُود رہا ہے اور ہمیشہ موجُود رہے گا لیکن ندیم

قاسمی کا کوئی افسانہ محض عشقیہ افسانہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ کیونکہ عشق و محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے یہاں ہمیشہ سماجی محرکات کے تانے بانے سے متاثر ہوتی ہے، انکے یہاں نہ اس رومانیت کیلئے کوئی گنجائش ہے جو خواہشات کو بے لگام چھوڑ دینے سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس لذتیت کے لیے جو ذہنی اور اخلاقی عدم توازن تک لے جائے۔ ان کے یہاں صرف محبت کا رومان ہی نہیں، اس کی محرومیاں اور مجبوریاں بھی ہیں۔ اس لیے شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسان کی جنسی اور حیاتی زندگی محض حیاتیاتی سطح پر نہیں بلکہ ایک وسیع چوکھٹے کے اندر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ جہاں زندگی کے دوسرے مطالبات اور ذمہ داریاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں جذبات و احساسات کی دھوپ چھاؤں بہت سے اور متنوع عناصر کے پس منظر ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، ندیم قاسمی کے یہاں افسانوں میں متضاد رنگ بھی ملتے ہیں، اور ان کی تخلیق ایک عمل ارتقا سے بھی گذری ہے۔ وہ کسی مخصوص فارمولے کو اپنا کر یا کسی نظریئے کا پرچار کرنے کی خاطر افسانہ نہیں لکھتے لیکن زندگی میں چاروں طرف جو ظلم اور ناانصافیاں، پریشانیاں اور محرومیاں بکھری ہوئی ہیں اور فطرتِ انسانی کے جو پیچ و خم ان کے تجربے کی زد میں آتے ہیں وہ انہیں تخلیق پر اکساتے ہیں۔ ان کے ایک افسانے "میرا دیس" (طلوع و غروب) کو لیجیے۔ اس میں اس حقیقت کی کسی حد تک براہِ راست ترجمانی ہے کہ غربت اور طبقاتی ناہمواری کی وجہ سے کس طرح زبردست زیر دست پر غالب رہتا ہے اور اسے اپنی کام جوئی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور افسانہ ہے "جب بادل اُٹھے" (در و دیوار) اس افسانے کا ماحول بھی دیہات

کا ماحول ہے۔ اور یہ ایک مہاجر کی داستان ہے جو اپنا سب کچھ کھو کر اپنے وطن کو خیرباد کہتا ہے لیکن نئے وطن کا زمیندار بھی بہرصورت زمیندار ہے۔ وہ اپنی سرشت کو بدل نہیں سکتا۔ اور مزارع اس کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں حریف ناتواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے مدافعت کی کوشش بھی کریں تب بھی انہیں ذلت اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے یہ افسانہ "پردیسی" سے بہتر ہے۔ لیکن "کنگلے" اور "پکا مکان" (طلوع و غروب) دونوں اختصار کے باوجود زیادہ کامیاب اور موثر ہیں کیونکہ ان میں معاشی تنگ دستی کو جاہ و حشمت اور اثر و رسوخ کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑتا ہے "جب بادل امڈے" اور "پکا مکان" میں جو بات مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ نچلے اور پسماندہ طبقے اوپر اٹھنے اور اپنی جائز خواہشات کی تسکین کے لئے کتنی بھی جدوجہد کریں وہ بالاتر ان قوتوں سے شکست کھا جاتے ہیں جن کی جڑیں ہمارے نظام میں گہرے طور پر پیوست ہیں۔ اور جنہیں حکومت اور مذہب دونوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ "کنگلے" میں ناداری، بیکسی اور جہالت مجسم ہو کر سامنے آگئی ہے۔ لیکن "موچی" (بازار حیات) ان سب افسانوں میں ممتاز ہے۔ اس میں منظم طور پر کوئی احتجاج نہیں لیکن نچلے طبقے کے ایک مزدور نادر کی آرزوؤں ان تھک محنت اور جاں نثار خدمت کی جس طرح پامالی بلکہ تذلیل راجہ شیر خاں کے ہاتھوں ہوتی ہے اسے دیکھ کر دل پر گھونسا سا لگتا ہے۔ اسی طرح "اصول کی بات" (گھر سے گھر تک) میں جب ایک زمیندار مکر و فریب کے سارے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک مصیبت زدہ کسان کی لڑکی کو اپنی حرص و آز کا نشانہ بنانے کا عزم کرتا ہے تو اس پورے معاشرتی نظام سے جس میں انسان محض مہروں کی طرح استعمال کئے جاتے ہیں شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں گاؤں کے پورے ماحول اور زمیندار کے اس

ماحول میں اہمیت کو جزئیات نگاری کے آئینے میں بڑی خوبی کے ساتھ اُبھارا گیا ہے۔ افسانے کے عنوان میں جو تیکھا طنز چھپا ہوا ہے اِس کا راز آخر میں کھلتا ہے۔

یہاں ایک اور افسانے کا ذکر ناموزوں نہ ہوگا۔ اِس کا عنوان ہے "کنجری" (سناٹا) غربت کے اثرات سے زیادہ اس افسانے میں اس عمل کو واضح کیا گیا ہے جس کے ذریعے رُوح پر کثافت کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی اصل صُورت پہچانی نہیں جاتی۔ سرور اور اس کی ماں عمر سے جنس فروشی کا کاروبار چلاتے رہے ہیں اور اس میں اِتنے ڈوب چکے ہیں کہ ان کی معمولی سی قوتِ امتیاز بھی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ وہ دونوں سرور کی نوجوان بیٹی کمالاں کو جس بے غیرتی کے ساتھ گناہ کی دلدل میں دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے گھن آنے لگتی ہے۔ پھر کمالاں کی مدافعت جس طرح رفتہ رفتہ کمزور پڑتی جاتی ہے وہ عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت پسندانہ بھی۔ آخر آخر میں کمالاں غربت اور ناداری سے مجبور ہو کر اسی راستے کی طرف بڑھتی ہے جسے وُہ شروع میں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

اِس مجموعے میں "رئیس خانہ" ایک معرکے کا افسانہ ہے۔ غربت کے زیر اثر انسانی بے بسی کی ایک دلدوز تصویر ہے جسے انتہائی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اِس میں "رئیس خانے" کے مادی اور طبعی وجود کو دلکش پس منظر اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی روشنی میں اُبھارا گیا ہے۔ اِس میں پہاڑی میاں بیوی یعنی فضلو اور مریاں کی محبت کی سادگی، سرشاری اور سپردگی کی تصویر بھی ہے اور یُوسف جیسے رئیسوں کے چونچلوں اور فریب اور ریاکاری کا عکس بھی۔ اس افسانے میں تحیر کا عنصر بھی ہے۔ کیونکہ آخر وقت تک یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا لیکن اس پُرسکون اور پُرفریب انداز سے کہیں زیادہ اہم خود یُوسف، مریاں کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے، جذبات اور

احساسات کی وہ کشمکش ہے جس میں فضلو برابر ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ حق وصداقت اور گناہ کی ترغیب کے درمیان جو آویزش اس کے دل میں پیدا ہو کر مختلف مرحلوں سے گذرتی ہے اور جس طرح فضلو اور مریاں کی ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ (جو آخر میں شکست وریخت کے باوجود عود کر آتا ہے) یوسف کی عیاری اور جنسی بھوک سے مات کھا جاتا ہے۔ اسے حیرت انگیز فن کاری کے ساتھ اُبھارا گیا ہے۔ افسانے پر بہترین اور آخری فیصلہ خود فضلو ہی کر دیتا ہے: "میری غریبی مجھے دھوکہ دے گئی مریاں" فضلو نے رُکتے رُکتے کہا" ہر اعتبار سے یہ ایک مکمل افسانہ ہے۔

اسی طرح "ثواب" (گھر سے گھر تک) اور الحمد للہ (سناٹا) میں بڑا فرق ہے۔ "ثواب" میں فضا آفرینی قابلِ توجہ ہے۔ جیسور کے کنوئیں میں ڈوب جانے کی وجہ سے پورا گاؤں غمگینی کی چادر میں لپٹا ہوا ہے اور فضا بوجھل اور اداس سی لگ رہی ہے۔ گاؤں کے سب رہنے والے کرماں کی مصیبت میں برابر کے شریک اور اس کے لیے ہر جتن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر اگر ایک طرف کرماں کے دل میں امید و بیم کی متضاد کیفیات کی مصوری کی گئی ہے تو دوسری طرف ہماری نظریں اس بے حسی اور لاتعلقی کو بھی دیکھ لیتی ہیں جو محض مذہب کے خول سے چمٹے رہنے والوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی انسانیت کو جِلا دینے کی بجائے انہیں محض مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہے۔ ملک حسن خان ایسے ہی ایک انسان کا مُرقع ہیں۔ "الحمد للہ" میں مولوی ابوالبرکات اپنی بُنیادی ضروریات پورا کرنے کے لیے چودھری فتح داد خان کے لُطف وکرم پر تکیہ کرتے ہیں۔ اور ان "کمی سے لگے وظیفوں" پر جو ان کے معتقدین ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک مٹھی بھرن

کی شادی اِنہی سہاروں کی بدولت بخیر و خوبی انجام پاتی ہے۔ لیکن اب اپنی دوسری بیٹیوں کی شادی کی فکر کھانے لگتی ہے۔ رہنے سہنے کے پرانے طور طریقوں اور سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں تبدیلی آگئی ہے۔ جس کا اثر مولوی ابل کی کسبِ معاش پر بھی پڑا ہے۔ اسی دوران میں مہرن کے یہاں سے ولادت کی خبر آتی ہے اور مولوی ابل اور اِن کی بیوی دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ آخر بیٹی کے یہاں خالی ہاتھوں کیسے جائیں۔ فتح داد خان اپنی علالت کے زمانے میں بھی مولوی آبل کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتے رہتے ہیں۔ جب آخری بار مولوی آبل چودھری صاحب کی مزاج پُرسی کے لیے جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور اِن کے مرنے کی اطلاع انہیں ملتی ہے۔ تو اِس خیال سے اُچھل پڑتے ہیں کہ اِن کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں جو کچھ ہاتھ آئیگا اس سے چشم زدن میں سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔

"اور مولوی آبل اس بجھتے ہوئے لہجہ میں چلّایا " مُبارک ہو عارف کی ماں!
تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھی، اللہ جل شانہٗ نے چولے، چینی اور ٹوپی
تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس رُوپے ضرور ملیں گے۔" ؎۱۲۱

سچّے مذہبی آدمی ہونے کے باوجود مولوی آبل آخر پیٹ کے تقاضوں کو کہاں لے جائیں مذہب کے ذریعے تزکیۂ نفس ممکن بھی ہے اور ہوتا بھی رہتا ہے لیکن اس سے مادی ضروریات کی تکذیب کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد ایک دوسرا ڈرامائی موڑ آتا ہے جو عبرتناک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔

"اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی آبل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اُس کی اُوپر

اتھی بڑی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا چلا چلا کر رونے لگا۔ اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا " (۴۹)

ثواب کے مقابلے میں یہ افسانہ یقیناً زیادہ گٹھا ہوا اور زیادہ پختہ ہے۔

جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے سلسلے میں ندیم قاسمی نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ علاوہ اس کشت وخون اور مالی نقصان کے جو جنگ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ فوجی بھرتی پر جو چیز نوجوانوں کو آمادہ کرتی ہے وہ غربت اور افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور پھر اگر سپاہی میدان جنگ میں ہلاک ہو جائیں تو ان کے وارثوں کو پنشن بھی ملتی ہے اور یوں بے کسی کے مارے یہ نوجوان خوشی خوشی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو تباہی اور عبرت کے غار میں جھونک دیتے ہیں۔ " سپاہی بیٹا " (درودیوار) " بابا نور " اور " ہیرا " (بازارِ حیات) اس سلسلے میں تین قابلِ توجہ مطالعے ہیں۔ پہلے دو نسبتاً سادہ ہیں اور تیسرا پیچیدہ۔ لیکن ان تینوں میں جو بات مشترک ہے وہ نفسیاتی گرہیں ہیں جو جنگ سے متاثر ہونے کی وجہ سے سپاہی کی بوڑھی ماں، بابا نور اور ریام کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ ریام کا ذہن تیسرے افسانے میں جنگ کی خونریزی اور بربریت سے اس حد تک متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف اس کی شخصیت میں سینکڑوں الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں بلکہ شخصیت بالکل چکنا چور ہو گئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے ہیرا کی زندگی بھی اس کے غیر فطری اور وحشت ناک طرزِ عمل کا ہدف بنتے

کی وجہ سے اجیرن ہوجاتی ہے۔ "دار ورسن" (بازارِ حیات) میں موت ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ زندہ انسان کو پھانسی پر چڑھانے کا پیشہ نتھو کو ورثتاً اپنے باپ سے ملا تھا۔ متواتر تجربے نے موت کے سلسلے میں اس کے رویّے کو خلافِ معمول بنادیا ہے۔ پھانسی پر چڑھانے میں جو انتہائی ایذا رسانی کا تجربہ کسی شخص کو ہوسکتا ہے، اسے اس نے اپنے لیے "لاش کو گلاب کا پھول پیش کرلے اور ڈبڈبائی آنکھیں جھکائے ہاتھ جوڑ کر یہ کہنے سے مجھے معاف کردینا دوست" متوازن بنالیا ہے۔ لیکن جب اسے یہ کام خود اپنے بیٹے خیرو کو سُولی پر چڑھاتے وقت کرنا پڑتا ہے تو اس وقت یہ سہارا بالکل کام نہیں آتا۔

ندیم قاسمی فطرتِ انسانی کے بہت اچھے نبض شناس ہیں۔ انسان اپنے آپ کو جس جس انداز سے دھوکے دیتا اور اپنے لیے جھوٹے سہاروں میں تسکین کا پہلو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کی بہت اچھی نشان دہی ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ "گھر سے گھر تک" اس کی ایک بیّن مثال ہے۔ یہ افسانہ بظاہر مزاحیہ لیکن دراصل عبرتناک ہے، اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی اصلی حالت کو چھپانے اور دوسروں کی نظروں میں عزّت اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ اور دوسروں کو کس کس انداز سے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ "خالتو" (گھر سے گھر تک) میں وہ کشمکش نمایاں کی گئی ہے۔ جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہمیشہ رہی ہے جوانی میں جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ اور بڑھاپا اور تنگ دستی اگر ایک جگہ جمع ہوجائیں تو انہیں شباب کی سرمستیوں کے سامنے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ پیر بخش اور ان کی بیوی اور حبیب احمد اور خالتو کے تعلقات کا تانا بانا اسی راز کو فاش کرتا ہے۔ اس افسانے میں بہت سے نئے رنگ

مراد آتے ہیں۔ حبیب احمد اور فاطمہ کے رشتے پر دل شکستہ پیر بخش کا ایک تاثر یوں ادا کیا گیا ہے :

"پیر بخش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔ اور ہر طرف پودوں کے ننگے ٹنڈ اُگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے لیے وہ اپنی چارپائی کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا۔ جہاں حبیب احمد کی شادی کے بعد نیک بخت اور اس کے کھوٹے رہتے تھے۔ اور جہاں فاتحہ خوانوں کے لیے چٹائی بچھی تھی"

ازدواجی زندگی کی وہ ناہمواریاں جو عمر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتی ہیں "بیٹے بیٹیاں" (برگ حنا) میں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں جذبات کا مد و جزر خارجی حالات کے پیچ و خم سے منسلک ہے۔ اور جوانی کے فطری احساسات کمزور اور عارضی مرافعات اور پیش بندیوں کو توڑ کر جس طرح اُمڈ پڑتے ہیں انہیں بہت ضبط اور سلیقے کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ اس افسانے میں عمل اور کردار دونوں ایک مبہم فضا کے اسیر ہیں۔ افسانہ بہت آہستگی اور نرم روی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور بہت سی باتوں کے سلسلے میں محض سرگوشی کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ بادی کمہار کے بیٹے مراد کی جب بات آنکلتی ہے، تو عمل میں تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ بھید بھی کھلتا ہے کہ ایک عارضی سمجھوتے کے باوجود جو ضرورت اور مصلحت نے عائد کیا ہے۔ جبلی تقاضے اپنی نکاسی کے لیے راستہ نکال لیتے ہیں۔ یہی کیفیت "ست بھرائی" (بانار حیات) میں ملتی ہے۔ اور جوانی کی سرمستی اور خودسری کے سامنے ماں باپ کی محبت

بالآخر سپر ڈال دیتی ہے۔

وہ اور بہت اچھے نفسیاتی مطالعے "ماتم" (برگِ حنا) اور "کفن دفن" (بازارِ حیات) میں ملتے ہیں۔ پہلے افسانے میں ایک شادی شدہ جوڑے کی باہمی محبت اور اٹکھیلیوں کا نقش بہت ابھار کے ساتھ اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر میاں جی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی پر فرطِ غم کی وجہ سے سکتے کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کا ازالہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ماضی کی کتنی بھولی بسری یادیں دماغ میں کلبلانے لگتی ہیں مگر بے سود۔ تاآنکہ اُس پلیٹ کے کرچی کرچی ہو جانے سے، جو ایک دفعہ میاں جی نے خریدی تھی جس کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک حسینی لڑکی کی تصویر تھی، "جو انگوری بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکرا رہی تھی"۔ وہ بند ٹوٹ جاتا ہے، جس پر بیوی کو جذباتی واگذاشت اور تطہیر کا انحصار ہے۔ یہ پلیٹ رُومان اور جنسی لطافت کی بے شمار مرئی اور غیر مرئی کیفیتوں سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اور اسے اس افسانے میں ایک علامتی حیثیت حاصل ہے۔ "کفن دفن" میں کہانی کا تانا بانا بڑی ہوشیاری سے بنایا گیا ہے۔ اس کے آغاز اور انجام دونوں میں ایک اچانک پن ہے۔ غفورے کی مُردہ بیوی کلی کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں میاں سیف الحق کی رقیق القلبی اور جذباتی شدت کا مظاہرہ، جس پر بظاہر ان کے گہرے مذہبی احساس کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ دراصل ایک نجی غم اور نفسیاتی حادثہ کا خول ہے۔ جو ان کے جوان بیٹے حامد کے بے کسی کی حالت میں مارے جانے سے انہیں پہنچا ہے۔ غفورے پر جب یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے تو اس کے اندر سوئی ہوئی خودی جاگ اٹھتی ہے اور اس کی غیرت کو کچوکے دیتی ہے۔ وہ میاں جی

کاشر مندہ احسان ہونے اور اس کا احساس دلانے کے باوجود ان کی خیرات انہیں واپس لوٹا دیتا ہے اور ایسا کرنے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے:

"میاں جی، دیکھئے خفا نہ ہو جایئے۔ آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے میں ایسا کمینہ نہیں ہوں کہ اس احسان کو بھول جاؤں۔ پر بات یہ ہے میاں جی کہ آپ نے تو ملی کی جگہ حامد میاں کو دفن کیا تھا۔ اور میری کلی تو وہیں سڑک کنارے بے کفن پڑی رہ گئی۔ ان روپوں کو چاہے آپ نالی میں پھینک دیجئے پر میں نے تو آج ہی اپنی کلی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا ہے میاں جی۔" ص ۲۱۵

میاں سیف الحق کا کردار خاصا پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف محرکات ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ محرکات کی اس گنگا جمنی میں ان کی شخصیت کی دُوئی کا راز مضمر ہے۔

شروع میں کہا گیا تھا کہ نچلے طبقوں کی زندگی میں ابھی تک اس بربریت کے آثار ملتے ہیں جو قبائلی انسانوں کے ساتھ مخصوص تھی "تبر" اور "گنڈاسا" (ستائل) میں انسانی فطرت کے اسی مظہر کو خوردبینی مشاہدے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ "تبر" میں جذبات کی توانائی، ردِ عمل کی شدت اور انتقام کی آگ ملتی ہے۔ یہی بات "گنڈاسا" میں بھی ہے، وہی خون آشامی وہی تندی، وہی حرارت اور جوشش۔ لیکن اس میں ایک بہت ہی نازک نفسیاتی حقیقت کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ یہ وہ ردِ عمل ہے، جو مولا بخش کے دل پر گُلے کی منگیتر راجو کے حسن کا ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل ایسا غیر شعوری، براہِ راست اور سریع ہے کہ مولا اپنی ساری

ترنگ بھول جاتا ہے۔

"اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے رُوئیں ہیں۔ اور اس کی پلکیں یُوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں، جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مَس کر لیں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرّے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سُوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں۔ اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب سُونگھ رہی ہو۔ اس کے اُوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے۔ جو کچھ یُوں اُچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائیگا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں۔ اور ان بُندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بُری طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جا دے یا چھڑا کر یُوں ہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا۔"

(صفحات ۱۹۰ ۱۹۷)

وہ جمّے سے سربازار تھپڑ کھانے کے باوجود کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتا ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں کردار نگاری اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کے علاوہ منظر نگاری بھی بہت اہم ہے جس سے قابل قدر کے سماج کو پہچانا جا سکتا ہے

اِس میں نسلوں تک سے انتقام لینے، البتہ اُن کے لیے خم ٹھونک کرنے اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دینے سے نہ چوکنے کو قابلِ فخر اعمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں زندگی کی ہیئت اور رسم ہی ایسی ہے کہ ہر چیز صاف اور کھُلی ہوتی ہے۔ محبت بھی اور عداوت بھی، شقاوت بھی اور ترحم بھی۔ وفاشعاری بھی اور کینہ پروری بھی۔

تقسیم سے متعلق فسادات پر اُردو میں کئی اچھے افسانے لکھے گئے۔ مثلاً بیدی کا "لاجونتی" احمد عباس کا "سردارجی" اور پریم ناتھ در کا "آخ تھو"۔ اس موضوع پر ندیم قاسمی کے دو افسانے قابلِ ذکر ہیں یعنی "میں انسان ہوں" (در و دیوار) اور "پرمیشر سنگھ" (ماہنامہ حیات)۔ "آخ تھو" اور "میں انسان ہوں" میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اوّل الذکر میں زہرناکی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ "میں انسان ہوں" زیادہ متوازن اور سچا لیکن تاثیر میں کم نہیں ہے۔ اِس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ "پانی کے ایک گھونٹ" کو رمز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس ازلی اور ابدی تڑپ کی نشان دہی کرتا ہے جو انسان کے دل میں انسانیت کے بقا اور تحفظ کے لیے موجود ہے۔ لیکن فسادات نے جن کی وجہ سے انسانی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور تمام آدرشوں کے پرخچے اُڑا دیے گئے ہیں "پانی کے اس گھونٹ" کو وقتی طور پر انسان کے لیے ناممکن الحصول بنا دیا ہے۔ "پرمیشر سنگھ" کو درجہ اوّل کی تخلیق ماننا مبالغہ نہ ہوگا۔ اوّل الذکر افسانے یعنی "میں انسان ہوں" کی عمومیت یہاں ایک اختصاصی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یا یہ کہیے کہ "میں انسان ہوں" میں صرف تشبیہات ہے۔ "پرمیشر سنگھ" میں تاثرات واضح کرداروں اور صورتِ حال کی شکل میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح "سردارجی" میں تصویر یک رُخی ہونے کے باوجود

کسی قدر غیر متناسب ہو گئی ہے۔ ندیم قاسمی کے یہاں ہر چیز بچی تلی اور نوک پلک سے درست ہے۔ "پرمیشر سنگھ" اُن سب سکھوں اور مسلمانوں سے الگ ہے، جن کے سروں پہ بہیمیت کے بھوت ناچ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس میں ایک سوز، دردمندی اور ولاسائی ہے۔ اس کا اپنا لڑکا کرتارا سنگھ بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔ اسی لیے اس کا دل اتنا حساس ہو گیا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی امر کور کے برعکس وہ چھوٹے سے بچے اختر سے جو اسے فسادات کے دوران مسلمانوں کے قافلے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے مل گیا ہے۔ انتہائی محبت اور لاڈ دلار کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور ہر طرح اس کی ناز برداری کے لیے تیار رہتا ہے۔ امر کور پرمیشر سنگھ کے اس برتاؤ پر تلخی کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی اختر کو برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی کا دل ایک پکا ہوا پھوڑا ہے، جو اب ٹوٹا اور تب ٹوٹا۔ لیکن ہر قسم کی دلجوئی کے باوجود پرمیشر سنگھ اختر کو پوری طرح جیتنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اسے سرحد کے قریب چھوڑ آئے۔ کہانی کا خاتمہ بھی ایک ایسے پر ہوتا ہے۔ اس نیک نیتی کے باوجود پرمیشر سنگھ آخر آخر میں سرحد پر چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو ہو جاتا ہے اور اختر دور خلا میں نظریں جمائے ایک نامعلوم سمت میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک عام سکھ گھرانے کی فضا، سکھوں کی عجیب و غریب حرکتیں، پرمیشر سنگھ کی بیوی اور بیٹی کی زخمی شخصیتیں۔ فسادات کے نتیجے کے طور پر ذہنوں پر خوف اور ناامیدی کے گہرے اور مہیب سائے پرمیشر سنگھ کی معصوم اور دلکش شخصیت اور اختر کے دل میں اپنی ماں کی چاہت اور اس سے جدائی کی ٹیسیں۔ اور اپنے فطری، روایتی اور مانوس تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ رہنے کی تمنائیں

خواہش، حیرت انگیز بصیرت، ایجاز بیان اور گہری ہمدردی کے ساتھ واضح کی گئی ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانے فنی دروبست کے اعتبار سے بھی بہت گتھے ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں بعض جملوں یا ترکیبوں کی تکرار پائی جاتی ہے۔ مثلاً "میں انسان ہوں" میں یہ جملے کئی بار آئے ہیں۔ "یہ پیاس ہی میری تلاش ہے۔ اور زندگی ہے اور آخرت ہے۔ اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں۔" (ص ۹)

اور کیچڑ نے خشک ہو کر میری جڑوں کو کمان کی زہ کی طرح تان رکھا ہے۔ چمکتے ہوئے سبز رنگ کی ایک مکھی بار بار میرے حلق تک گھوم آتی ہے۔ اسے نمی کی تلاش ہے اور میں ایک پیاسا انسان ہوں اور مکئی کے پودوں کی جڑیں گن رہا ہوں۔" (ص ۱۱)

لیکن اس (پودے) کی جڑیں مضبوط ہیں۔ اس لئے یہ تنا کھڑا ہے۔ اور میں زمین پر پڑا ہوں۔ اس لئے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں۔ اس لئے کہ میں انسان ہوں اور میں پیاسا ہوں۔" (ص ۱۱)

"تم پانی کی تلاش میں ہو۔۔۔ مگر کس لئے؟ ۔۔۔ انسانیت کے آخری وارث کے لئے؟ ۔۔۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ خود اپنی پیاس بجھانے کے لئے تمہیں پانی کی تلاش ہے" ۔۔۔ (ص ۲۲-۲۳)

"اور میں اس سوچ میں غرق یہاں مکئی کے ان بے بس پودوں میں گھرا ہوا پڑا ہوں۔ مجھے گھونٹ بھر پانی کی تلاش ہے ۔۔۔ مجھے پانی کی تلاش ہے۔"

مجھے ایک نئی زندگی کی تلاش ہے ۔ مگر میری تلاش بیکار ہے ۔ کیونکہ میں خدا کی مجرب ترین مخلوق ہوں ــــــ میں انسان ہوں"۔ (صـ۲۳ـ۲۴)

" دار و رسن" میں یہ جملے دو مختلف موقعوں پر آتے ہیں ۔

" ایسا پھول سا ہلکا ہاتھ مرنے والے کا کہ سُنتے ہیں ادھر جوان کے قدموں تلے سے تختہ کھسکا ادھر وہ بجتے کے بنائے پھندے میں یوں لٹک گیا، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے"۔ (صـ۸۰)

" خیرو کی لاش رسی سے یوں لٹک رہی تھی، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے"۔ (صـ۱۰۵)

"کفن دفن" میں ایک جگہ یہ جملے ملتے ہیں :

"میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار تارکول پھری چمکتی ہوئی سڑک تھی ۔ جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی، اور اس کے دونوں طرف قدآور درخت سایہ کئے کھڑے تھے ۔ وہ اس سڑک پر کچھ ایسی بے تکلفی سے چل رہے تھے جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات چلیا نوالہ بائیں کی کر رہا ہو مگر نوالہ سیدھا منہ کو جائے۔ البتہ کبھی کبھی اس سڑک پر فصیل سی اُبھر آئی تھی ۔ اور وہ ٹھٹک کر خلا میں تکتے رہ جاتے جہاں انہیں اپنے حامد کی کٹی پھٹی لاش صحن کے عین وسط میں پڑی ہوئی دکھائی دے جاتی"۔ (صـ۱۹۹)

[illegible]

• اور اس بہت بڑے نشیب کے بعد میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار لکڑی کی چکنی ہری سڑک بن گئی جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی اور جس کے دونوں طرف قطار در قطار درخت سایہ کیے کھڑے رہتے تھے۔ وہ اس سڑک پر بھرے کچھ ایسی بے تعلقی اور روانی سے چلنے لگے۔ جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات چلیا فراد بانج کی کر رہا ہو، مگر نوالہ سیدھا منہ کو جائے۔ اب اس سڑک پر وہ پہیل بھی نہیں ابھرتی تھی جس کے پاس کبھی کبھی ٹھٹک کر وہ خلا میں گھورتے رہ جاتے تھے۔ اب حدِ نظر تک مطلع صاف تھا۔" (صفحہ ۲۱)

• شکیں "(برگِ حنا) میں غضنفر کے چہرے کی شکنیں ایک علامتی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ وہ محور ہے جس کے اردگرد کہانی گھومتی رہتی ہے۔ اور "الحمد للہ" میں تو افسانہ نگار نے خود ہی ایک جگہ کہا ہے:

• مولوی آبل کے صرف دو سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح داد خان۔" (صفحہ ۱۳۵)

اس تکرار سے اکثر دو مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں، یا یہ کہیے کہ وہ دو قسم کے اثرات کے حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اول افسانے کی مخصوص فضا آفرینی اور دوسرے خیالات اور تاثرات کی شیرازہ بندی۔ یہ جملے جو اکثر دہرائے جاتے ہیں۔ ایک طرح کے (OVER TONES) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی گونج کہانی کے عمل کے دوران اکثر سنائی دیتی ہے جو تاثر، مرکزی تجربہ یا مشاہدہ، عمل کے لیے نقطۂ آغاز تھا۔ اور جیسے افسانے کے ارتقاء

کے ذریعے وسعت دی گئی ہے۔ وہ اکثر جزئیات نگاری کے گنجان اور دبیز پردے میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اسے پھر سے ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی اس طریقہ کار کو برتنے کا صحیح جواز ہے۔

ان افسانوں میں اکثر جگہ تشویش (SUSPENSE) کی کیفیت بھی ملتی ہے "الحمد للہ" "بیٹے بیٹیاں" "کفن دفن" اور "ماتم" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اس خصوصیت سے یہ مراد نہیں کہ پایانِ کار افسانے کا انجام ایسا ہو جس کی کوئی منطقی توجیہ ممکن نہ ہو۔ یا جہاں عمل کی بنیاد کسی اتفاقی حادثے پر ہو۔ کامیاب "تشویش" پیدا کرنے میں افسانہ نگار اس وقت کامیاب سمجھا جا سکتا ہے، جب ہم انجام کو پہلے سے تو متعین نہ کر سکیں لیکن افسانہ اختتام کو پہنچے، تو ہم بلا جھجک اور ذہنی پس و پیش کے بغیر اسے قبول کریں اور عمل کی مختلف اکائیوں کے درمیان ہمیں ایک منطقی یا جذباتی ربط و تسلسل اور ایک سببی رشتہ نظر آ جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی محسوس کریں کہ جس تجربے یا تاثر کو مجسم کیا گیا ہے۔ وہ غیر متوقع ہونے کے باوجود بھی مانوس اور جانا پہچانا ہے، اس لئے کہ زندگی میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

ندیم قاسمی کے بیشتر افسانوں کا اختتام قابلِ غور ہے۔ اس میں ایک ڈرامائی عنصر کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کہانی کے آخر تک ہمیں عمل کے عواقب کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ اس سے افسانے میں لازمی طور پر ایک سپاٹ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ افسانے کا فن، ناول کے فن کی نسبت زیادہ حسن تناسب اور قطع و برید چاہتا ہے اور اس [illegible] تشنگی [illegible] تمام ہو جائے یا اس کی

انتہا شدید جذباتی طور پر عام میں لائی جا چکیں وہیں افسانہ ختم ہو جائے۔ افسانے کے دوران میں جو نقطۂ ہائے انحراف (SHIFTS) پائے جاتے ہیں۔ وہ سب مل کر ہمیں ایک انجام تک لے جاتے ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد اگر افسانے کو غیر فطری طور پر طول دیا جائیگا تو اس سے وحدتِ تاثر اور قائم کی موزونیت دونوں کو صدمہ پہنچے گا۔ بعض اوقات افسانہ نگار درمیان کے بہت سے نقطوں کو پھلانگ کر انتہا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس انتہا کا رشتہ کہانی کے آغاز سے جوڑے۔ اور اس حرکت اور تموج کو گرفت میں لانے کی کوشش کرے۔ جو افسانے کے ڈھانچے میں موجود ہے۔ "نیا فرہاد" (در و دیوار) "گونج" (طلوع و غروب) "پرمیشر سنگھ" "ہیرا" (بازارِ حیات) "ماتم" "نصیب" (برگِ حنا) "سلطان" (گھر سے گھر تک) "الحمد للہ" "گنڈاسا" اور "چور" (سناٹا) کے ڈرامائی اختتام قابلِ غور ہیں۔

ندیم قاسمی ایک خوش گو شاعر بھی ہیں اور یہ شاعر افسانوں میں جگہ جگہ ہمیں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ دلکش تشبیہات استعمال کرتا ہے۔ یا پورے ایک پیراگراف میں فطرت کی نقاشی کرتا ہے۔ لیکن یہ نقاشی فن برائے فن کی حیثیت سے افسانوں میں جگہ نہیں پاتی۔ ندیم قاسمی کی تحریر اس وقت چمک اٹھتی ہے۔ جب وہ جذبات کی کشمکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لیے فطرت کی نیرنگی اور شادابی کا سہارا لیتے ہیں اور اس کے بے داغ حسن سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی مٹی، ہوائیں، سبزہ زار، ٹیلے اور چشمے، چراگاہیں اور ریگستان، ان سب کی خوشبو اس قدم قدم پر اپنی جانب کھینچتی ہے۔ فطرت انسان کے فن کا

تکملہ بھی کرتی ہے اور انسانی جذبات کو فطرت کے آئینے میں ایک نکھار بھی ملتا ہے۔ ندیم قاسمؔ نے پنجاب کے دیہاتوں میں پلنے والے رومانوں کو جس طرح زندگی، حرکت اور تابناکی بخشی ہے۔ اس کی طرف اشارہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان رومانوں کی ابتدا اور ارتقاء اکثر فطری مناظر کے پس منظر میں دکھائی گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے بے پایاں حسن کا کوئی نقش ایسا نہیں، جس نے ان کی حساس طبیعت کو متاثر نہ کیا ہو۔ چند مثالیں دیکھیے:

"جب پو پھٹنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغربی افق کے قریب اونگھ رہا تھا۔ اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے ہواؤں میں خنکی آگئی تھی۔"

"گیدڑوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں —— ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلووں کو بہت سکون مل رہا تھا۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پر کسی سانولی دلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا۔ اور آس پاس اکیلی دکیلی جھاڑیوں میں ٹڈے بیں بیں چلاتے جا رہے تھے۔" (طلوع و غروب ۲۷۔۲۶)

"غروبِ آفتاب سے پہلے میں حسبِ معمول سید کے ہمراہ باہر کھیتوں میں گیا، تو شفق بدلیاں شفق کے چھینٹے بن کر آسمان پر بکھری ہوئی تھیں اور ساری دھرتی گلابی ہو رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈے پانی کے گھونٹ بن کر جسم میں اترتی جا رہی تھی۔

" پر نمسے چُپ چاپ ایک طرف اُڑے جا رہے تھے"۔ (بدنام ص۱۲۵)

" اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پر اترا، اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں ...... چڑیوں کے پاؤں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر ہلدی سی بکھیر دی تھی۔ اور آسمان پر ڈوبتے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے تیروں کی طرح نکل پڑ رہی تھیں"۔ (اصولوں کی بات ص۱۹)

" لیکن جونہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی۔ اور نئے سورج کا سونا کیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا۔ اور پہاڑی ڈھلانوں سے پھٹتے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے، تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی"۔

(رئیس خانہ۔ ص۳۱-۳۲)

" بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دور تک تانبے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر صحن میں آگیا۔ پھر

فوراً اندر لپکا۔ ایک دم بادل جیسے پھٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اُڑی اور بیٹھ گئی۔ پرنالوں کے دھانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آگئے اور آن کی آن میں یکسر جوانی آگئی۔" (رئیس خانہ ص ۳)

"پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دُور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پر اُونگھ رہی تھی۔ سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحتمند زردی میں چمک سی آگئی تھی۔ اور آسمان کے وسط میں اُڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی کو ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دیا تھا۔"

(آتشِ گل ص ۸۳، ۲۲)

"ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیئے تھے۔ اتنی اُجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے صبح کو عُریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر چیخنے اور منڈلانے لگے تھے۔" (داستان ص ۱۰۹)

ندیم قاسمی اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک، اور انسانی فطرت کے پیچ و خم سے ان کی واقفیت بڑی دور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے۔ اور انسانوں کے عنصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ جنس سے ان کی دلچسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذت اندوزی نہیں۔ ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مگر یہ طنز ایسا نہیں جو مردم آزاری کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجہ میں نرمی، شائستگی اور حلاوت ملتی ہے۔ جو برسوں کے عمل، صیقل اور کام و دہن کی ہزار آزمائش سے گذرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ مادی طہارت کے بھی قائل ہیں اور روح کو اس طہارت کی ایک ترقی یافتہ شکل بھی سمجھتے ہیں۔ "ماتم" "کفن دفن" "موچی" "ہیرا" "رئیس خانہ" "الحمد للہ" اور "پرمیشر سنگھ" اُردو کے ستھرے اور معیاری افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی ادبی فنکار کے لیے وجہِ امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس کے یہاں سیاست، مذہب، فلسفہ موجود ہے یا نہیں؛ بلکہ یہ کہ وہ ان کی موجودگی یا غیر موجودگی سے قطع نظر انسانی ادراک کی کس حد تک توسیع کرتا ہے اور اس کے نقطۂ نظر میں کتنی انفرادیت، ہمہ گیری، توازن اور مرکزیت ہے۔ پیش پا افتادہ حقیقتوں کے ایسے گوشوں کو، جنہیں دیکھتے اور محسوس سب کرتے ہیں، گویائی عطا کرنا بڑے ظرف اور حوصلے کا کام ہے۔ عام آدمی کے لیے ہر چھوٹے بڑے تجربے کے ارد گرد ایک خول سا چڑھا ہوتا ہے۔ یہ خول ہمارے وہموں، تعصبات اور آدرشوں کا ہوتا ہے، اور ہم رسم و رواج، ذہن کاری اور بے رُخی کی وجہ سے اس خول کو توڑنے

پر رضامند نہیں ہوتے ۔ افسانہ نگار ۔ اشیا، تجربات اور کرداروں کو ہمارے سامنے برہنہ پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے ۔ اِسی میں اس کی جیت ہے ۔ ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اِن کے یہاں ایک اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دلسوزی، متانت اور میانہ روی اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے ۔ وہ اِنسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بلاکم و کاست جھلکتی ہیں اور ایک معیار بھی جہاں تک اُنہیں پہنچنا ہے ۔

گوپی چند نارنگ

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی اُردو کے اُن فنکاروں میں سے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اپنے دَور کی تاریخ پر اپنا نقش ثبت کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اُنہوں نے اپنا "عہدِ انبساط" بقولِ میرؔ تلوار کے سائے میں گزارا اور اُن کی ابتدائی زندگی بڑی ہنگامہ خیزیوں میں بسر ہوئی لیکن لوح و قلم کی خدمت سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

نظم و نثر دونوں میں اُنہوں نے اپنی راہ الگ بنائی ہے۔ اِن کی شاعری اپنی انسان دوستی، ارضیت اور خودداری اور شدّتِ احساس اور سادگی و پُرکاری کی وجہ سے گہری جمالیاتی اور عوامی اپیل رکھتی ہے۔ وہ ایک باغی کا دِل، مجاہد کا عزم اور فنکار کی نظر رکھتے ہیں، اگرچہ وہ ادب کو مقصد نہیں، ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور سماجی جبر و ظلم اور بے انصافیوں اور محرومیوں کا اِن کے دل پر گہرا اثر ہے۔ لیکن اظہارِ جذبات میں انہوں نے ادبیت پر کہیں آنچ نہیں آنے دی۔

مقصد اور فن کا حسین توازن اِن کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔ اِن کے افسانوں میں بھی احترامِ انسان سے اِن کی بے پایاں محبت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اِن کا تخیل پیچاب

کی فضاؤں میں چپے چپے پر سے اٹھا ہے اور اس نے لہلہاتے کھیتوں، گنگناتے دریاؤں اور دھوپ میں جھلسے ہوئے ریت کے ذرّوں کو ایک نئی زبان دی ہے۔ پنجاب کی رومانی فضا اور وہاں کے لوگوں کی معصومیت و زندہ دلی۔ جرأت و جفاکشی اور خدمت و ایثار کی تصویریں ان کے افسانوں میں اکثر اجاگر ہو گئی ہیں۔ ان کے ہاں غم و غصے، تعصب و نفرت اور تنگ نظری و تشدد کا شائبہ تک نہیں، اور ہر کہیں مہر و محبت، خلوص و وفا اور صدق و صفا کا سونا جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔

وقار انبالوی

قاسمی — بطورِ مزاح نگار

قاسمی بنیادی طور پر ایک مفکّر ہے۔ اِس نے اپنے فکر و خیال کے اظہار و ابلاغ کے لیے قلم کی ہر جہتی رفتار سے کام لیا ہے۔ کبھی وہ ہمیں ایک افسانہ نگار اور نثار۔ کبھی ایک صاحبِ طرز شاعر۔ اور کبھی قافلہ ہائے حیات کی بے راہروی سے اُڑنے والی دُھول میں ظرافت و مزاح کے پھول کھلاتا نظر آتا ہے۔ اِس کی شخصیت کو، اگر تشبیہ و تمثیل اُس سے پُورا انصاف کرسکے تو یُوں سمجھنا چاہیے۔ کہ فکر و خیال کا ایک چشمۂ صافی ہے جس سے مختلف اطراف میں سوتے پھوٹتے ہیں۔ اور اقدارِ حیات کی سرسبزی و شادابی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اِس کی صحافت، اس کی شاعری، اِس کی افسانہ نویسی، اِس کی نثر نگاری اور اس کے طنز و مزاح میں اس کے درد آمیز فکر و خیال کی مٹھاس بھی ہے اور کسک بھی۔ اہلِ نظر نے ہنسی کے محرکات پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحثیں کی ہیں۔ جن کا ذکر اس وقت بے محل تو نہیں، باعثِ طوالت ضرور ہوگا۔ قاسمی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ شرعی اِحتساب کا ایک محدود و جامد سا ماحول تھا۔ اور قاسمی کے ساتھ دُنیا نے یا تقدیر و ماحول کی خُوبی نے سب سے پہلے مذاق کیا۔ تو قاسمی اسے برداشت نہ کرسکا۔ کرتا بھی کیسے، وہ فطرت سے فکر و خیال

کی جو صلاحیتیں لیکر آیا تھا۔ اِن کا تقاضا یہی تھا۔ کہ قاسمی سرکاری احتساب کے دائرے سے نکلے۔ قاسمی پہلی مرتبہ اہلِ قلم کے زُمرے میں شامل ہوا۔ تو وہ اکسائز انسپکٹر تھا لیکن قدرت اس سے جو کام لینا چاہتی تھی۔ وہ مقامی قسم کی دفتری مصروفیات سے کہیں اعلیٰ و بالا۔ اشرف و اکرم تھا۔

سرکاری ملازمت سے دست برداری میرے خیال میں حالات پر اس کا پہلا عملی طنز تھا۔ طنز لطیف، اور اِس حد سے گزر کر قاسمی جب ان حدُود و فِکر و نیال میں داخل ہوا جہاں نظر کی وُسعت اور مشرب و مسلک کی حدُود آفاقی ہو جاتی ہیں تو قاسمی کی طبیعت کے جوہر کھلنے لگے۔ اس کے دلِ دردمند نے اپنے معاشرے کے درد و کرب ہی کا نہیں اس سے کہیں بلند سطح پر انسانی ذہن کی پریشانی کا شدت سے احساس کیا۔ اُس نے قیدِ حیات و بندِ غم کو مترادف سمجھنے سے گریز کیا۔ اور بڑی بلند آہنگی سے کہا ؎

نوعِ انساں کے نئے عزم کی تکریم کرو
اب تو ذرّہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے

اِس شعر کی تشریح، تعبیر و تفسیر مجھ جیسے بے بصیرت اور علمی و فکری حیثیت سے تہی دامن انسان کے لیے تو آسان نہیں۔ اہلِ بصیرت اور اہلِ نظر بھی چاہیں تو شاید ایک عرصہ کے بعد ہی اِس شعر کے پُورے معنوی تصوّر کو گرفت میں لا سکیں۔ لیکن اِتنا کہنے کی جسارت کرتا ہُوں کہ قاسمی نے جب سے یہ تازیانہ طنز و مزاح ہاتھ میں لیا ہے زندگی پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے دل بھی ہلا کر رکھ دیئے ہیں۔ اِس شعر میں جو ایک رمزیہ طنز ہے اس کی حدود بھی آفاقی

ہیں۔ اور قاسمی کے دل میں نوعِ انسان کی جو قدر و منزلت اور انسان کے صحیح مقام کی معرفت علم نہ ہونے کی وجہ سے جو ہلکی سی کسک ہے یہ شعر اس کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ قاسمی سنجیدگی و متانت کے میدان میں کسی سے پیچھے ہے بلکہ وہ میرے نزدیک سنجیدگی و متانت سے بھی کچھ کہتا ہے تو بین السطور میں اس کی طبعی ظرافت اور اس کا طنز چھپائے نہیں چھپتے۔

نگرۂ حیات میں کہ تضادات سے عبارت ہے، ہر دل کی تیرگی میں مسرت کی ایک ننھی سی کرن رجائیت کے نور سے چمکتی رہتی ہے۔ قاسمی کی نظر بڑی حد تک اسی کرن پر مرکوز رہتی ہے۔ اور اس کے بس کی بات ہو تو وہ ہر دل میں اسی نور کی ایسی سدا بہار مشعل روشن کر دے کہ شاخِ حیات ہمیشہ گلریز و گلبار رہے۔ اُسی نے غالباً گذشتہ ماہ ہی تو اپنے حرفِ حکایت کے کالم میں لکھا ہے:

"یہ کالم زندگی میں ذرا سی شگفتگی پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اگر اس شگفتگی کے پردے میں معاشرے کی کسی خرابی کی اصلاح ہو جائے تو سبحان اللہ۔"

میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے تو اس کی قلم سے یہ الفاظ جنوری کے ابتدائی دنوں میں نکلے ہیں؛ اور اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے یہ الفاظ اس کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔ قاسمی بطور مزاح نگار اپنا یہ فرض سمجھتا ہے کہ قلبِ انسانی کی شگفتگی ترقی پذیر رہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس کی دردمند شخصیت اسی لئے اور زیادہ دلآویز و محبوب ہو جاتی ہے کہ وہ طنز و مزاح کا تازیانہ کبھی تعزیر و انتقام کے لئے نہیں اٹھاتا۔ بلکہ نہایت مرنجِ و مرنجاں انداز میں اصلاحِ احوال کے لئے اس اسلوبِ نگارش سے کام لیتا ہے جسے طنز و مزاح کہتے ہیں۔ اس کا طنز حقیقت

میں طنزِ لطیف ہے جس کا لطف وہ خود بھی لیتا ہے اور جس پر طنز کرتا ہے اُس کے دل کے تاروں کو بھی اس طرح چھیڑتا ہے کہ مسرت کی راگنی پھوٹ نکلتی ہے۔ بلکہ میرا یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ قاسمی جس پر طنز کرتا ہے اُسے بسا اوقات قاسمی کی کوتاہ کلامی کی شکایت رہ جاتی ہے۔ اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی ہوتا۔ یہ قاسمی کے فن کا کمال ہے، اور میں بلا خوفِ تردید پڑھے لکھے اصحاب کے مجمع میں یہ کہتا ہوں کہ اس بارے میں جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے۔ قاسمی کا کوئی شریک و سہیم بھی نظر نہیں آتا۔ حریف تو ذرا دُور کی بات ہے۔

قاسمی جب سرکاری احتساب کے قدحِ زہر آب کو ٹھوکر مار کر ادبی و فکری رندوں اور سرمستوں کے حلقے میں داخل ہوا تو بہت کم مدت میں اسکی افتادِ طبع اور جولانیٔ قلم نے گھاگھ اہلِ قلم سے اپنا لوہا منوا لیا۔ اِس کے چشمۂ فکر و خیال سے جو سوتا پھوٹا، وہ جیسے جیسے بڑھتا اور پھیلتا گیا اِس کا پاٹ دلنواز و دلکشا ہوتا گیا۔ بلاشبہ سیلانِ فکر اور طوفانِ بیان کے ساتھ کبھی کبھی خس و خاشاک بھی اِن سوتوں کے بہاؤ پر نظر آئے۔ لیکن انہی خس و خاشاک سے تو قاسمی بیزار ہے۔ اور انہی کو بہا کر اتنی دُور لے جانا چاہتا ہے، کہ زندگی مصفّا۔ پاکیزہ اور منوّر تر ہوتی چلی جائے۔ اِس کا یہ عیب نہیں ہُنر ہے۔

اِس مختصر سی صحبت میں قاسمی کی محبوب و دلآویز شخصیت، سدا بہار طبیعت اور اسکی طنز و مزاح میں ہمہ گیری و ہمہ رسی کا احاطہ تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کی شوخی و ظرافت اور اسکے طنزِ لطیف کی کچھ مثالیں ضرور پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ قاسمی کا قلم ایک تازیانۂ طنز ہے۔ ذرا اس کی طنزیہ شاعری کی بانگی ملاحظہ فرمائیے ؎

تو بھی سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کیساتھ

یہ شعر سُن کر میرے اس دعویٰ کی دلیل تلاش کرنے کی حاجت نہیں رہتی کہ قاسمی کا اندازِ فکر آفاقی ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ رہنے دیجئے کہ زمانے والوں کی اور زمانے کی ناقدری پر اس سے بہتر شعر آج تک نہیں ہوا۔ یہ سوچیئے کہ اگر اس شعر کا دُنیا کی کسی اور زبان میں ترجمہ کیا جائے تو کیا اسکا تاثر جوں کا توں ہی قائم نہیں رہے گا؟ ضرور رہے گا! اور جس زبان میں لوگ اسے سُنیں گے بے ساختہ آمنّا وصدّقنا پکار اُٹھیں گے۔

میں نے ابتدا میں ایک لفظ کسک استعمال کیا ہے۔ جو بظاہر طنز و مزاح کے معاملے میں امل بے جوڑ سا نظر آتا ہے لیکن ذرا سُنیئے۔ وہ مشہور شعر تو رُسوائی کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ شعر سُننے اور پڑھنے کے بعد اہلِ دل پر حزن و ملال کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک کسک ہی کی سی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ قاسمی قیدِ حیات و بندِ غم کو مترادف نہیں سمجھتا! اس نے کسک کو محسوس تو کیا لیکن اس کے اثر سے دلوں کو بچانے کے لئے ایک شعر کہہ دیا، کہ باید و شاید۔

قاسمی کہتا ہے ؎

دشمنی تو مجھ کو قیس کی سی تھی مگر اِس دَور میں
پھُول اِتنے تھے کہ صحرا کا کوئی رستہ نہ تھا

آبروئے شیوۂ اہلِ نظر کے پاسدار ہی اِس شعر کی کما حقّہٗ داد دے سکتے ہیں۔ ہر شخص اِس داد کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ قاسمی یہاں طنز و مزاح کی جن بلندیوں کو چھُو گیا ہے نظر وہاں تک کام بھی کرتی ہے یا نہیں؟ وہ اصحاب جو پہلا شعر پڑھ کر آہِ سرد بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے اِن کی کشادِ دل کا کیا کیا سامان اِس شعر نے خصوصاً شعر کے اِس ٹکڑے نے کہ "پھُول اتنے تھے" بہم پہنچایا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ شعر سُنا تو دِل سے یہ دُعا نکلی کہ خُدا قاسمی کو نظرِ بد سے بچائے رکھے!

جب میں یا قاسمی کا کوئی اور قدر دان اِس کی آفاقیت کا اِعتراف کرتا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنے گرد و پیش یا ماحول سے بے نیاز ہے۔ مُراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے پر بھی اسی بلندی سے نگاہ ڈالتا ہے جو مفکر حضرات کا حصّہ ہے۔ جو لوگ خواہ مخواہ کی جدّت طرازیوں سے ایک بھُول بھلیاں سی پیدا کرتے ہیں ذرا اِن پر ایک طنز سُنیئے: ؎

چاند کی دھوپ میں سُورج کا ستارہ چمکا
آج مریخ نے وُہ چاندنی برسائی ہے
کہ کئی گیدڑوں کی رات کٹی آنکھوں میں
آج ندی میں جو گھر تھا اُسے بجلی نہ ملی
اور چیونٹوں کے کالر میں بھی ٹائی نہ سجی!

اب دریچوں کی جگہ لوگ ذہیں رکھتے ہیں
مجھے محبوبۂ ملت نہ کے دانتوں کی قسم
ایک دن میں بھی ابابیل کا شوہر بنکر
ہونؤں سے بھی کچھ دُور نکل جاؤں گا !

اور وہ بزرگ جو شُغلاً و تفننّاً جیسے الفاظ کے گنبد میں ماضی کی صداؤں کے عاشق ہیں اور زبان کے ہلکے پھلکے اور دلنشیں انداز کو بوجھل بنانے کے درپے ہیں۔ ان کے متعلق سُنئے :

اے مرے مُجملۂ اجمالِ جمال
اے ہیولائے حیا جیس نہ کر ، جیس نہ کر ،
وست و ستور میں دستار کا دستہ نہ رہے
زندگی زاہد و زہاد نما کا زردہ !
پسِ اسرارِ کمپستہ رک ہے
کسی ماشکی کی مشک کا مشکیزہ ماش
جب کبھی جنبشِ اضداد سے جی جلتا ہے
سُرخ ساڑھی میں سراپردہ سفاک سے رستی ہے صدا
اے مرے مُجملۂ اجمالِ جمال ، اے ہیولائے حیا

ایک نئے گیت کا روپ ملاحظہ فرمایئے :-

چل مرے ہمراہ   ہمراہی   چل مرے ہمراہ

رکشا لے لے ٹیکسی لے لے   اور پھر اپنے ساتھ کئی مجبوروں کی گیلیکسی لے لے

آؤ کریں گناہ   ہمراہی   چل مرے ہمراہ

پرانے زمانے میں قصیدہ راج دربار میں حسن طلب کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ قصیدہ کا یہ معنوی تصور ادھورا ہے لیکن اس میں ترقی کی جگہ جس قابل نفرت تنزل نے راہ پائی ہے۔ اسے خاکر قاسمی نے یوں اڑایا ہے ؎

یہ تیرا اسم گرامی ہے کہ حلوے کی پلیٹ

تیری باتیں ہیں کہ ہمسائی نے مرغا بھونا

تیری رنگت ہے کہ گندم دیسی

تیرا بازو ہے کہ آٹا خالص

ترا قد ہے کہ کھڑا ہے کوئی مصری کا ڈلا

ذرا ہنسی روکیے گا! راہ مولا مجھے روٹی دے دے

بڑی کھالی ہو تو بھوٹی دے دے

ساتھ میں ایک لنگوٹی دے دے

اور ایک جدید رباعی ملاحظہ ہو ؎

دریا میں تبسم عشق کے گہرے تن لے   کب تک میں دیے جاؤں گا پہر سن لے

لہرائے تو پاتال میں سے جاتے گی   اے میرے کئی سال سے بہرے سن لے

مزاحوں کے کتبوں اور مصرعے کے ساتھ پھڑوں والا معاملہ طوالت کے خوف سے چھوڑتا ہوں ورنہ کسی محفل کو کشت زعفران بنانے کے لئے مدتوں وہی کافی ہے۔

شریں قاسمی کی مزاح نگاری ــــ روزنامہ امروز کے کالم حرف و حکایت سے تسلسل و تواتر کے دور میں داخل ہوئی۔ چراغ حسن حسرت مرحوم نے اس شبستان ظرافت میں جو شمع روشن کی تھی اور اس گلستان مزاح میں جو پھول کھلائے تھے ان کے نور و رنگ کی آب و تاب کو قائم رکھنا قاسمی کی مزاح نگاری کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ چراغ حسن حسرت منفرد انداز کا مزاح نگار اور طناز ہے۔ ہیئت و مافیہ کے اعتبار سے حسرت کا جواب نہیں۔ شائستگی بھی بہت اچھا اور ہومر سٹ بھی بہت عمدہ۔ اس کے مزار پر چراغ جلائے رکھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن قاسمی کے سوز و دروں نے اس مشکل کو بڑے طلساتی انداز میں حل کیا۔ طلساتی یوں کہ سوز دروں کی جھلک تو بہت باریک بینی کی متقاضی ہے۔ لیکن گلباری و گلریزی اسی طرح جاری ہے۔ قاسمی اور حسرت میں جو شے مابہ الامتیاز ہے۔ وہ یہ کہ حسرت کا اسلوب نگارش سو برس پہلے کا سا ہے۔ اور تشبیہ و تمثیل میں تو وہ صدیوں پہلے کے اہل قلم کی صف کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قاسمی کا اسلوب نگارش اپنے حال سے بھی ہم آہنگ اور مستقبل کی حدوں کو بھی دور دور تک چھوتا ہے۔ دونوں کی راہوں میں سرسبزی، شادابی اور لطف انگیزی کا عالم تو قریب قریب یکساں رہتا ہے لیکن راہوں کی سمت جدا جدا ہے۔ اور یہی سمت قاسمی کی انفرادیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اسی سمت میں اس نے طنز و مزاح کی اوگھٹ گھاٹیوں میں اپنے جھنڈے گاڑے ہیں۔ اپنے پرچم لہرائے ہیں۔

قاسمی کی مزاحیہ نثر نگاری کی بات چھڑ گئی ہے۔ تو اس کی بانگی سے پہلے ذرا یہ سُن لیجئے کہ حرف و حکایت کا کالم کوئی نوّے سطر کا ہے اور ہر سطر میں دس سے زیادہ الفاظ سماتے ہیں۔ پھر کالم کے اخیر میں اکثر و بیشتر یہ چھپا ہوتا ہے کہ آگے فلاں صفحہ، فلاں کالم دیکھئے یوں قاسمی اوسطاً ایک ہزار الفاظ روزانہ اس کالم میں لکھتا ہے۔ یعنی سال بھر میں کوئی چھتیس سینتیس ہزار الفاظ۔ اور دس برس کے حرف و حکایت کے الفاظ کی تعداد چھ اور سات لاکھ کے درمیان ہوتی ہے۔ آپ ہی سوچیں کہ مختصر سا مختصر بھی انتخاب ہو تو کتنی ضخیم کتاب ہو سکتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے سُن لیجئے! گزشتہ دنوں ماسٹر تارا سنگھ۔ سنت فتح سنگھ اور دو جگت گوروں نے گاندھی جی کے مرن برت کا مذاق اڑانے کے لئے جو لمبے لمبے مرن برت رکھے۔ اور ان کا جو حشر ہوا۔ اس میں سے ایک برت کے بارے میں قاسمی کا طنز ملاحظہ ہو۔

> "یہ اتنا لمبا برت تھا کہ اگر کوئی اور اتنا لمبا برت رکھے تو ایک بار چھوڑ
> تین چار بار انتقال پُر ملال کر جائے۔ دُوسروں کے بارے میں کیا کہا جائے۔
> خُود ہمارا یہ عالم ہے کہ بھُوک لگی ہو اور کچھ کھانے کو نہ ملے تو ہاتھوں کے طوطے تو رہے
> چاروں طرف فضا میں کھوتے تک اُڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں"۔

طوطے اور کھوتے کی صوتی ہم آہنگی اپنی جگہ قاسمی کے کمالِ فن کی دلیل ہے لیکن کھوتے کے معنوی تصور میں جو ایک لطیف اشارہ پنہاں ہے اس کا لُطف اہلِ نظر ہی لے سکتے ہیں۔ آگے حدِ ادب!

سکھوں کے برت کے بعد ہندوؤں کے برت پر قاسمی نے کیا مزے کی پھبتی کسی ہے وہ بھی سُنئے :۔

"ہندوؤں کے جگت گورو نے دو ماہ تک مرن برت رکھ کر تارا سنگھ اور سنت سنگھ سے چمپئن شپ چھین لی ہے۔ ان لوگوں کو چاہیئے کہ بغیر کھائے پئے دو ماہ تک زندہ رہنے کا نسخہ عام کر دیں تاکہ قلت اناج کی تلافی ہو اور دُنیا کا بھلا ہو سکے !۔"

اور اس پھبتی کے بعد اس جاہل فاقہ کا طنز کے تیروں سے جو حال کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ قاسمی کا کہنا ہے :۔

"بچپن میں ہم نے بھی ایک بار مرن برت رکھا تھا۔ ہم نے کوئی فرمائش کی وہ پُوری نہ ہوئی۔ تاؤ میں آکر مرن برت رکھ لیا۔ اور باہر گلی میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے مرن برتیوں کی طرح ہم بھی منتظر تھے کہ ابھی کوئی آئے گا اور ہمیں منانے جائیگا۔ مگر افسوس کوئی نہ آیا۔ صرف ایک چکر آیا۔ پھر دُوسرا چکر آیا۔ اور جب تیسرا چکر آنے کو تھا تو ہم اُٹھے۔ دبے پاؤں باورچی خانہ میں پہنچے۔ پیٹ بھرا اور چوروں کی طرح ہوتے ہوئے اپنے بستر کی طرف جا رہے تھے کہ گھر والوں میں سے (قاسمی نے اہلِ خانہ لکھا ہے) کسی کی آواز آئی۔ دُودھ بھی چولہے کے پاس رکھا ہے وہ بھی پی لو۔ یُوں ہم مرن برت توڑتے ہُوئے پکڑے گئے۔ اور خود ہمارے اندر کے

"حکم سنگھ نے ہمارے برت کا ستیاناس مار دیا' اب کوئی مرن برت رکھتا ہے تو دعا کرتے ہیں کہ باورچی خانہ بجائے کے آس پاس ہو۔"

فضا میں طوطوں کی جگہ کھوتوں کا استعارہ اپنی جگہ تھا ہی نہ بچپن کی مثال اور چکر کا حوالہ دے کر مرن برت کی جس طرح مٹی پلید کی ہے۔ اس کا جواب کوئی کہاں سے لائیگا؟ اور اندر کا حکم سنگھ تو سبحان اللہ۔ گویا قاسمی نے یہ کہتے کہتے قلم روک لیا۔ کہ سنگھ کوئی نہیں آیا تھا محض حکم آیا اور مرن برت ٹوٹ گیا۔ حکم سنگھ کو اس طرح مذلت کرنا۔ کہ سنگھ تو اسے سنگھ مانتے ہی نہیں۔ وہ صرف حکم ہی کے مترادف تھا۔ مزاحیہ آرٹ کا بہت بڑا کمال ہے۔

لفظوں کے اُلٹ پھیر سے قاسمی جو سماں باندھتا ہے اسکا اصل لُطف تو اس کی ان تحریروں میں ہے۔ جہاں اس نے لوگوں کے ناموں کو اُلٹا پلٹا ہے۔ اس بارے میں سالک مرحوم کی بھی ایک اپنی اپج تھی۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا ابوا لسکوت پابند۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بخار اللہ شاہ عطائی اور مولانا مظہر علی اظہر کو ادھر علی اُدھر کہہ کر داد ظرافت دی تھی۔ لیکن قاسمی نے اس بارے میں عجیب جدت کی ہے کہ پورے کے پورے نام اُلٹ کر انکی عجیب و غریب مضحکہ خیز صورتیں بنا ڈالی ہیں، تاہم بعض ہلکی ہلکی صورتیں ملاحظہ ہوں۔

نندہ کے جبری استعفیٰ پر نندہ کے قافیوں میں جو باتیں شروع کیں تو بندہ، چندہ۔ گندا۔ پھندا۔ رندا مندا۔ پلندہ۔ دھندا غرض کوئی قافیہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ لیکن سب سے مزیدار ٹکڑا یہ ہے؛

"جس طرح وزیر داخلہ کو کابینہ میں خارج کیا گیا ہے۔ اسی طرح مسز اندرا کو بھی آندرا کی جگہ باہر جا کر دیا جائے۔"

اخبار ... ایک مذاق ... ملاحظہ لیجیے۔ کہ جب مجھے اس مجلس میں قاسمی پر اظہار خیال کے لیے

حکم دیا گیا تو انعقاد مجلس میں کوئی مہینہ بھر باقی تھا۔ اتفاق کی بات کہ اگلے دن انار کلی میں قاسمی صاحب مل گئے۔ میں نے پوچھا۔ کہ جناب آپ کے ہاں طرف وحکایت کی کوئی فائل ہے۔ کہنے لگے نہیں تو البتہ امروز کے دفتر میں پورے اخبار کے فائل موجود ہیں۔ میں ذاتی گزارش کی طرف ...... کی جھاڑی میں سو رہا۔ کہ امروز کے دفتر کا کھوا تو گل محمد سے جگہ سے ملنے کا بھی نہیں جب بھی پہنچا ...... دن کا لیکن جب ۲۵ تاریخ سر پر آگئی اور ۲۲ تاریخ کو میں دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ طرف وحکایت کی مکمل فائل کوئی ہفتہ بھر ہوا قاسمی صاحب کے گھر بھیجدی گئی ہے۔ آپ ہی فرمایئں کہ امروز کے بھاری بھر کم دفاتر کہاں تک چھانتا؟ بہ حال بانگی لے آیا۔ وہ حاضر کردی بھلا کس شخص کو مرغی کے انڈے کی جگہ چوزے کا انڈہ کھلا دیا جائے اور وہ انڈا اٹھا کر چلنے کے جانوروں میں کس کا جی تیرنے کو چاہنے لگے۔ اس شخص کے طنز ومزاح کا احاطہ کیسے ممکن ہے ...... پر بھی تو قاسمی پر بات کرنے کے لئے تو عمر اور دفتر چاہئے۔ مختصراً یوں کہہ سکتا ہوں کہ قاسمی کی مزاحیہ طبیعت نے جس تیزی سے رہوارِ قلم کو سرپٹ دوڑایا ہے اس سے اس کے معاصرین کا یہ حال ہے۔ جیسے کچی راہوں میں پیدل چلنے والوں کے لئے ؎

اُڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

اور قاسمی اپنے معاصرین سے ہر اس طرح آگے نکل گیا ہے کہ اس کے معاصر اقرار کریں یا نہ کریں جب وہ اپنے چہرے سے پسماندگی کی گرد پونچھتے ہیں۔ تو زبان حال سے گویا اپنی جگہ یہی کہتے ہیں ؎

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

احمد ندیم قاسمی

میرا نظریۂ فن

ممکن ہے۔ فنکار کا، اپنے فن کی خصوصیات گِنانا ایک حد تک اس کی خود اعتمادی کی دلیل بھی سمجھا جاتا ہو، مگر اس میں خود اہمیتی کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے۔ اگر کوئی فنکار اپنی اہمیت کو خود ہی نمایاں کرنے بیٹھ جائے تو وہ مجھے کچھ بھلا نہیں لگتا۔ اگر یہ خود اعتمادی ہے، تو کچھ انتہا پسندانہ سی خود اعتمادی ہے۔ مجھے تو یہ کہتے ہوئے بھی تکلف ہوتا ہے کہ میں اہم ہوں۔ اگر میں اہم ہوں تو میرا نقاد اور میرا قاری آج نہیں تو کل اس اہمیت کا احساس ضرور کر لے گا۔ اور اگر میں کچھ ایسا اہم نہیں ہوں تو خود اپنی طرف سے ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود میں غیر اہم ہی رہوں گا۔ کوئی فنکار یہ تو کہنے سے رہا کہ مجھ میں فلاں خامی اور فلاں خرابی ہے اور میں فلاں فلاں امور میں نالائق اور نااہل ہوں۔ ظاہر ہے جب وہ اپنے فن کے بارے میں کچھ کہے گا تو بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی خوبیاں ہی گِنائے گا۔ لیکن اگر وہ یہ دعویٰ کرنے کا اہل نہیں کہ وہ شعر و ادب کی دنیا میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے تو اُسے اپنے فن کی وضاحت کے تکلف میں پڑنا ہی نہیں چاہئے۔ رہی حرفِ آخر کی

بات، تو فن کی دُنیا میں حرفِ آخر کا کوئی وجود ہی نہیں۔ فن حقیقت و صداقت کی تلاش کا نام ہے۔ یہ ایک مسلسل اور مستقل عمل کا نام ہے جس میں انسانی ذہن ابد تک مصروف رہے گا۔ سو جب کوئی فنکار اِتنا بڑا دعویٰ نہ کر سکے تو کوئی دعویٰ ہی کیوں کرے؟ وہ صرف یہ کیوں نہ کہے کہ جب میں اپنی تخلیقات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے احساسِ ندامت نہیں ہوتا، احساسِ آسودگی ہوتا ہے اور میرا ضمیر خوش ہوتا ہے کہ میں نے اپنی تخلیقی قوت سے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ میں نے اپنے ماضی سے کچھ لیا ہے تو اپنے مستقبل کو کچھ دیا بھی ہے۔ اور انسانی فکر و احساس کے عظیم اور لامتناہی کارواں کے رستے پر سے میں نے بھی چند کانٹے ہٹائے ہیں اور چند کلیاں بچھائی ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا فنکار بھی اگر اس سے بڑا کوئی دعویٰ کرتا ہے تو میں اسے مطلع کرنا چاہوں گا کہ وہ مر چکا ہے۔

میں اپنے فن کی بجائے اپنے نظریۂ فن کے بارے میں گفتگو کرنا پسند کروں گا۔ اور حق یہ ہے کہ اگر کسی فن کار کی طرف سے اپنے فن کا تجزیہ ضروری سمجھا جائے تو فن کار کے لئے بہتر طریق کار یہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کر دے۔ اس وضاحت کو بالواسطہ طور پر اس کی اپنی زبان سے اُس کے فن کا جائزہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک مشکل یہاں بھی درپیش ہے۔ اگر کسی فنکار کے نظریۂ فن کا اطلاق اس کے فن پر کیا جائے تو کبھی کبھی یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے فن اور نظریۂ فن کے درمیان کوئی گہری مطابقت نہیں ہوتی۔ اِس کا مفہوم یقیناً یہ نہیں ہوتا کہ فنکار جھوٹ بول رہا ہے۔ یا منافق بن رہا ہے۔ اِس کا مطلب صرف اتنا سا ہوتا ہے

کہ اس کا فن ابھی اس کے نظریۂ فن کی بلندی تک نہیں پہنچ سکا اور اس کے فکر اور اظہار کے درمیان ابھی تک ایک ایسا فاصلہ موجود ہے جو اس کی مشق اور خود ضبطی اور تجربوں کی فراوانی سے آخر کار طے ہو کر رہے گا۔ ایسا کہہ کر میں خدانخواستہ کسی پر چوٹ نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ تو بعض اپنی کوتاہیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

میں فنکار کو اُس معاشرے، اُس ملک اور اس عصر کا ایک حصّہ سمجھتا ہوں جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ یوں فن کو ایک معاشرتی فعل قرار دیتا ہوں اور فنکار کی ذات اور اُس کی انفرادیت اور اُس کی اَنا کا معترف ہونے کے باوجود میں اس سے اِنسانیت دوستی کا مطالبہ بھی کرتا ہوں۔ اِن دو عناصر کو یکجا کر کے بظاہر میں اجتماعِ ضدّین کا مرتکب ہوا ہوں مگر دراصل ایسی بات نہیں ہے۔ میں فن کار کی ذات اور اس کی انفرادیت اور اس کی اَنا کو بھی اُس خاص ماحول، اس خاص معاشرے اور اُن خاص تہذیبی رشتوں کی پیداوار سمجھتا ہوں جن سے بظاہر وہ بغاوت کر رہا ہوتا ہے مگر دراصل انہی کے شکنجے میں کَسا ہوتا ہے۔ آج کے فن میں جو آشوب اور تشنج کی کیفیت ہے، اسے میرے اِس نقطۂ نظر کی روشنی میں پرکھیے تو بہت سی گرہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ میں نے تو ایسے فنکار بھی دیکھے ہیں کہ معاشرے نے ان کی پذیرائی ان کی اپنی توقع کے مطابق نہ کی اور انہوں نے طیش میں آ کر معاشرے کو مِتھ بنانا شروع کر دیا اور یہ نہ سوچا کہ ان کی اس انتقامی کارروائی پر بھی معاشرتی اثرات کی چھاپ موجود ہے کہ ان کا یہ فعل بھی معاشرے ہی کے عمل کا ایک ردِعمل ہے۔

لیکن جب میں تخلیقِ فن کو ایک سماجی فعل کہتا ہوں تو اس سے میرا مقصد محض یہ ہے کہ فنکار کو اپنے اوپر چند ذمہ داریاں عاید کرنا پڑتی ہیں اور بس۔ میں تو ایسے معاشرے کا تصور بھی کرتا ہوں تو اپنے آپ کو پھانسی پہ لٹکا ہوا محسوس کرتا ہوں جس میں معاشرہ فن کار کے فکر و احساس کی حد بندی کر دے۔ اور فنکار پہ واضح کر دے کہ تم نہ تو اس سے زیادہ سوچ سکتے ہو اور نہ اس سے آگے کچھ لکھ سکتے ہو۔

فن ملیشیا قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ فن کا طرۂ امتیاز ہی بے ساختگی ہے۔ یہ بے ساختگی اس سے چھن جائے تو فن تخلیق نہیں ہوتا، گھڑا جاتا ہے۔ اور خدا ہر قوم اور ہر تہذیب کو گھڑے ہوئے فن سے محفوظ رکھے۔ میں تو فن کو اور خاص طور پہ فنِ شعر کو انسانی شعور کا قافلہ سالار سمجھتا ہوں اور قافلہ سالاروں کے قدموں میں بیڑیاں نہیں ہوتیں۔

پھر میں انسان اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ اگر انسان موجود ہے اور اس کرّے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔ انسان اور خدا، ذات اور کائنات، حقیقت اور مابعد الطبیعات کے رشتوں اور مسئلوں پر بھی انسان اور زندگی کی ہی موجودگی میں غور ہو سکتا ہے۔ سو میری نظر میں انسان اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن و توازن حاصل کرنے میں مدد دے۔ اور وہ انسان کو منفی انداز میں اداس نہ کرے۔ وہ زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بناتے اور اس میں وہ رنگ و آہنگ پیدا کرے جنہیں فنونِ لطیفہ کی بنیادیں قرار دیا جاتا ہے لیکن جو ایک اچھی اور پیاری اور خوبصورت زندگی کی بنیادیں ہیں۔ مجھے کسی مغربی شاعر کا ایک فقرہ یاد

آرہا ہے وہ بھی سُن لیجئے: "سب چیزوں، خیالوں اور کاموں کی کسوٹی انسان ہے اور انسان کی کسوٹی شاعری ہے"۔

یہاں ادب کی افادیت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں ؎

یہ رقص و نغمہ، یہ شعر و ادب، یہ حکمت و فن
حیات کُش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات آموز

مگر اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی موجود ہے کہ فن میں حیات آموزی کا انداز کیا ہو؟ حیات آموزی صرف شعر و ادب یا صرف دیگر فنون کے ساتھ تو خاص نہیں ہے۔ ایک واعظ، ایک سیاسی رہنما، ایک معاشرتی کارکن بھی حیات آموزی پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس لئے فن کی صورت میں حیات آموزی ایک ایسا دشوار مرحلہ ہے کہ اگر فنکار کو اپنے فن پر پوری گرفت نہ ہو تو وہ منبر کے سب سے بلند پائے پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ تو حُسن کار ہے۔ اسے تو لفظوں سے چراغ جلانے ہیں اور پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا ہے۔ یقیناً اگر آج کا فن سماجی بصیرت اور اجتماعی احساس سے کتراتا ہے تو وہ صرف ایک ڈھکوسلا ہے، صرف ایک پینترا سا ہے اُن نٹوں کا سا جو رسیوں پر چلتے ہیں حالانکہ چلنے کے لئے اتنی بڑی زمین پڑی ہے۔ مگر فنکار کی اس سماجی آگاہی کا اظہار اس حسن و جمال اور اُس بے نام سی ایک طلسماتی کیفیت کے ساتھ ہونا چاہئے جس کے دم سے سیکڑوں تقریریں اور ہزاروں تلقینیں شاعر کے صرف ایک شعر کا مُنہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ میرے نزدیک فن رائے کا اظہار نہیں ہے، جذبے کا اظہار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں میں نگر نگر

شاعری کی عظمت اور گہرائی کے لئے ناگزیر سمجھتا ہوں وہیں اس فکری شاعری کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں ہے جس میں صرف علم ہو اور احساس جسے چھو بھی نہ گیا ہو۔ شاید میں اس خیال کو اپنی غزل کے ایک شعر سے واضح کر سکوں ؎

زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں ،

فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا قائل بھی ہوں

میں صرف اور محض فکری شاعری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ فکر محض میں جو کرختگی اور درشتی ہوتی ہے اس کی میرے نظریۂ فن میں کوئی گنجائش نہیں۔ مگر ساتھ ہی اگر فن فکر سے خالی ہوگا تو یکسر سطحی ہوگا۔ اس کا حسن مصنوعی پھولوں کا سا حسن ہوگا۔ سو میں سمجھتا ہوں کہ بڑے فن، بڑی شاعری کے لئے خیال و احساس کی یکجائی ضروری ہے۔ فکری شاعری کو بھی حسیاتی ہونا چاہئے اور قاری کو اس میں فکر کی بجائے محض متفکرانہ شان نظر آنی چاہیے فن کسی فکری تصویری کو منظوم یا مصور کرتے ہوئے بھلا نہیں لگتا ہے۔ اس کی بجائے وہ فکر کر سکتا ہے اس دنیا کے حسن پر، یہاں کے قوانین کی سفاکی اور بے انصافی پر، یہاں کی زندگی کی طرفگی اور پیچیدگی پر، یہاں کے عناصر کی دہشت اور خوفناکی اور انکے خلاف انسان کی طویل جنگ پر جس میں اب تک طرفین میں سے کسی نے شکست تسلیم نہیں کی۔ پھر وہ انسان کی سی پیاری، حسین و جمیل اور ذہین و فطین مخلوق کی موت کے سامنے بے بسی پر فکر کر سکتا ہے اور اس پر اپنی ابدی حیرت کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر محض فن کے معاملات میں مداخلت کرے گا تو اسکا خالق فنکار سے زیادہ متفکر بن جائیگا۔ اور یہ عرض کرنے کی

تو ضرورت نہیں کہ فن کار اور مفکّر دو الگ الگ شخصیتیں ہوتی ہیں۔

مَیں نے عرض کیا تھا کہ فن کسی کو منفی انداز میں اداس نہ کرے۔ اس سے یقیناً بیشتر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا اُداسی کا کوئی مثبت انداز بھی ہوتا ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ جی ہاں ہوتا ہے اور میں تو فی الحال اسی تخلیقی اداسی کو اپنا اثاثہ سمجھتا ہُوں۔ جس معاشرے میں ہم زندہ ہیں اور جس عصر میں سے ہم گزر رہے ہیں اس نے تو لوگوں کو خودکشی پر مجبور کر دیا ہے، اور میں تو اِس عصر کے تضادوں اور بے انصافیوں پر صرف اُداس ہو جانے کا حق مانگتا ہوں۔ ایک رجائی فن کار اگر اداس ہونے کی آزادی طلب کرے تو اسکا یہی مطلب لیا جائے گا کہ وہ دراصل قنوطی ہے۔ مگر مجھے قنوطی کہلانے سے بھی اِنکار ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غمِ اِنسان کی ایک تخلیقی قدر ہے کیونکہ اس غم ہی سے تو اُن حالات کو ختم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جنہوں نے یہ غم بخشا ہے۔ مَیں نے غزل کی زبان میں غم کو ایک جمالیاتی احساس بنانے کی یُوں کوشش کی ہے۔

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

سو میرے نقطۂ نظر سے، نہ صرف غم کے باوجود زندگی کا اثبات ممکن ہے۔ بلکہ انسان کو جس کرّے پر ڈال دیا گیا ہے، وہاں زندگی کا اثبات غم ہی کی وجہ سے ممکن ہے۔ دراصل غم انسان کی دوامی قدر ہے، ہم ایک مثالی معاشرے کے افراد بن کر بھی اور زندگی کے حسن و توازن سے جی بھر کر سیر ہونے کے باوجود کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی مرحلے میں

اداس ضرور ہو جائیں گے۔ پھر جب اداس رہنا ہی ہے تو اسے ایک تخلیقی قدر کیوں نہ بنا لیا جائے؟

ظلمت گرِ حالات کے ویران اُفق پر، جو چاند چمکتا ہی رہا، وہ مرا غم تھا،

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ فنکار میں تخلیق کا وہ اضطراب بے حد ضروری ہے جسے بعض لوگوں نے شدت اور وفور ظاہر کرنے کے لیے تخلیق کا زہر بھی کہا ہے۔ اگر فنکار میں یہ اضطراب دب گیا یا سکون کی صورت اختیار کر گیا تو یوں سمجھیے کہ فنکار کا ڈنک نکل گیا۔ فنکار کا محبوب انسان ہے اور جب تک انسان مضطرب اور بیقرار ہے فنکار کی آسودہ خاطری بددیانتی ہے۔ فنکار ارتقا کا پرستار ہے اور ارتقا کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہ خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین بلکہ اس سے بھی آگے نکل جانے کا عمل ہے۔ اس لیے سچے فنکار کے دل میں تخلیق کی لگن بجھ نہیں سکتی۔ فن تخلیق کرنا تو اپنے اندر قیامت تک کے لیے الاؤ لگا لینے کا نام ہے اور جب تک دُنیا میں ظلم ہے، بے انصافی ہے بھونڈا پن ہے، عدم توازن ہے، ریاکاری ہے، انسان کے بے ساختہ پن کی پامالی ہے اس وقت تک سچے فن کار کا تخلیقی اضطراب ختم نہیں ہو سکتا۔ سو میں ذاتی طور پر اپنے قاری سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے قویٰ سلامت ہیں، میں اس سے بحیثیت فن کار رخصت ہونے کی اجازت طلب نہیں کروں گا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں کسی بڑے پیغام کا شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا میں تو صرف ایک نقطۂ نظر کا شاعر ہوں اور یہ نقطۂ نظر صرف اتنا سا ہے کہ میں ایک

خاص ملک اور ایک خاص کلچر کی پیداوار ہونے کے باوجود کسی انسان کو اجنبی نہیں سمجھتا نقطۂ نظر کی اس عالمگیریت کے باوجود مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں کیونکہ مجھے اسی مٹی نے پیدا کیا اور انہی ہواؤں نے پالا ہے۔ پھر میں جس حسن و توازن کا پجاری ہوں اس کا تصور مجھے یہیں سے ملا ہے اس لیے مجھ پر اس سرزمین کے خاص حقوق ہیں اور میں امن و آشتی کا پرستار ہونے کے باوجود اس کے ناموس و تحفظ کے لیے لڑ بھی سکتا ہوں اور اس کی آن پر مر بھی سکتا ہوں۔ حد سے بڑھی ہوئی عالمگیریت والے مجھ پر تنگ خیالی کا الزام بھی دھر سکتے ہیں مگر میں اس ماں کو کیسے بھول جاؤں جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔

چرواہے

وہ بانکے ترچھے چرواہے　　یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں!　　منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں　　دَرّاتے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارادے تولتے ہیں　　پروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذت پاتے ہیں　　مکّی کے مہکتے دانوں میں
دن بھر کی تھکی ہاری چڑیاں　　جب آتی ہیں کاشانوں میں
یہ اپنا جی بہلاتے ہیں!　　پریوں کے حسیں افسانوں میں
صدیوں سے اجڈ کہلاتے ہیں　　فیشن کے غلام انسانوں میں
لیکن یہ ان سے بڑھ کر ہیں　　مضبوط اپنے ایمانوں میں
رکھتے نہیں اپنی مورتیاں!　　تہذیبوں کے بت خانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں　　کھیتوں میں اور کھلیانوں میں

جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں!

۱۹۴۰ء

غزل

مہکتی ہے مرے آغوش میں خوشبوئے یار اب تک
مری آنکھوں میں ہے اُس سحرِ رنگیں کا خمار اب تک

کوئی آتا نہیں اب دل کی بستی میں، مگر پھر بھی
امیدوں کے چراغوں سے ہیں روشن رہگذار اب تک

ابھی تک نصف شب کو چاندنی گاتی ہے جھرنوں میں
نہیں بدلی شبابِ منتظر کی یادگار اب تک

جلا رکھے ہیں شہراہوں پہ اشکوں کے دیئے کب سے
نہیں گزرا مگر اس سمت سے وہ شہسوار اب تک

شکستِ آرزو کو عشق کا انجام کیوں سمجھوں
مقابل ہے مرے آئینۂ لیل و نہار اب تک

۱۹۴۱ء

ترکِ دریوزہ

اب نہ پھیلاؤں گا مَیں دستِ سوال

مَیں نے دیکھا ہے کہ مجبور ہے تو
میری دُنیا سے بہت دور ہے تو
تیری قسمت میں جہانبانی ہے
میری تقدیر میں حیرانی ہے
بزمِ ہستی میں سرافراز ہے تو
میرے انجام کا آغاز ہے تو
تو ہے آسودۂ فرشِ سنجاب
خلد ہے تیرے شبستاں کا جواب
مسجدِ شہر کی محراب کا خم
تیری تقدیس کی کھاتا ہے قسم
مَیں ہوں اک شاعرِ آوارہ مزاج
اور ترے فرق پہ اخلاق کا تاج

میں نے عالم سے بغاوت کی ہے
تو نے ہر شے سے محبت کی ہے :
مَیں نے مذہب یہ بھی الزام دھرا
تو نے وہموں کو بھی ایماں سمجھا
گل کہاں اور خس و خاشاک کہاں
عالم پاک کہاں خاک کہاں

اب نہ پھیلاؤں گا میں دستِ سوال

۱۹۴۲ء

کروٹیں

کتنے ادوار سے گذرا ہے شباب
عشق، امید، تذبذب، انجام

ذرّے ذرّے میں خیالی فردوس
یعنی ہر گام پہ اوہام کے دام

ایک مرکز پہ دھڑکتی تھی حیات
"دست بر سینہ، نظر بر لبِ بام"

مجھ کو محسوس ہوا کرتا تھا
اپنے اشکوں میں ستاروں کا خرام

مضمحل سوچ میں لپٹی ہوئی صبح
دلربا فکر میں ڈوبی ہوئی شام

گنگناتے ہوئے جھرنوں کے قریب
کسمساتا ہوا اک پیکرِ نور!

وہ شفق رنگ لبوں کی لرزش
جیسے مُوسیٰ کے خیالوں میں طور

رخ پہ گیسوئے طلائی کی وہ لٹ
جیسے آکاش کے دامنوں میں حور

سمٹی باہوں میں لپٹنے کی امنگ
جیسے کلیوں میں چٹکنے کا شعور

مسکراہٹ میں محبت کی کسک
تلملاہٹ میں جوانی کا غرور

میں نے اس عالمِ مدہوشی میں
منجمد وقت کا دھارا دیکھا

جب کبھی غور کیا دُنیا پر ایک آوارہ ستارا دیکھا
مَیں نے آفاق کی پہنائی میں حُسن کو انجمن آرا دیکھا
اس قدر تند تھا سیلابِ شباب نہ سفینہ نہ کنارا دیکھا

ایک دن حُسن سے نظریں جو ہٹیں
قلبِ ہستی کو دو پارا دیکھا

اک طرف رقص کی بجلی چمکی اک طرف آہ کا شعلہ بھڑکا
اک طرف تھاپ پڑی طبلے پر اک طرف بھوک کا بادل کڑکا!
زلفیں لہرائیں۔ ہوائیں مہکیں ہونٹ تھرائے۔ کلیجہ پھڑکا
بھاؤ پھر اور چڑھے۔ مے چھلکی فصلیں تیار ہوئیں۔ دل دھڑکا

سانس لیتا رہا پھر بھی انساں
اندھی فطرت کا مجبور لڑکا!

شاعرِ حسنِ بیاں تک محدود فلسفہ ہرزہ سرائی کا شکار
سرفروشوں پہ سلاسل کی گرفت سورماؤں پہ سیاست کا غبار
نوجوانوں کے ارادے بے رنگ جیسے صحرا میں شہیدوں کے مزار
غم کی ماری ہوئی دوشیزائیں شب کے سناٹے ہیں جیسے گلزار

زندگی غیر مسلسل مستی
موت کا خوف مسلسل آزار

نہ تدبر سے مقدر کو غرض — نہ مشیت سے مرا یارانہ
مجھ پہ ابلیس نے ڈورے ڈالے — مجھ سے یزداں بھی رہا بیگانہ
کب تک احساس کو محصور رکھے — خشک اسرار کا تانا بانا
کہکشاں اب ہے مری منزلِ شوق — کہ بہت چھان لیا ویرانہ
مصلحت یہ ہے کہ تخلیق کروں
نئے مے نوش، نیا مے خانہ

مژدہ اے عالمِ نو کے خوابو! — مائلِ خیر ہے انساں کا شرف
اِس میں کچھ دوشِ کمانوں کا نہیں — میرے تیروں سے گریزاں تھا ہدف
دل کی دھڑکن وہ نشیبوں سے اٹھی — محوِ پرواز ہے تاروں کی طرف
حدّتِ حبس سے زنداں ٹوٹا — اپنے موتی کو اچھالے گا صدف
گردشِ چرخ خبردار رہے
اب مرا عزم ہے تقدیر بکف

۱۹۴۳ء

واپسی

اپنے افکار کی گستاخ اڑانوں کے طفیل بارہا دیکھے ہیں تاروں کے نشیمن میں نے
جن کو حوروں نے مہ و مہر کی کرنوں سے بُنا اپنے اشکوں سے بھگوئے ہیں وہ دامن میں نے
اپنی نظروں کو مئے عشق سے صیقل کر کے کر لئے گنبدِ گردوں میں بھی روزن میں نے
ٹمٹمانے لگے ایوانِ مشیت کے چراغ جب کیا روح کے فانوس کو روشن میں نے

لیکن افسوس ۔ ان اسرار کے سُلجھانے سے
اور الجھائی ہے تقدیر کی الجھن میں نے

فرش کے راز بھلا عرش پہ کیسے کھلتے درحقیقت مری پرواز، تن آسانی تھی
خاک سے جانبِ افلاک اچھالا جس نے وہ پراگندہ خیالوں کی پریشانی تھی
پھڑپھڑاہٹ مرے شہپر کی جسے تو سمجھا میری افسردہ امیدوں کی پرافشانی تھی
میں جسے دیکھ کے پھر سوئے زمیں لوٹ آیا آئینہ خانۂ فردوس کی حیرانی تھی

پس گئیں جس میں تخیل کی کئی دنیائیں
چرخ پر بھی اسی چکر کی ستمرانی تھی

ان پُر اسرار خلاؤں میں ہے اڑنا بیکار جن کے پیچھے ہے وہی کہنہ و فرسودہ نظام

وہی ہنگامہ تغیّر، وہی قیدِ شکست　　صبح کے دوش پہ بکھرے ہوئے تاروں کے خیام
وہی یزداں وہی مجبور ہیولوں کے سجود　　وہی ایمان کے لالچ میں درود اور سلام
وہی پابندیٔ پیہم، وہی زندانِ بہشت　　وہی بجلی، وہی خرمن، وہی دانہ، وہی دام

میں تو کہتا ہوں کہ لازم نہیں دنیا سے گریز
جب کسی چیز کو حاصل نہیں عالم میں دوام

چشمِ بینا میں یہ سیارۂ رقصاں میرا　　عرش کے معبدِ خاموش کو شرماتا ہے
جھرنے بن جاتے ہیں باریک گلابی ڈورے　　مہر جب ٹھنڈی غاروں میں پھسل جاتا ہے
بحر میں، بن میں، پہاڑوں میں برستے ہیں گلاب　　جب نئی صبح کا سیلاب امڈ آتا ہے
کارخانوں سے ابلتا ہوا پرپیچ دھواں!　　فتنۂ شہر کو انگڑائی پہ اکساتا ہے

سبز کھیتوں کی لہکتی ہوئی ہریاول سے
قلبِ دوشیزۂ صحرا کئی بل کھاتا ہے

کتنے ہنگاموں کا مرکز ہے مری بزمِ حسین　　کتنی مستی سے ہے لبریز مرا ساغرِ زر
کتنے دل لذتِ نظارہ سے کانپ اٹھتے ہیں　　کپکپاتی ہوئی چلمن کا اشارا پاکر
کتنی پلکوں پہ چمکتے ہیں وہ لرزاں تارے　　جو ٹپکتے ہیں تمناؤں کی خاکستر پر
کتنے راہی ہیں پُراسرار سی راہوں پہ رواں　　جو نہیں جانتے خود بھی کہ رواں ہیں کدھر

کتنی شمعیں ہیں جو اجڑے ہوئے محلوں میں جلیں
کتنے گھر چشمکِ انجم کے رہے دست نگر

سرِ کہسار سسکتا ہوا کمزور سا چاند — میری دنیا سے بچھڑتے ہوئے گھبراتا ہے
جانتا ہے کہ وہ مبہوت فرشتوں کا حرم — ان نشیبوں کی بلندی پہ چلا جاتا ہے
اب بھی کرنوں کے سہارے سے کوئی پیکرِ نور — عرش سے وادیِ سینا میں اتر آیا ہے
اب بھی جبریل ستاروں کے اٹھا کر پردے — بحر و بر پر شبِ خاموش میں منڈلاتا ہے

اب بھی افلاک پہ دبکا ہوا گلزارِ جناں
خاک سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتا ہے

میں نے قطرے میں بھی سیلاب کی چنگھاڑ سنی — میں نے ذرے کے دہن میں بھی زباں دیکھی ہے
جس حقیقت سے مرا دہر بھی بیگانہ رہے — دھندلے دھندلے سے دریچوں میں عیاں دیکھی ہے
وہ تڑپ جس کا ستاروں نے کیا تھا دعویٰ — ننھے سے پھول کے ریشوں میں رواں دیکھی ہے
جس تجلی سے عبارت ہیں اڑانیں میری — اپنے احساس کے غرفے میں نہاں دیکھی ہے

منحصر ہے مری دنیا پہ نظامِ کونین
میں نے یزداں کی بھی چشمِ نگراں دیکھی ہے

۱۹۴۲ء

غزل

امنگ مجھ کو نہیں چرخِ نو بنانے کی
ابھی ہوس ہے ستاروں کی تھاہ پانے کی

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

نوازشوں نے طلب کا گداز چھین لیا
بس اب تو عام کرو رسم دل دکھانے کی

کس انقلاب کی غماز ہیں خدا جانے
ترے خرام میں اٹھکیلیاں زمانے کی

جمالِ عرش کے فنکار کا ہے اوجِ کمال
سمندِ ناز کو کیا فکر تازیانے کی!

ندیم کھیل رہا ہوں پرانی یادوں سے
یہی تو آخری کوشش ہے بھول جانے کی

۱۹۴۴ء

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ کس نے جھانکا
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے
کس نے پائل کے مدھر تال پہ دوہے گائے

سوئی سوئی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کو فنکار
مرمریں گالوں پہ مدھم سے شفق رنگ دیئے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اُس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تبسم، جیسے
نیلی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کمانوں سی جبینوں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی — مسکراہٹ میں گجردم کی خنک رعنائی
کالے بالوں وہ موہوم سنہری لہریں — جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا — وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے تپتے سائے
وادیٔ خواب میں وہ صرصرِ دنیائے شعور — جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آجائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہنِ تار — تارے ٹکرائے خلاؤں میں فضا چکرائی!
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لیے صبح کی دیوی آئی

۱۹۴۴ء

راستے کا موڑ

خیال و خواب کی دنیا سے بھاگ آیا ہوں   جوانیوں کے چمن زار تیاگ آیا ہوں
میں بن کے راگ گیا ہو کے آگ آیا ہوں

شفق میں ڈوبے ہوئے پرتوں پہ گھوم چکا   ہوا میں کھوئی ہوئی راگنی پہ جھوم چکا
گلوں کے بھیگے ہوئے عارضوں کو چوم چکا

کبھی شباب کی تنہائیوں پہ رو یا ہوں   کبھی سُلگتے ہوئے بازوؤں پہ سویا ہوں
اب اپنے ذہن کی پرچھائیوں کا جویا ہوں

یہ زندگی ہے کہ حبسِ دوام ہے ہمدم   قدم قدم پہ پرستش کا دام ہے ہمدم
یہ داستان ابھی نا تمام ہے ہمدم

جوان ہوں مگر احساسِ خود شناس نہیں   اداس ہوں مگر اس کی کوئی اساس نہیں
بایں ہمہ یہ سکونِ دوام راس نہیں

رواج و رسم میں لُٹتا رہا خیال مرا   دل و دماغ میں گھلتا رہا کمال مرا
حصارِ جبر میں لُٹتا رہا جمال مرا

جو کہنا چاہوں تو میری زباں پہ پہرے ہیں   جو کہہ بھی دوں تو مرے سامعین بہرے ہیں

جو کہہ چکوں تو سلاسل ہیں اور کٹہرے ہیں

مقابلے ہیں ادھر زور آزمائی کے ؛ اِدھر گلے ہیں مشیت کی کج ادائی کے
سمجھ میں آنہ سکے راز کبریائی کے

وہاں فضاؤں میں شعلوں کے تن رہے ہیں جال یہاں پڑے ہیں گزرگاہوں پر غریب کے لال
وہ زندگی کے مجاہد، یہ زندگی کے وبال

اُدھر اُمنگ کہ ہفت اِقلیم زمانہ ملے اِدھر پکار کہ چاول کا ایک دانہ ملے
سبھی حصول کے ظلمات کو روانہ ملے

میں شاہراہوں پہ لاشوں کے ڈھیر دیکھ چکا میں رقص گاہوں میں لاکھوں کو سیر دیکھ چکا
میں اس تضاد کے سب ہیر پھیر دیکھ چکا

مجھے نشیب و فراز جہاں سے شکوہ ہے عدم میں بھٹکے ہوئے کارواں سے شکوہ ہے
الٰہی ! تجھ سے، تیرے لامکاں سے شکوہ ہے

یہ مصلحت مرے ادراک سے نہاں کیوں ہے ترا سکوتِ پر اسرار بیکراں کیوں ہے ؟
نگاہِ برق میں میرا ہی آشیاں کیوں ہے ؟

بس اب الٹ کے رہوں گا یہ پردہ ہائے قدیم کہ عام ہو نہ سکی تیری رحمتوں کی شمیم
کوئی پکار رہا ہے مجھے ۔ ندیم ! ندیم !

میں آرزو کو حقیقت بنا کے دم لوں گا میں اپنی خاک سے نکہت بنا کے دم لوں گا
ترے جہاں کو جنت بنا کے دم لوں گا

مجھے تو دیکھ! مرے لشکر و سپاہ نہ دیکھ　　مرے چراغ تو گن اپنے مہر و ماہ نہ دیکھ
مجھے بلا تو سہی: اوجِ بارگاہ نہ دیکھ!

تری ہی دین سہی قوتِ ستارہ شکار　　سلگ رہا ہے مگر میرا عزم طور آثار
مرا کلام ہے میری تڑپ آئینہ دار

میں خود ہی اپنا معتمد رُتبہ بنے نکلا ہوں　　شرر ہوں اور جہنم نگلنے نکلا ہوں
مقامرو! میں نئی چال چلنے نکلا ہوں

میں آدمی ہوں بہشتوں کے راز جانتا ہوں　　میں خاص خاص فرشتوں کے راز جانتا ہوں
میں ان حجاب سرشتوں کے راز جانتا ہوں

اک آفتاب نہفتہ شبِ سیاہ میں ہے　　نئی زمین نیا آسماں نگاہ میں ہے!
یہ شعبدہ مرے احساس کی پناہ میں ہے

عمل کے دشت میں جب عزم دندنائے گا　　افق پہ نجمِ سحر جب نقاب اٹھائے گا!
تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا،

جب اپنے قصر میں اپنا دیا جلاؤں گا　　جب اپنے کھیت کا پھل آپ ہی اٹھاؤں گا
خیال و خواب کی دنیا کو لوٹ جاؤں گا

۱۹۴۴ء

رفتارِ زمانہ

خیالات کے دھندلے دھندلے افق پر کوئی چاند جلوہ نما ہو رہا ہے
امیدوں کی اُجڑی ہوئی وادیوں میں کوئی شوخ نغمہ سرا ہو رہا ہے

شہنشاہوں کی مرمریں بارگاہوں میں فانوس روشن ہوئے جس کے خوں سے
مشیت کے الجھے ہوئے راستوں سے وہ مقہور بھی آشنا ہو رہا ہے

تمدن کی قربان گاہوں پہ بے رنگ لاشیں نشانِ سفر بن رہی ہیں
حکومت کے پنجے میں محبوس و مجبور نالہ، صدائے درا ہو رہا ہے!

سرور اور مستی کی جنت میں کب تک میں انگڑائیوں کے ہیولے بناؤں
کہ اجداد کی خاک کا ذرہ ذرہ مرے چارسو لب کشا ہو رہا ہے!

رگِ سنگ میں زندگی پھڑپھڑائی، چٹانیں اڑیں اور ٹکرا کے ٹوٹیں!
وہ آئینہ خانوں میں اک شور اٹھا 'یہ کیوں ہو رہا ہے' 'یہ کیا ہو رہا ہے'!

جسے چند ممتاز تاریخ دانوں نے مذہب کا اندھا تعصب کہا تھا
زمانے کے دربار سے مفلسوں کو وہ جذبِ دروں پھر عطا ہو رہا ہے

وہ کافر نگاہی! — یہ رنگیں نوائی! — کسی مصلحت کی ہے معجز نمائی
جسے طفلِ مکتب کہا جا رہا تھا، وہی قابلِ اعتنا ہو رہا ہے!

وہ بیلیں جو ایوانِ شاہی کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں کو چھپاتی رہی ہیں
اب ان کے پنپنے، لپٹ کر تڑپنے کا اندازِ اژدر نما ہو رہا ہے
غزال اپنے صحرا کے زنداں سے نکلے پہاڑوں میں گھومے سمندر میں جھانکے
اسی ولولے کے ہیں چرچے جہاں میں یہی تذکرہ جا بجا ہو رہا ہے

۱۹۴۴ء

غزل

بیانِ شوق کو مرہونِ خامشی تو کروں
ترے سکوت کی لیکن برابری تو کروں

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے احترامِ جفا
مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں

یقیں تو ہے مجھے پیمانِ دوست پر لیکن
میں اپنے آپ کو مجبورِ زندگی تو کروں

مجھے غروب کا پیغام ہے قبول، مگر
میں تیرے چاند ستاروں کی ہمسری تو کروں

مجھے بہشت سے انکار کی مجال کہاں
مگر زمیں پہ محسوس یہ کمی تو کروں!

اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات مری
مگر یہ شوق۔ تماشائے جانکنی تو کروں

الٰہی! حشر میں دے رخصتِ نمائشِ دل
میں اس سپید اندھیرے میں روشنی تو کروں

بس ایک پل کیلئے زیست کا حجاب اٹھا
عدم فروش قہقہوں سے دل لگی تو کروں

ندیمؔ اوجِ محبت فراقِ یار سہی
مگر میں عشق کے عنوان کو جلی تو کروں

١٩٤٥ء

عقیدے

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے ——

کون نکلے گا! کہاں نکلے گا!
بیکراں رات، ستارے نابود
چاند ابھرا ہے؛ کہاں ابھرا ہے؟
اک فسانہ ہے تجلی کی نمود!
کتنے گنجان ہیں اشجارِ بلند
کتنا موہوم ہے آدم کا وجود

مضمحل چال — قدم بوجھل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے۔

مجھ کو سوجھی ہے نئی راہِ فرار
آہن و سنگ شرر برسائیں
آؤ اشجار کی بنیادوں پہ
تیشہ و تیغ و تبر برسائیں

اک تسلسل سے ہم اپنی چوٹیں
بے خطر بار دگر پرستے ہیں!
ذہن پر چھائے ہوں کیوں بادل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے —
نوعِ انساں کو نکلنا ہوگا
ان اندھیروں کو نگلنا ہوگا

۱۹۴۶ء

سامنا

نقرئی چاندنے پیپل کی گھنی شاخوں میں
اپنی کرنوں کے لپکتے ہوئے تار الجھائے
جھیل کی سطح پہ یوں لوٹ رہی ہیں لہریں
جیسے راہی کو جب راہی پہ جب راہی آئے
سرسراتی ہے کچھ اس طرح ہوا
کامنی کان کے پاتال میں جیسے گائے!!

میرے بچھڑے ہوئے محبوب، قریب آ جاؤ
میں وہی ہوں، میری حالت سے نہ دھوکہ کھاؤ
خاک آلودہ جبیں پر مری، تارے چھڑکو
میری جلتی ہوئی آنکھوں میں شفق ٹپکاؤ
آؤ آؤ میرے دیرینہ و تنہا ساتھی!
میرے آئینۂ ماضی کی جِلا بن جاؤ

جسم ! میں جسم کا بھوکا ہوں ؛ مجھے سم سے کیا
مجھ کو معلوم ہے اس کانچ کے سپنے کا مآل
ہونٹ بے رس ہیں، چمک خون کی بے مایہ ہے
گال بے رنگ ہیں ، فانی ہے جوانی کا گلال
تم تو بالوں کو بکھیرے ہی چلے جاتے ہو
اسی ظلمت میں ہے خورشیدِ محبت کا زوال

عشق کی تان، ٹھہرنا تو، کہاں ٹوٹے گی!
میرے کانوں میں بھی شاید کوئی آواز آئے
سازِ تقدیس کے تارد کوئی نغمہ، کوئی دھن
کیسی چپ چاپ ہے ۔ اب کوئی نہ آنے پائے
نقرئی چاند نے پیپل کی گھنی شاخوں میں
اپنی کرنوں کے پگھلتے ہوئے تار الجھائے

۱۹۴۶ء

فن

ایک رقاصہ تھی کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا
ڈگمگائی تو سب اطراف سے آواز آئی
"فن کے اس اوج پہ اک تیرے سوا کون گیا"
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اٹھی، اٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا
اوک اٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے
رقص کا یہ بھی اک انداز ہے ـــ اللہ اللہ
ہاتھ پھیلے رہے، سِل سی گئی ہونٹوں سے زباں
ایک رقاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا:
پردہ سرکا تو معاً فن کے پجاری گرجے:
"رقص کیوں ختم ہوا؟ وقت ابھی باقی تھا"

۱۹۴۶ء

غزل

خدا نہیں، نہ سہی، ناخدا نہیں نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں نہ سہی

تری طلب کا تقاضا ہے زندگی میری
ترے مقام کا کوئی پتا نہیں، نہ سہی

تجھے سنائی تو دی یہ غرور کیا کم ہے
اگر قبول مری التجا نہیں نہ سہی

تری نگاہ میں ہوں، تیری بارگاہ میں ہوں
اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی

شبِ سیاہ کی تاریکیوں کا ساتھ تو ہے
کوئی ستارہ مرا رہنما نہیں، نہ سہی

نہیں ہیں سرد ابھی حوصلے اڑانوں کے
وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں نہ سہی

وہی ندیم، وہی حسن کا قصیدہ نگار
ترے حضور اگر لب کشا نہیں نہ سہی

۱۹۴۶ء

غزل

فروغِ ماہ میں تو اور شبِ سیاہ میں تو
ہر لباس نمایاں مری نگاہ میں تو

ترے غرور کے انداز سے ہویدا ہے
نہ مل سکے گا مجھے زندگی کی راہ میں تو

اب اس سے بڑھ کے ثبوتِ وفا نہیں ممکن
تری پناہ میں دنیا، مری پناہ میں تو!

ترے لبوں کے کناروں پہ کپکپی کیسی
کھڑا ہے جیسے محبت کی بارگاہ میں تو

ورود کی ابدیت ہے قرب کی معراج
نہ مل سکے گا ملاقاتِ گاہ گاہ میں تو

چراغ بجھنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آ سکے گا مرے خانۂ تباہ میں تو

اس اجتناب کے صدقے کہوں گا حشر کے دن
کہ منعکس تھا مری خواہشِ گناہ میں تو

۱۹۴۶ء

مجاز

ایک مٹی کا دِیا لَو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی اُمڈ آیا ہے
اے بلندی کے خدا، تو نے بنا کر پستی
کیا فقط جذبۂ تخلیق کو بہلایا ہے؟

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے ترا ساغرِ شب
میری قسمت میں فقط ایک چراغِ مُردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکوں جچتا ہے
فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزردہ؟

شکوہ سنجی مرا مقصود نہیں رب کریم
خود ترا حکم ہے اخفائے حقیقت نہ کروں
تو تجلّی کو جو آلودۂ پستی نہ کرے!
ایک مٹی کے دیتے سے بھی محبت نہ کروں

۱۹۳۷ء

طلوع

مہیب رات کا آغاز کتنا رنگیں تھا
مہیب رات کا انجام جانے کیا ہوگا

وہ رات جس نے ستاروں سے بھی کنارا کیا
غروبِ مہر کے منظر رنگیں کے بعد
خیال و خواب کے میں نقش ہی ابھارا کیا
مَیں سوچتا تھا کہ اس تیرگی کے طوفاں میں
کسی کرن نے لپکنا اگر گوارا کیا

تو اس کرن کا نیا نام جانے کیا ہوگا

بس اک ذرا سی کرن کی مجھے تمنا تھی
کہ ٹوٹ جائے یہ دیرینہ ظلمتوں کا طلسم

مگر چراغ کی لَو سے لہُو نکلنے لگا :
کچھ ایسی تند تھی جلتے لہُو کی جولانی
جہانِ خواب مرا کرۂ میں بدلنے لگا
جب آنکھ کھول کے آفاق پہ نظر ڈالی
تو شش جہت سے لہو اس طرح ابلنے لگا
کہ تشنہ بن کے بہے جا رہے تھے سینکڑوں جسم

سلگتے خون میں اک کارواں روانہ ہُوا
کسی کے پاس درانتی کسی کے ہاتھ میں ہل
کسی کی بانہوں میں معصومیت کے رکھوالے
لبوں پہ عُمر کے تقاضے گلے میں تیز کٹار
کسی کے ہاتھ خالی تو پاؤں میں چھالے
کسی کی اٹھی ہُوئی چھتیاں مجسم پیاس
دریدہ چھاتیوں پہ زلفِ خم بہ خم ڈالے
وہ ڈوب ڈوب چلے عظمتوں کے تاج محل

مرے چراغ کی لَو میرے ماہتاب کی ضو!
اندھے سیل کا کوئی کنارا ہے کہ نہیں ؟

مجھے مہیب اندھیرے کی بے حسی ہی بھلی
یہ زندگی، یہ تمدن کی ناز پروردہ
لہو میں ڈوب کے کن بستیوں کی سمت چلی
پلٹ کے دیکھ تو آؤں کہ میرے زخموں میں
چٹک رہی تھی جو انسانیت کی نرم کلی
وہ آج پھول کا رنگیں اشارا ہے کہ نہیں

کلی چٹک بھی چکی، پھول رنگ لا بھی چکا
وہ رنگ جس کو جہاں نے لہو کا نام دیا
مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا آغاز تھا اگر غازہ
مہیب رات کا انجام بھی حنائی ہے
بجھا بجھا سا نہ دیکھو شہاب پاروں کو
یہ اک عجیب سا احسانِ کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو لالہ فام دیا

۱۹۴۷ء

اِنسان

خدا عظیم، زمانہ عظیم، وقت عظیم
اگر حقیر ہے کوئی یہاں تو صرف ندیم

وہی ندیم وہی لاڈلا بہشتوں کا
وہی ندیم جو مسجود تھا فرشتوں کا

وہ جس نے جبر سے وجدان کو بلند کہا
وہ جس نے وسعتِ عالم کو اک زقند کہا

وہ جس نے جرمِ محبت کی جب سزا پائی
تو کائنات کے صحراؤں میں بہار آئی

وہ جس نے فرش کو بھی عرش کا جمال دیا
وہ جس نے تند عناصر کو ہنس کے ٹال دیا

بڑھا تو راہیں تراشیں، رکا تو قصر بنائے
اڑا تو گیت بکھیرے، جھکا تو پھول کھلائے

وہ جس کے نام سے عظمت قسم اٹھاتی ہے
اسی کی آج خدائی ہنسی اڑاتی ہے

نہیں کسی سے بگڑنا مرا سبھاؤ نہیں
مری سرشت میں گلزار ہیں، الاؤ نہیں

ہزار بار شکستوں پہ مسکرایا ہوں
مصیبتوں کی گرج میں بھی گنگنایا ہوں

اگر حریم بقا سے فنا ملی ہے مجھے
اسی فنا میں بقا کی ادا ملی ہے مجھے

خدا شناس بھی ہوں اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دور بھی ہوں اور خدا کے پاس بھی ہوں

یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا

زمیں مری ہے فضا بھی مری خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیم ماورا بھی مری

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولہا ہوں میں یتیم ہو نہیں

۱۹۴۷ء

غزل

مَیں کب سے گوشِ برآواز ہُوں، پکارو بھی
زمیں پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی!

مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ حیات
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمہی لیکن
نقاب اٹھاؤ، نشانِ سفر اُبھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم! تم اس بوجھ کو سہارو بھی

۱۹۴۰ء

غزل

بُکا ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلائے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا، مگر کرو نہ بحث
سحر تو آئے گی، لیکن ابھی دیے نہ بجھاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دُور سویرا
تو یہ اصُول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ

اجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
پلٹ رہے ہیں دوانے، اتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات چلی ہے، مری حسین خطاؤ

ادھر شباب کا مس ہے، ادھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

۱۹۴۷ء

غزل

فریبِ رنگ عیاں ہے جدھر نگاہ کروں
ضمیرِ پاک بتا، کس کے دل میں راہ کروں

مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کونسا گناہ کروں

کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

یہ جرم ہے کہ میں گردوں پرست کیوں نہ ہوا
جو اذن ہو تو ترے حسن کو گواہ کروں

یہ آرزو ہے کہ تیری پناہ کو تج کر
میں تیرے لطف و کرم کو جہاں پناہ کروں

۱۹۴۷ء

غزل

صبح میں دیکھتا ہوں شام کے آثار ابھی
زیست ہے میرے لیے مستقل آزار ابھی

مَیں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں تو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

تیرے پیکر کے تصور سے خزاں کے باوصف
شاخِ گل صحنِ گلستاں میں ہے گل بار ابھی

کشتِ ویراں! ابھی برسات کی رُت باقی ہے
بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی!

ابھی انساں کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی

کتنے ساگر ہیں سنبھالے ہوئے ناسفتہ گہر
کتنے اسرار ہیں آمادۂ اظہار ابھی

ضبطِ شوخیٔ گفتار، سنبھل اور سنبھال
ڈھل رہا ہے مرے احساس میں کردار ابھی

ابھی نسلوں کے اک انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی

مژدۂ حریتِ فکر سنانے والو
کتنے منصور ہیں موجودِ سرِ دار ابھی

١٩٤٧ء

آزادی کے بعد

کتنے خاکے مری امنگوں کے
پیچ کھاتے ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم
یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتّے !
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں
عصمتوں کی سبھی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پیٹ کے تکمی ہے!
اپنے بچپن کے رہگذاروں کو
جیسے معزول شہریار گنے
اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی عزم زندگی سے تہی
کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہد کہنہ سال کی مانند
مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا
زندگی! زندگی! پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے، اپنے ہونٹوں سے
خون کی پپڑیاں اتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم !
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

۱۹۴۸ء

غزل

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے

ق

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئنے کی چادریں پھیلا گئے!

کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اک پہیلی بن کے ہر سو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اکتا گئے

رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی
آج ستارے اگر ٹکرا گئے؟

کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد
دیکھئے! اگلے زمانے آ گئے!

آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

۱۹۴۸ء

غزل

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی شش جہات کا دولہا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

فیصلے کر رہے ہیں عرش نشیں
آفتیں آدمی پہ آتی ہیں!

کلیاں کس دور کے تصور میں
خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

تیرے وعدے ہوں جن کے شاملِ حال
وہ امنگیں کہاں سماتی ہیں

۱۹۴۹ء

غزل

نہاں ہے محشرِ آہنگ زیرِ پردۂ ساز
تری تھکن ہے ترے اضطراب کی غماز

یہ تیری چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دُور کی آواز

ترے غرور میں پنہاں مرا غرورِ شکست
میں تیرے راز نہ کھولوں مرے محرمِ راز

ابھی کچھ اور سِسکنا ہے وقت کی لو پر
ابھی نہیں مرے معیارِ زندگی میں گداز

غبارِ اوجِ بصارت، ستارے بارِ نظر
بہت لطیف ہیں احساس کے نشیب و فراز

پھر ایسا نرم ہوا میرا ذوقِ خود نگری
مرے لیے مرا دشمن بھی ہے مرا دمساز

ندیم! فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں
بایں غریب کشی، جو رہے غریب نواز

١٩٤٩ء

جبر و اختیار

ایک موہوم ثقافت کے علمبردار ہو
ایک بے رحم صداقت کا گنہگار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں
ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کی جھنکار ہو تم
ایک سونتی ہوئی شمشیرِ جگردار ہوں میں
تم نے افراد سے پیمانِ محبت باندھا
آدمیت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں
چمن افروزیِ شبنم سے مجھے کیا لینا
حدتِ مہر سے جلتا ہوا گلزار ہوں میں

میں اگر بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہوں
تم عقیدوں کے غبارے مجھے لا دیتے ہو
میرے محسوس کے پُر ہول تشنّگاؤں کے عوض
کتنی تقدیس سے فرمان جیا دیتے ہو!

منتظر ہے کب سے مری بستی کا چراغ
تم تجلی کو بلندی پہ لٹا دیتے ہو
ریشۂ گل میں لہو دوڑ رہا ہو تو مجھے
پھول کا نام بدلنے پہ سزا دیتے ہو

چونک اٹھتی ہے مری چاپ سے جب ظلمتِ شب
تم ستاروں کو ستاروں سے بھڑا دیتے ہو

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے
اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے

نوعِ انساں کے نئے عزم کی تکریم کرو
جبکہ ذرہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے
تم ہی کہہ دو کہ سمندر ہے کف آلود سا کیوں
کیا چٹانوں سے سفینہ کوئی ٹکرایا ہے؟

۱۹۴۹ء

جشنِ چراغاں

کس لئے آج کی شب جشنِ چراغاں نہ کروں
دیس کی جنتِ ویراں کو فروزاں نہ کروں

شپرۂ چشم نہیں ہوں کہ ڈروں نور سے مَیں
چل کے آیا ہوں چراغاں کے لئے دور سے مَیں

تیرگی بھاگ رہی ہے مرے آگے آگے
کتنے تارے مرے قدموں کی دھمک سے جاگے

کتنے گلشن مرے نغموں میں نہا کر مہکے!
کتنے بھوبھل مری آہوں کی تپش سے دہکے

کتنی آنکھوں میں جلائے ہیں محبت کے چراغ
کتنے ہونٹوں سے لگائے ہیں امیدوں کے ایاغ

کتنے دکھتے ہوئے قدموں کو شفا بخشی ہے
کتنی بے جان امنگوں کو بقا بخشی ہے

ایک دنیا کو مَیں دھوکا تو نہیں دے سکتا
قمقمے عاریتاً مَیں تو نہیں لے سکتا!

مجھ کو اپنے ہی چراغوں کو جلانا ہوگا
اک نیا عرش منڈیروں پہ سجانا ہوگا

مجھ کو اس دیس کی ایک ایک کلی پیاری ہے
مجھ پہ اس دیس کا احسان بہت بھاری ہے

اس کی آغوش میں پل بڑھ کے جوانی پائی
اسی مکتب سے یہ اعجازِ بیانی پائی

اس زمیں پر مَیں اندھیروں کو نہ جمنے دوں گا
اپنی دیرینہ اڑانوں کو نہ تھمنے دوں گا!

مَیں تجلی کا پیامی ہوں، جلاؤ شمعیں
آج ہر طاق پہ، ہر گھر میں سجاؤ شمعیں

قمقمے برق کے، مرمر کے دریچوں میں جلے
ان گھروندوں پہ، مرا خون چراغوں میں جلے

۱۹۶۹ء

وقت

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے
دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ
آسماں سرمئی فرغل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے، جھکا آتا ہے
وقت بیزار نظر آتا ہے

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
صبح کی نقرئی تنویر رچی جاتی ہے
دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفس کی صدا آتی ہے
آسماں کتنی بلندی پہ ہے اور کتنا عظیم
نئے سورج کی شعاعوں کا مصفا آنگن

وقت بیدار نظر آتا ہے !
سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے
دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
سینۂ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں
آسماں تیز شعاعوں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھونے سے پگھل جائے گا
وقت تیار نظر آتا ہے !

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
زندگی کتنے حقائق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں پھیلے ہوئے میدانوں پر
ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں لہو اگلا ہے
آسماں گردشِ ایام کے ریلے سے ہراساں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں
وقت کی راہ میں موڑ آتے ہیں منزل تو نہیں آ سکتی ۱۹۳۹ء

غزل

چراغِ مردہ کو اک بار اور اکساؤں
دیا بجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

خدا کے کام جو آئے خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

میں رنگ و نغمہ و رقصِ حیات ہوں یعنی
ضمیرِ دہر ہوں، شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے روپ میں چٹکیں
ذرا زمین کے پندار کو جو اکساؤں

کسی کی زلف بھی منّت پذیرِ شانہ سہی
مگر مَیں گیسوئے گیتی تو پہلے سلجھاؤں

میں اب سے دُور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا
یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

۱۹۵۰ء

اِنسان عظیم ہے

اس نے تجھے عرش سے بلایا
اِنسان عظیم ہے خدایا!
تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا
تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر
پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں

وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا!
انسان عظیم ہے خدایا

تو نور ہی نور بن رہا تھا
وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا

آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم
لیکن تجھے دل سے مانتا تھا !

اب چھونے لگا ہے تیرا سایہ
اِنسان عظیم ہے خدایا !

تو سنگ ہے اور وہ ثمر ہے
تو آگ ہے اور وہ اجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ
تو دشت ہے، وہ چراغِ لالہ

انساں نے تجھے حسیں بنایا
اِنسان عظیم ہے خدایا !

تو عینِ حیات ہے مگر وہ
تزئینِ حیات کر رہا ہے

اس پر ہے غلط فنا کا الزام
سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو وقت ہے، بے رُخ، بے بقا ہے
وہ حسن ہے رنگ ہے صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے

ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا!

۱۹۵۰ء

درانتی

چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
خمیدہ ہل کی یہ الہڑ جوان نورِ نظر
سنہری فصل میں جس وقت غوطہ زن ہوگی
تو ایک گیت چھڑے گا، مسلسل اور دراز
ندیم ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوتے گئے آفتاب کاٹے گئے

ہم آفتاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
زمیں پہ خلدِ بریں کا جواب کاٹیں گے
کوئی بتائے زمیں کے اجارہ داروں کو
جلا رہے ہیں جو گذری ہوئی بہاروں کو

کہ آج بھی تو اسی شانِ بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تلک اس کی چمک نہیں موقوف
کہ اب نظامِ کہن بھی اسی کی زد میں ہے
خمیدہ ہل کی یہ الھڑ جوان نوکِ ظفر
جب اس نظام میں لہرا کے غوطہ زن ہو گی
تو ایک گیت چھڑے گا، مسلسل اور دراز

ندیم ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے آفتاب کاٹے گئے

۱۹۵۰ء

غزل

یوں بیکار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ

سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ
دھوکا دینے والا دردِ دے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

ظلمت سے مانوس ہیں آنکھیں چاند ابھرا تو مند جائینگی
بالوں کو الجھا رہنے دو، اک الجھاؤ سو سلجھاؤ

کل کو کل پر رکھو جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے آج کی رات یہیں رہ جاؤ

کب تک یوں پردے پردے میں حسن محبت کو ٹھکراتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے چھپنے والو سامنے آؤ

دورِ خزاں میں سنتا ہوں تخلیق کا یہ آہنگِ مسلسل
کلی کلی کی نرم چٹک میں پھولو! میری آہٹ پاؤ

مرنے سے کچھ کام چلا تو اے دم سازو مر بھی لیں گے
مرنا تو برحق ہے لیکن تم جینے سے باز نہ آؤ

۱۹۵۱ء

غزل

ہوتا نہیں ذوقِ زندگی کم
بنیادِ حیات ہے ترا غم

احساسِ جمال اُبھر رہا ہے
جب سے ترا التفات ہے کم

تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی
کوندے کی لپک، غزال کا رم

سامانِ ثبات ہیں سفر میں
امید کے پیچ، راہ کے خم

شمعوں کی لَویں ہیں یا زبانیں
آنسو ہیں کہ احتجاجِ پیہم

•

انجم سے کھلائے گی شگوفے
شبنم سے لدی ہوئی شبِ غم

طوفان کا منتظر کھڑا ہے
یہ مَیں سحر کو شب کا عالم

۱۹۵۱ء

غزل

ہمہ سرمایۂ دامانِ چمن
ریشۂ گل ہو کہ سورج کی کرن

ہمہ اضداد ہے کردارِ جمال
صبح کا نور ہے تاروں کا کفن

وقت کی آنکھ بنا جاتا ہے
تیرہ و تار قفس کا روزن

تجھ کو آنکھوں کی چکا چوند سے کام
ذہن روشن ہے تو دنیا روشن

رات کو آگ نہ لگ جائے کہیں
آنچ دیتے ہیں ستاروں کے بدن

فن کے صحراؤں پہ ساون کی گھٹا
میرا بدلا ہوا اندازِ سخن

۱۹۵۲ء

یہ رات

دلیلِ صبحِ طرب ہی سہی یہ سناٹا
مگر پہاڑ سی یہ رات کٹ چکے تو کہوں
پسِ نقاب ہی پنہاں سہی عروسِ سحر
مگر یہ پردۂ ظلمات ہٹ چکے تو کہوں

یہ رات بھی تو حقیقت ہے تلخ و تند و درشت
اسے سحر کا تصور مٹا نہیں سکتا!
مجھے تو نیند نہیں آئے گی کہ میرا شعور
شبِ سیاہ سے آنکھیں چرا نہیں سکتا

اگر نشانِ سفر تک کہیں نہیں نہ سہی
میں رینگ رینگ کے یہ شب نہیں گزاروں گا
شکست سے مرا اخلاق اجنبی ہے ندیم
سحر ملے نہ ملے رات سے نہ ہاروں گا

۱۹۵۲ء

غزل

قرارِ جاں بھی تمہی، اضطرابِ جاں بھی تمہی
مرا یقیں بھی تمہی ہو، مرا گماں بھی تمہی

تمہاری جان ہے نکہت، تمہارا جسم بہار
مری غزل بھی تمہی، میری داستاں بھی تمہی

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رکے ہوئے بھی تمہی ہو، رواں دواں بھی تمہی

خدا کا شکر مرا راستہ معیّن ہے!
کہ کارواں بھی تمہی، میرِ کارواں بھی تمہی

تمہی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا!
کہ میرا غم بھی تمہی، غم کے رازداں بھی تمہی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
افق پہ منزلِ ادراک کا نشاں بھی تہی

تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تہی ہو، مری زباں بھی تہی!

۱۹۵۲ء

گونج

رات کا پُر وقار سناٹا
گونجتی ہے صدائے پائے نجوم

اصل میں گونج ہے سکوت کا گیت
اور پھر کس قدر لطیف و بسیط
گونج ہی گونج کبریا کی رات
گونج ہی گونج ماورائے حیات
یہ حقیقت مگر کسے معلوم

زندگی گونج کے سوا کیا ہے
ایک انسان دوسرے کا نقیب

پھول کی گونج پھول کی مہکار
اور یہی ہے اثاثۂ گلزار

ایک اک پھول گلستاں کا غرور
ایک اک آدمی جہاں کا غرور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب

چاند پر شاخِ گل لچکنے لگی!
ہولے ہولے چلی عروسِ صبا

زندگی کے ورق الٹنے لگے
کتنے پردے نظر سے ہٹنے لگے
نوعِ انساں خدا سے جا کے ملی
ابتدا انتہا سے جا کے ملی!
ٹوٹتا ہے فضا کا سناٹا!

۱۹۵۲ء

تھپکی

(ایک کسان عورت کا اپنے شوہر سے خطاب)

میرے بالوں میں سرسوں کے تارے
میرے ہاتھوں میں گندم کے خوشے
میری جھولی میں مکی کے دانے!
میرے دل میں محبت کے توشے

تند جھونکے مرے ہم سفر ہیں
دھوپ میری سنہری سہیلی
کھیت میرے خیالوں کے آنگن
مَیں انہی میں پلی، اِن میں کھیلی

میری آنکھوں میں تصویر تیری
میرے ہونٹوں پہ تیری کہانی

میری باتوں میں تیرے قصیدے
میرا پندار تیری جوانی!

جھٹپٹے تک ابھی ہاتھ تیرے
بل کی ہتھی سے ہٹنے نہ پائیں
مانگ کی طرح سیدھی سیاریں
ٹیڑھی لیکوں سے کٹنے نہ پائیں:

مَیں یہاں ان چٹانوں میں بیٹھی
تجھ کو دوہے سناتی رہوں گی
اپنی آواز کی تھپکیوں سے
ہاتھ تیرا بٹاتی رہوں گی!

سیپیوں میں کسی جل پری نے
کتنی محنت سے آنسو چھپائے
اِن دمکتے ہوئے آنسوؤں سے
ایک ساحر نے موتی بنائے

جب سمندر میں طوفان آیا
سیپیاں ساحلوں کو سدھاریں
کیسا اندھیر ہے آنسوؤں سے
تاجروں نے دکانیں نکھاریں

میرے پیارے تیری انگلیوں نے
کتنے دانوں سے دھرتی سجائی !
اور دانوں کو سکے بنا کر
تیرے مالک نے ڈفلی بجائی !

جل پری ہو کہ دہقان میرا
لٹ رہے ہیں، مگر کون جانے
آنسوؤں میں جہنم چھپے ہیں !
گولیاں ہیں یہ گندم کے دانے

ہائے میں نے یہ کیا کہہ دیا ہے
کوئی سنتا نہ ہو میرا دوہا
آنسوؤں کی کہانی میں کیسے
چھپانے لگا سُرخ دوہا

۱۹۵۲ء

غزل

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

چاند جب دُور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے اُلجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

فروری ۵۳ ۱۹ء

روایت

قدموں کے نقوش ہوں کہ چہرے
قبروں کے گلاب ہوں کہ سہرے
تاریخ کے بولتے نشاں ہیں
تہذیب کے سلسلے رواں ہیں
یہ رسمِ جہاں قدیم سے ہے
آدم کا بھرم ندیم سے ہے

ستمبر ۱۹۵۲ء

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو

جب جھیل کے آئینے میں گھل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہوا ہو تصویر
ہر پھول سوال ہو گیا ہو!

جب خاک سے رفعتِ سما تک
ابھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

اس وقت مرے سلگتے دِل پر
شبنم سی اتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریمِ بے نشاں سے
انساں کو پکارتا ہے کوئی

دسمبر ۱۹۵۲ء

پابندی

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں - تیری سیاست فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
مَیں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

اپریل ۱۹۵۲ء

راستے

ریگِ صحرا سے نکل آنے کے بعد
جاگ اٹھا ہے کتنی سمتوں کا شعور
راستوں سے کٹ گئے ہیں راستے

یوں گھرا طوفانِ بیداری میں ذہن
اور یوں ٹوٹے مرے خوابوں کے پھول
پتھروں سے پٹ گئے ہیں راستے

راستوں پر ہر طرف بکھرے ہوئے
یوں تو ہیں صدیوں کے قدموں کے نقوش
میتوں سے اٹ گئے ہیں راستے

سوچنا بھی جرم بن کر رہ گیا
میں تو بس پل بھر کو ٹھٹکا تھا، مگر
دُور افق تک ہٹ گئے ہیں راستے

پھر وہی صحرائے ناپیدا کنار
پھر وہی سنسان ٹیلوں کا طواف
دائروں میں بٹ گئے ہیں راستے

اکتوبر ۱۹۷۵ء

گجر بجادو

(سپوتنگ نمبر۲ کی پرواز کے روز)

انگڑائیاں لے رہے ہیں تارے
اب رات کی چلمنیں اُٹھادو
اب تیرگی ہاتھ مل رہی ہے
اب اس کو رہِ سحر دکھادو
اُونچے پیڑوں کی خامشی کو
جھونکوں کے سرود میں بہادو
مشرق کا افق چمک اٹھا ہے
مغرب کے غبار کو ہٹادو!
سورج کا اب انتظار کیسا
پَو پھٹنے لگی، گجر بجادو

اب اَوج پہ ہے جمالِ انساں
اب چرخ کو آئینہ بنا دو
جو ہاتھ ترس گئے حنا کو
اب ان کو شفق کا رنگ لا دو
شبنم کی طرح جو رو رہے ہیں
تاروں کی طرح انہیں ہنسا دو

اُڑتے ہوئے پل نہیں تھمیں گے
اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دو
ماضی کے مزار سے نکل کر
فردائے حیات کو صدا دو
اب حدِ نظر کی مشعلوں کو
تا حدِ خیال جگمگا دو

قرنوں سے تنی ہوئی خلا کو
انساں کا فیصلہ سنا دو

یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا
اُس وہم کو واقعہ بنا دو
اے جنتِ گم شدہ کے رازو
آدم ابھرا ہے راستہ دو
اے حوصلو میرا ساتھ دو تم
اے ولولو، تم مجھے دُعا دو!

۳ر نومبر ۱۹۵۷ء

ایشیا

ہر گئے دَور کا احتساب ایشیا　　ہر نئے دَور کا اضطراب ایشیا
ظلمتِ شب کا دارالحساب ایشیا　　صبحِ تہذیب کا آفتاب ایشیا

مدتوں تک بر و بحر کے حکمراں ، ایشیا ہی کے ٹکڑوں پہ پلتے رہے
یوں تو مغرب کی نظروں میں ہے آج بھی صرف اک خیمۂ بے طناب ایشیا

ابروؤں کے یہ خم، چتونوں کے یہ بل، صاحبوں کے یہ انداز ہیں بے محل
جو سوال اس کی غیرت سے پوچھے گئے، دے رہا ہے انہیں کا جواب ایشیا

اے جنونِ مکافات کے شاکیو　　یاد گزرے ہوئے وہ زمانے کرو
جب لہو اس کے دل سے نچڑتا رہا　　اور کھاتا رہا پیچ و تاب ایشیا

خلوتِ خاص میں ہے یہ کہرام کیوں　　قصرِ عالی ہے لرزہ براندام کیوں

دیکھتا ہے خود اپنے کھنڈر میں اگر عظمتِ آدمیت کا خواب ایشیا

گو بظاہر ابھی پیرہن چاک ہے اس کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلاب ایشیا اور چھینو تو موجِ سراب ایشیا

جنسِ ناموسِ آدم کے سوداگرو یہ صدی ہے مرے ایشیا کی صدی
چترِ شاہنشہی تھامنے کے عوض اب نہیں بیچتا خونِ ناب ایشیا

کل بھی تہذیب و اخلاق کی مشعلیں پرتوِ ایشیا سے فروزاں رہیں
برق و جوہر کے اس دورِ تاباں میں بھی نوعِ انساں کا عہدِ شباب ایشیا

اگست ۱۹۵۸ء

غزل

لب خاموش سے افشا ہوگا — راز ہر رنگ میں رسوا ہوگا!

دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا — ابر گلزار پہ برسا ہوگا!

تم نہیں تھے تو سرِ بامِ خیال — یاد کا کوئی ستارا ہوگا

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں — کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا

جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم — اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

زینتِ حلقۂ آغوش بنو — دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو — درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا،

آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی — آج کا دن بھی اندھیرا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی — شاخ سے گل کوئی ٹوٹا ہوگا!

عمر بھر روئے فقط اس دھن میں — رات بھیگی تو اجالا ہوگا!

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا!

ستمبر ۱۹۵۸ء

دعوت

اے میری پرستشوں کی حقدار
آ، میں ترے حُسن کو نکھاروں،
چہرے سے اُڑا کے گردِ ایام
آ، میں تری آرتی اُتاروں

تو میری زمیں بھی آسماں بھی
مَیں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

اکتوبر ۱۹۵۸ء

بارش

رات بارش نے سقفِ زنداں پر
اس تسلسل کے ساتھ دستک دی
کہ اندھیرے کے انجماد کو بھی
یہ صدا گونج بن کے چیر گئی

ہر طرف پھیلتی، سمٹتی ہوئی
سر کشیدہ فصیل کی سوگند!
میں تو سمجھا تھا، کنجِ زنداں میں
زیست کی ہیں تمام راہیں بند

آج میکش حیات گاتی ہے
بندقفوں کے اس دیار میں بھی!
حسن فن کار کو پکارتا ہے!
سنگ و آہن کے اس حصار میں بھی

دسمبر ۱۹۵۸ء

غزل

تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا
کتنا چرچا تھا تری انجمن آرائی کا

داغِ دل نقش ہے اک لالۂ صحرائی کا
یہ اثاثہ ہے مری بادیہ پیمائی کا

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

وہ ترے جسم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم
ہر حقیقت میں ملا خم تری انگڑائی کا

افقِ ذہن پہ چمکا ترا پیمانِ وصال
چاند نکلا ہے مرے عالمِ تنہائی کا

بھری دنیا میں فقط مجھ سے نگاہیں نہ چرا
عشق پر بس نہ چلے گا تری دانائی کا

ہر نئی بزم تری یاد کا ماحول بنی !
میں نے یہ رنگ بھی دیکھا تری یکتائی کا

ناز آتا ہے جو لب پر تو غزل بنتا ہے
میرے فن پر بھی ہے پرتو تری رعنائی کا

فروری ۱۹۵۹ء

غزل

میں ہوں، یا تو ہے خود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یوں تری یاد سے ہوتا ہے اُجالا دل میں
چاندنی میں چمک اُٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چھلکتے ہیں تبسم بن کر
آ گیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے!

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

غمِ جاناں غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اِس انداز میں شعر
موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اِس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

جولائی ۱۹۵۹ء

غزل

آ گیا راس شکستوں کا شمار آخر کار
چھپ گئے یاد کے پھولوں میں امیدوں کے مزار

سورج ابھرا ہے، کہ ڈوبا ہے کہ گہنایا ہے
یا فقط اپنے لہو سے ہوئی دھرتی گلنار

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جائیے، زخموں کے لگے ہیں بازار

بوندیں بجتی ہیں کہ کنکر درِ تنہائی پر
ابر گھر آیا ہے یا ٹوٹ پڑے ہیں کہسار

سر بچا لائے ہو، لیکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے، تا حدِ نظر، منظرِ دار

آدمی لاکھ بڑھے، فاصلے گھٹتے ہی نہیں
ہٹتا جاتا ہے مگر چھٹ نہیں پاتا ہے غبار

جوئے شیر آج بھی شیریں کے قدم دھوتی ہے
آج بھی تیشۂ فرہاد سے اُڑتے ہیں شرار

وسعتِ دہر اک اجڑا ہوا معبد ہوتی
روزِ اوّل اگر ابلیس نہ کرتا انکار

نام اس طرح جو مٹتا ہے تو مٹ جائے ندیم
کسی قیمت پہ نہ کم ہو مرے فن کا معیار!

جولائی ۱۹۵۹ء

خشک پتّے

جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
خشک پتوں کی صدا آتی ہے

خشک پتّے ۔ مرے عمروں کے رفیق
خشک پتّے ۔ مری تنہائی کے پھول
خشک پتّے ۔ مری غیرت کے اصول

گوشۂ گلشنِ ویراں کا سکوت
اتنا پُرہول ہے جیسے اک وحش
شب کی باہوں میں لٹک کر رہ جائے
چاندنی اس کا کفن ہو گویا!

چار جانب سے ابلتی ہوئی موت
سانس کو روک کے چلتی ہوئی موت
یک بیک ذہن پہ دستک دے کر
خشک پتوں نے پکارا مجھ کو ——

"باغ اُجڑا ہو کہ آباد رہے
ذہن اس فکر سے آزاد رہے
کہ یہاں اب نہ چلیں گے جھونکے
اور جو چیز جہاں رکھی ہے
حشر کے دن بھی وہیں دیکھو گے"

فصلِ گل ہو کہ خزاں کی رُت ہو
جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
وقت کی آہٹیں گونج اٹھتی ہیں
خشک پتوں کی صدا آتی ہے

ہم ترے پاس بھی ہیں، ساتھ بھی ہیں
ہم وہی ہیں۔ ترے عمروں کے رفیق
ہم وہی ہیں۔ تری تنہائی کے پھول
ہم وہی ہیں۔ تری غیرت کے اصول

اکتوبر ۱۹۵۹ء

غزل

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا
جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا

جب تری دھن میں کہیں لالۂ صحرا دیکھا
ہم یہ سمجھے کہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھا

تارے ٹوٹے تو فضا میں تری آہٹ گونجی
چاند نکلا تو ترا چہرۂ زیبا دیکھا!

شہرِ اغیار سہی، اتنی خوشی کیا کم ہے
ہم نے دیکھا تجھے اور انجمن آرا دیکھا

ہم کو ٹھکرا کے کچھ ایسے ترے تیور بدلے
جب سرِ بزم بھی دیکھا تجھے تنہا دیکھا

ہم تو سمجھے تھے قیامت ہے فراقِ محبوب
تجھ سے مل کر بھی مگر حشر ہی برپا دیکھا

صبح جب دھوپ کے چشمے سے نہا کر نکلی
ہم نے آئینہ بدل، تیرا سراپا دیکھا

بجلیاں اب تو ترے ابرِ کرم کی برسیں
عمر بھر اپنے سلگنے کا تماشا دیکھا!

ہم جو بھٹکے بھی تو کس شانِ وفا سے بھٹکے
ہم نے ہر لغزشِ پا میں ترا ایما دیکھا

ہم بایں تیرہ نصیبی نہ بنے تیرہ نظر
ہم نے ہر رات کی چتون میں ستارا دیکھا

تیری قدرت کی سیاست نہ سمجھ میں آئی
حرم و دیر کو ہر دَور میں یک جا دیکھا

آنکھ کھولی تو جہاں کا یہ جواہر تھا نہ تھا
ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا دیکھا

دسمبر ۱۹۵۹ء

نیا سال

رات کی اڑتی ہوئی راکھ سے بوجھل ہے نسیم
یوں عصا ٹیک کے چلتی ہے کہ رحم آتا ہے
سانس لیتی ہے درختوں کا سہارا لے کر
اور جب اس کے لبادے سے لپٹ کر۔ کوئی
پتّہ گرتا ہے تو پتھر سا لڑھک جاتا ہے

شاخیں ہاتھوں میں لیے کتنی ادھوری کلیاں
مانگتی ہیں فقط اک نرم سی جنبش کی دعا
ایسا چپ چاپ ہے سنولائی ہوئی صبح میں شہر
جیسے معبد کسی مرجھاتے ہوئے مذہب کا!

سر پہ اپنی ہی شکستوں کو اٹھائے ہوئے لوگ
اک دوراہے پہ۔ گروہوں میں کھڑے ہیں تنہا

یک بیک فاصلے تانبے کی طرح بجنے لگے
قدم اٹھتے ہیں تو ذرے بھی صدا دیتے ہیں

درد کے پیرہن چاک سے جھانکو تو ذرا
مردہ سورج پہ لٹکتے ہوئے میلے بادل
کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتے ہیں

یکم جنوری ۱۹۶۰ء

غزل

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دیکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

جانے کیوں اب شبِ ہجراں بھی پیار آتا ہے
تیرا غم میری محبت کو کہاں لے آیا!

میں تری بزم سے اٹھ کر بھی تری بزم میں ہوں
مَیں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا

رات کا شکر کر اے دوست کہ دن ہوتے ہی
تیرے پیکر سے اچٹ آئے گا تیرا سایا

ابر کے چاک سے جب رات ستارے جھانکے
اے مرے بھولنے والے! تو بہت یاد آیا!

اشک آنکھوں میں جب آئے چمک اٹھیں صدیاں
یوں کہ جس دور کو دیکھا اسے گریاں پایا!

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

خشک شاخوں پہ نمو کے یہ نگینے کیا ہیں
زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا!

بیچ دوں کیوں اسے اک نانِ جویں کے بدلے
میں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اکسایا!

۱۹۶۰ء

شامِ فراق

برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور
دمک رہا ہے ستارے کی طرح زخم جگر
چمک رہے ہیں جھروکے مرے خیالوں کے
مری شکست کے چپ چاپ رہگزاروں پر
لپک رہے ہیں تصور پری جمالوں کے
ہر ایک گذرا ہوا پل، کروڑوں روپ لیے
غبار وقت سے یوں جھانکنے لگا، جیسے
امڈ رہے ہیں افق سے پرے غزالوں کے

وہ روشنی ہے کہ ہر چیز ہے برہنہ بدن
وہ ایک فرد کا غم ہو کہ روح عصر کا درد
جو راز دفن رہے مدتوں قبر بہ قرن
کچھ ایسے فاش ہوئے جا رہے ہیں پے در پے

کسی شہید کی نظروں میں جس طرح ٹوٹے
غرورِ جبر و تشدد، طلسمِ دار و رسن
کلیم ہوں، مری شامِ فراق میں طورِ
برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور

ستمبر ۱۹۶۰ء

توحید

دہر کو تشنگیِ نازِ تباں ہے اب تک
تو مری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے، اب تک

تجھ کو اک مجھ سے فقط مجھ سے محبت کیوں ہے
یہ تو میں مانتا ہوں تُو مری جاں ہے اب تک

کیوں مسرت سے ہے محروم تری شانِ جمال
کیوں مرا غم ترے چہرے سے عیاں ہے، اب تک

مرا معیارِ وفا ہے ترے دم سے قائم
ہر گھڑی تو مری جانب نگراں ہے اب تک

مَیں محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں، مگر
ظلم ہے حسن پہ پابندیِ آدابِ وفا

حسن ہے صحنِ چمن، عشق ہے صحرائے بسیط
جس سے کترا کے نکل جاتی ہیں امواجِ صبا

اس کے با وصف بھرے شہر کی تنہائی میں
آج بھی مَیں نے سنی ہے تری آہوں کی صدا

رسن رسم سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں
حسن بھی عشق کرے گا، مجھے معلوم نہ تھا

اکتوبر ۱۹۶۰ء

غزل

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں، تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے!

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے

موسمِ گل میں سرِ شاخِ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

ان سے مل کر بھی نہ کافور ہوا
درد یہ سب سے جدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں گلہ لگتا ہے

اس قدر تند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

مئی ۱۹۶۰ء

غزل

(نذرِ غالب)

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اٹھتی ہے برستی ہے برہمن پر

خمارِ خانہ ویرانی میں یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیونکر ہو
وہ دیوانہ ہوں جس کو پیار آجاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گُل تو رنگِ گُل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبت کا کوئی دھبّہ نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر کیا بتاؤں کس سے نمٹے گا
ندیمؔ اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

مارچ ۱۹۶۱ء

دیوانہ

ایک دیوانۂ کاہل، سرِ گلزارِ حیات
ایک ابنوہ میں چپ چاپ چلا جاتا ہے
ایک گل ہے کہ بگولے میں اڑا جاتا ہے

زندگی شور مچاتی ہے کہ ——"اے دیوانے
چند لمحوں کو تو بچے بھی نہیں کھو سکتے
اتنے بے حس تو فرشتے بھی نہیں ہو سکتے"

بڑھتا جاتا ہے وہ دیوانہ آسودہ خرام
اور کہتا ہے کہ —— اے ہم نفسانِ معصوم
مجھ کو معلوم ہیں جو راز، تمہیں کیا معلوم

رک تو جاؤں چمنستانِ جہاں میں لیکن
میری آنکھوں سے تم آنکھیں تو ملا لو پہلے
مٹھیاں کھول کے پتھر تو گرا لو پہلے!"

مارچ ۱۹۶۱ء

مراجعت

(خلا میں پہلے انسان کی پرواز پر)

میری لب بستگی پر نہ جاؤ
میرے دل میں قیامت بپا ہے
جانے کیا کیا ہیں میرے ارادے
ذہن چھلکا چلا جا رہا ہے
کیا بتاؤں کہ لمحہ گزر کر
میرے کانوں میں کیا کہہ گیا ہے
یوں دمادم قدم اٹھ رہے ہیں
وقت حیراں کھڑا سوچتا ہے
کشش میں لاکھ آئیں عناصر
ابنِ آدم کہاں مانتا ہے

جتنے چبھتے ہیں تلووں میں کانٹے
حوصلہ اور بھی بڑھ رہا ہے
ایک چپ چاپ صحرا ابد کا
مجھ سے پوچھو افق پار کیا ہے
کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پاؤں
صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

یکم اگست ۱۹۶۱ء

فنونِ لطیفہ

کلی چٹکی ہے، جیسے کماں کڑکتی ہے
لہو میں ڈوب کے کھلتے ہوئے چمن کی قسم
گلوں کے روپ میں بکھرے ہوئے ہیں تن پارے
فصیلِ رنگ ہے لاوے کی موج آتش بار
ہری ہری روشیں ہیں کہ زہر کے دھارے
بکھرے ہیں کیسی قیامت کی فصلِ گل میں ہم
کچھ اس طرح سے ہیں گم سم ہرے بھرے اشجار
کھڑے ہوں اجڑے ہوئے مندروں میں جیسے صنم
سکوتِ خلوتِ کنجِ چمن میں گریاں ہے
ٹھہر گئی ہے زمیں وقت پا بجولاں ہے
لرز رہے ہیں مگر زندگی کے لب کم کم
کوئی نہیں کہ جو فن کی گرفت میں لائے
اس ایک پل کو جو ہے خیمہ زن قرن قرن

کوئی نہیں کہ جو چھوئے کنار کی سی کرن
کوئی نہیں کہ جو اپنے لہو میں کرے صنم
اِس ایک پل کو، جو اک پل بھی ہے صدی بھی ہے
جو اہلِ رقص ہیں شل ہو چکے ہیں اُن کے قدم
جو اہلِ نے ہیں، وہ ہیں لے سے برسرِ پیکار
مصوروں نے کئی رنگ گھول کر دیکھے
نہ کرسکے مگر اک چشمِ شاہکار کو نم
پگھل گیا ہے چٹانوں میں دبکے سنگ تراش
اتر گیا ہے قلم کار کے جگر میں قلم

اکتوبر ۱۹۶۱ء

رُوح لبوں تک آ کر سوچے

روح لبوں تک آ کر سوچے ۔ کیسے چھوڑوں قریۂ جاں
یوسف، قصرِ شہی میں بھی، کب بھولا کنعاں کی گلیاں !
موت قریب آئی تو دنیا کتنی مقدس لگتی ہے
کاہشِ دل بھی خواہشِ دل ہے آفتِ جاں بھی راحتِ جاں
میری وحشت کو تو بہت تھی گوشۂ چشمِ یار کی سیر
یوں تو عدم میں وسعت ہوگی عرش بہ عرش کراں تا کراں
غنچے ابتک رنگ بھرے ہیں، ابتک ہونٹ امنگ بھرے
ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہیں پتھرائی آنکھیں نگراں !
صرف اک نالۂ گرم سے ٹوٹیں، شعلوں میں پروان چڑھیں
ہائے یہ نازک رشتے، ہائے یہ بزمِ شیشہ گراں
دشت و دمن میں کوہ و کمر میں بکھرے ہوئے ہیں پھول ہی پھول
رُوئے نگارِ گیتی پر ہیں ثبت مرے بوسوں کے نشاں !

آنکھ کی اک جھپکی میں بیتا کتنے برس کا قربِ جمال
عشق کے اک پل میں گزرے ہیں کتنے قرن کتنی صدیاں
ساری دنیا میرا کعبہ، سب انساں میرے محبوب
دشمن بھی دو ایک تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انساں
دردِ حیات کہیں اب جا کر بننے لگا تھا حسنِ حیات
کس کو خبر تھی محور رہے گی قطع سفر میں عمرِ رواں
جنت کی یخ بستگیوں کو گرمائے گا اس کا خیال
صبحِ ابد تک جمی رہے یہ انجمنِ آتش نفساں

اکتوبر ۱۹۶۱ء

غزل

تو بگڑتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو
ظلم ہے ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

پست اتنی تو نہ تھی میری شکست اے یارو
پر سمیٹے ہیں مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

پہرے بیٹھے ہیں قفس پر کہ ہے صیّاد کو وہم
پر شکستوں کو بھی اک ربط ہے پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا مگر اسے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کر دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار ہیں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

جینے پہ جو مجبور ہو، جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یارب
ہو اذن تو مَیں اپنی صلیب آپ اٹھاؤں

یاد آنے لگا ہے مجھے انجامِ بہاراں
اے ابرِ کرم تیری اجازت ہو تو رو لُوں

سوکھا ہوا پتہ ہوں مگر اے شبِ تاریک
میں ایک ستارہ ہوں اگر شاخ سے ٹوٹوں

۱۹۶۲ء

مشرق ومغرب

گرم ملکوں کا رہنے والا ہوں
برف زاروں سے کتنے ساگر دور
ایک چھالے کی طرح، صحرا میں
میرا خاکستری گھروندا ہے
جس کے چٹخے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تعمیر کا پرانا پن !
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے

چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہو کر
اپنی کرنوں کی جھالروں میں چھپی
ایک رومان بن کے آتی ہے

چاندنی رات گرم ملکوں کی
محنتوں کی تھکن کے سنّاٹے
اپنی ننگی کمر پہ لادے ہوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس!
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قہقہے بن کے مسکراتا ہے!
— اور اپنا لباس عریانی
جس پہ سورج شعاعوں کے کوڑے
اس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے!

گرم ملکوں میں حسن کی قدریں
کتنی اندھی قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پیکر کی

اپنے ہی گیسوؤں کا بن کے دھواں
زندگی کے اُداس آنگن میں :
اک الاؤ لگائے بیٹھی ہیں !
اور اس گردبادِ آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم مُلکوں کے عشق پیشہ جواں
دھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہوئے
موتیوں سے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھرپور ہوتے جاتے ہیں
اتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں

سرد ملکوں میں حسن و عشق کی رَو
زندگی سے قدم ملائے ہوئے

آسماں کی طرح، فضا کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے
گھر میں، معبد میں یا سرِ راہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حُسن اور عشق ملتے ہیں
گرم بوسوں کے پھول کھلتے ہیں

سرد ملکوں میں کتنی گرمی ہے
جسم کی، روح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پہ سرد و مردہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک ذرّے کو بھی سنوارتا ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکریں زندگی کو مارتا ہے

سرد ملکوں کے رہنے والے دوست!

میں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہوں کہ اس خرابے میں
میں اگر بس وہی ہوں جو کچھ ہوں
میں اگر ولولوں کا ملبہ ہوں
میں اگر حوصلوں کا مرقد ہوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے بسی کا راز ہے کیا

سوچتا ہوں (میں سوچ لیتا ہوں)
چاند جو میرے گھر میں نکلا ہے
تیرے ایوان میں بھی جھانکے گا
جس زمیں پر میں ایستادہ ہوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اٹھتی، لچکتی جاتی ہے
اور بن کر ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے

سوچتا ہوں — کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لیے حقیر ہوں مَیں
کہ یہاں دھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لیے عظیم ہے تو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اڑاتی ہے
رنگ اور رت نہیں مدارِ حیات
رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دھوپ
تیرے چہرے کا رنگ، برف تری
تو مری دھوپ کو ترستا ہے
میں تری برف کے لئے بے چین
دو مسافر ہیں — ایک رستہ ہے

قطعات

کمخواب کا نیا لباس پہنے
کس شان سے تو گلی میں آئی
صد شکر کہ جانتی نہیں تو
کمخواب پرست ہے خدائی

ذکرِ مریخ و مشتری کے ساتھ
اپنی دھرتی کی بات بھی تو کرو
موت کا احترام برحق ہے
احترامِ حیات بھی تو کرو

آنسوؤں میں بھگو کے آنکھوں کو
دیکھتے ہو تو خاک دیکھو گے
آئینے کو ذرا سا نم کر دو
پیرہن چاک چاک دیکھو گے

حکمتِ اہلِ مدرسہ کا غرور
میری وحشت سے دب کے ہار گیا
تیرا گھبرا کے مسکرا دینا
زندگی کی نقاب اتار گیا

رنگ جب اپنی حقیقت سے شناسا ہو جائے
لالہ زاروں میں بھڑکتا ہے الاؤ بن کر
رقص جب دائرہ فن سے اُبل پڑتا ہے!
دندناتا ہے سمندر کا بہاؤ بن کر!

ریشۂ گل کو رگِ سنگ بنانے والو
بوئے گل، سنگ سے ٹپکے گی شرارے بن کر
تم کو معلوم تو ہوگا کہ اجالا دن کا
سینۂ شب میں دھڑکتا ہے ستارے بن کر

ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہو آدم کا نشانِ کفِ پا ہو!
ممکن ہے کہ جنت کی بلندی سے اُتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہُوا ہو

اس درد کا بھی کریں مداوا
اس دور کے چارہ گر کہاں ہیں
آنسو مرے دل میں گر رہے ہیں
نالے مرے خون میں رواں ہیں

رنگ و حرف و صدا کی دنیا میں
زندگی قتل ہو گئی ہے کہیں
مر گیا لفظ، اُڑ گیا مفہوم
اور آواز کھو گئی ہے کہیں!

مری شکست پہ اک پرتوِ جمال تو ہے
مَیں کیوں نہ عظمتِ افتادگی پہ اتراؤں
تجھی سے ہے مری آسودہ خاطری کا بھرم
ترے غموں کا خزانہ چھنے تو لٹ جاؤں

کنجِ زِنداں میں پڑا سوچتا ہُوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا!
یہ سلاخوں میں چمکتا ہوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا!

میرے ویرانۂ احساس میں اک پھول کھلا
چارہ گر ڈھونڈنے نکلے ہیں مگر مرہمِ دل
میں تو یہ درد کی دولت انہیں چھونے بھی نہ دوں
تیری شدت کی قسم! اے غمِ دل اے غمِ دل

قوتِ بازوئے انساں کے بغیر
خاک کا ڈھیر جہانِ زر و سیم
اتنی عظمت کا تصوّر بھی محال
جتنی انسان کی محنت ہے عظیم

تیری ہیبت ہے جہانگیر، مگر
تجھ سے تو میں بخدا بہتر ہوں
اس شہنشہ سے جو نفرت بیچے
مَیں محبت کا گدا بہتر ہوں

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر مَیں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
مَیں نے انساں سے محبت کی ہے

جب چٹانوں سے پلٹتا ہے سمندر کا شباب
دور تک موج کے رونے کی صدا آتی ہے
یک بیک پھر یہی ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی موج
اک نئی موج میں ڈھلنے کو پلٹ جاتی ہے

تمتماتے ہیں سلگتے ہوئے رخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا!
اتنا سیّال ہے یہ پل، کہ گماں ہوتا ہے
مَیں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جائے گا

آنکھ کھل جاتی ہے جب رات کو سوتے سوتے
کتنی سونی نظر آتی ہے گزرگاہِ حیات
ذہن و وجدان میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں
شام کی بات بھی لگتی ہے بہت دور کی بات

گلوں میں رنگ تو تھا، رنگ میں جلن تو نہ تھی
مہک میں کیف تو تھا، کیف میں جنوں تو نہ تھا
بدل دیا ترے غم نے بہار کا کردار
کہ اب سے قبل چمن کا مزاج یوں تو نہ تھا

اپنی آواز کی لرزش پہ تو قابو پا لو
پیار کے بول تو ہونٹوں سے نکل جاتے ہیں
اپنے تیور بھی سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے!
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

بھدّم

ڈوبتا ہوا سورج ایک بدلی سے چھو گیا تو شام کو آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفق بدلی میں سما نہیں سکی اس لئے چھلک پڑی ہے۔ شہر کی عمارتوں، درختوں، سڑکوں، بسوں اور موٹروں، شہریوں کے لباسوں اور ان کے چہروں پر اس ایک لمحے کے موقلم نے شفق کے شعلے کا رنگ پھیر دیا تھا۔ ہماری کار جب حمید کے بنگلے میں داخل ہوئی تو عرفان بولا "دیکھو دیکھو لوگو۔ رنگ تو دیکھو حمید کے بنگلے کا" اس نے کار بہت آہستہ کر لی۔ اور اپنے خاص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اور مزے لے لے کر بولنے لگا۔

وہ ہوش میں یوں بولتا تھا جیسے لوگ شراب پی کر بولتے ہیں۔ اور شراب پی کر تو وہ بہت کم بولتا تھا۔ "اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی شرارت ہے تو میں یہ سمجھ کر کار کو بیک کر لے جاتا۔ کہ ہم کسی غلط بنگلے میں آ گئے ہیں۔ حمید کے بنگلے کا رنگ تو نرس کے لباس کی طرح سفید ہے اور ہم جس بنگلے میں داخل ہو رہے ہیں، وہ تو شرمائی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح گلابی ہو رہا ہے۔ دیکھو دیکھو، برانڈے سے اُترتی ہوئی مسز حمید کو دیکھو کیسی لگ رہی ہیں!

• سُلفے دی لاٹ ورگی" شہید بے ساختہ بولا۔

عرفان اور مَیں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ شہید مُسکراتا رہا۔ اور رب نواز چُپ چاپ بیٹھا وِنڈ سکرین سے پارپُیں دیکھتا رہا جیسے وہ طیارے میں سوار ہے اور طیارہ بادلوں میں سے گذر رہا ہے۔ عرفان نے کار روک لی اور مسز حمید بولیں "کوئی لطیفہ ہو گیا کیا؟"

شہید بے تکلف اور مُنہ پھٹ آدمی ہے۔ اس لیئے مَیں اس ڈر سے کہ کہیں شہید پنجابی بولی کو دُہرا نہ دے۔ فوراً بولنے لگا: "شہید کہہ رہا ہے کہ جنت کی دیواروں پہ دوزخ کے شعلوں کی چمک اسی طرح ناچتی ہوگی جیسے اس وقت شفق نے آپ کے بنگلے ——"

مگر میرے فقرہ پُورا کرنے سے پہلے ہی مسز حمید نے تالی بجادی۔ وہ زور کا قہقہہ لگانے سے پہلے ہمیشہ تالی بجاتی ہیں۔ بس انہوں نے تالی بجائی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں میں دبا کر ہنسنے لگیں اور ان کے لمبے بال جنہیں ایک ربن نے ان کی پیٹھ پر سمیٹ رکھا تھا۔ ان کے شانوں پر بکھر بکھر گئے۔

اتنے میں حمید بھی بھاگتا ہوا آپہنچا۔ وہ گیلا گیلا سا لگ رہا تھا۔ شاید نہا کر نکلا تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سے مصافحہ کرنے کے بجائے رب نواز کے پاس جا کر اس کی لمبی ناک مروڑ دی۔ رب نواز ہمارا فلسفی دوست ہے۔ وہ گھنٹوں کچھ نہیں بولتا اور جب وہ نہیں بولتا تو کم سے کم مَیں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ اگر اس کا مُنہ کھولا جائے تو اس کی زبان پھپھوندی سے سفید ہو رہی ہوگی۔

البتہ جی بھر کے شراب پی لینے کے بعد جب وہ بولنے پر آتا ہے تو آپ چاہنے لگتا کر

بآوازِ بلند اور باجماعت جماہیوں پر جماہیاں لیں، وہ بولتا چلا جاتا ہے (یعنی وہ اس معاملے میں عرفان کے بالکل برعکس ہے) ویسے گفتگو میں خواتین بھی شامل ہوں تو وہ انہیں قدم قدم پر بولنے کا موقع دیتا رہتا ہے۔ اور انہیں ممنون کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ اس وقت وہ عرفان کی کار میں پچھلی سیٹ پر میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ بس بیٹھا تھا۔ دوستوں کا دوست تھا اس لیے سب اسے برداشت کرتے آ رہے تھے۔ مگر آج اتنی چمکتی ہوئی رنگین شام میں اس کی خاموشی مجھے تو زہر لگ رہی تھی۔ میں نے رستے میں ایک بار اس سے کہا بھی کہ "اُلو صاحب آپ بھی تو کچھ بولئے" مگر وہ اُلوؤں کی طرح میری طرف دیکھنے لگا تھا، اور شہید نے یہ کہہ کر اُسے خارج از بحث کر دیا تھا کہ "اُلو تو صرف رات کو بولتے ہیں"۔

حمید نے رب نواز کی ناک مروڑی تو وہ چلّایا "میں کیاں بکواس ہیں؟"

اور شہید کو ابلیس کی طرح اچھل کر بولا۔ "یار مجھے نواز کی آواز سنائی دے رہی ہے!"

ہم ہنس رہے تھے تو ایک دم جیسے کسی مشین کا بٹن دب گیا اور ہمارے سروں پر پھیلے ہوئے پیپل کی شاخوں میں سینکڑوں چڑیاں دن کا ماتم کرنے لگیں۔ کسی نے جیسے پھونک مار کر سورج کو بجھا دیا۔ بدلی جو شفق سے جل اُٹھی تھی، راکھ ہو گئی۔ بنگلے کا رنگ سرمئی سا ہو گیا۔ اور دُور کسی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر کوئی اذان دینے لگا۔

برآمدے میں آ کر حمید بولا۔ "سنو۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ شام سے پہلے ہی میرے گھر میں آ دھمکو۔ بیگم سے پوچھ لو کہ خاص مہمان کے آنے میں ابھی کم سے کم ایک گھنٹہ باقی ہے۔ اور تم جانتے ہو خالد وقت کا کتنا پابند ہے۔ اب تم آ گئے ہو تو ظاہر ہے کہ بیٹھ کر چھت کی

کڑیاں نہیں گنو گے بلکہ میری وہسکی پر جھپٹو گے جو مَیں نے نہ جانے کس کس کے پرمٹ پر مانگ تانگ اور چھین جھپٹ کر جمع کی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ آج رب نواز بھی پینے کے موڈ میں ہوا تو .... کیوں نواز تم تو نہیں پیو گے؟"

"پیوں گا" رب نواز بلی کی میاؤں کے سے لہجے میں بولا۔

اور حمید کو عرفان اور شہید اور مَیں نے بڑی مشکلوں سے تھاما جو صدمے سے بے ہوش ہونے کے لئے ایک آرام کرسی پر گرنے جا رہا تھا۔

بیگم حمید میرے پاس آکر بولیں "کیوں رحیم صاحب کہیں آپ بھی تو نہیں پینے لگے؟"

مَیں نے کہا "برسوں تک بندہ ان شیطانوں کی صحبتِ بد کے اثرات سے محفوظ رہا ہے لیکن دیر تک گندی صحبت میں رہنے سے انسان، انسان سے زیادہ خربوزہ بن جاتا ہے اور بزرگ کہہ گئے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"۔

"ہائے اللہ۔ تو آپ بھی پینے لگے!" بیگم حمیدہ نے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کولھوں پر دے مارے "ہائے مَیں نے سوچ رکھا تھا کہ آپ آئیں گے تو آپ سے غالب کے چند اشعار سمجھوں گی۔ بڑی اُلجھن میں تھی"۔

"کیوں حضرت رحیم!" شہید نے مجھ سے پوچھا "اس دوران میں رامپور کے عرشی صاحب نے غالب کی کوئی غیر مطبوعہ غزل تو نہیں چھپوا دی؟"

مَیں نے کہا "بکواس مت کرو۔ تم کیا جانو شاعری کس چڑیا کا نام ہے"۔

"اچھا تو یہ کسی چڑیا کا نام ہے؟" شہید بولا۔ اور سب لوگ (سوائے رب نواز کے)

قہقہے مارتے، تالیاں بجاتے اور پاؤں پٹختے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ آخر میں رب نواز یوں داخل ہوا جیسے بکرا مذبح میں داخل ہوتا ہے۔ شراب پینے سے پہلے رب نواز پر ہمیشہ اسی طرح عاجزی اور خاکساری کا دورہ پڑتا ہے۔

صوفوں پر بیٹھ کر ہم ابھی بیگم حمید کے ذوقِ آرائش کی پوری داد بھی نہیں دے پائے تھے کہ ایک کار کے رکنے کی آواز آئی اور حمید یہ فریاد کرتا ہوا باہر لپکا کہ سب کمبختوں نے وقت سے پہلے آکر اس کی وہسکی کے سٹاک کا صفایا کرنے اور خالد اور ثریا کے سامنے اسے شرمندہ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ بیگم حمید بھی باہر چلی گئیں۔ پھر ایک اور کار رکی، اس کے بعد ایک اور کار رکی۔ برآمدے میں باتوں سے زیادہ قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ پھر باہر کسی خاتون کی بڑی لمبی ہنسی کی آواز آئی اور اندر شہید اپنے آس پاس اور صوفوں کے نیچے یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گھنگھرو کہاں گیا؟" وہ بولا۔

"گھنگھرو؟" میں نے پوچھا۔

"گھنگھرو کیسا مسخرے کہیں کے؟" عرفان نے آس پاس جھانکتے ہوئے کہا۔

شہید بولا۔ "بھئی وہی جو ابھی ابھی باہر برانڈے سے لڑھک کر اندر آیا ہے۔"

ہنستی ہوئی خاتون ہنستی ہوئی اندر آئیں تو وہ بولا۔ "یہ جو ابھی تک بج رہا ہے۔"

"کیا بج رہا ہے؟" خاتون نے ہنسی روک کر پوچھا۔

"گھنگھرو" شہید بولا۔ اور ہماری جان نکل گئی۔

شوہر کی خودکشی کے بعد بیگم نورالہدیٰ کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ دوسروں کی تو خوب خوب ہنسی اڑاتی تھیں مگر اپنے بارے میں ذراسی بات سے بھی بھڑک اٹھتی تھیں اور ایک دو پارٹیوں سے تو وہ اسی بنا پر واک آؤٹ بھی کر چکی تھیں۔ شہید کا جواب سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ خالد کی شادی کی خوشی میں دی جانے والی اس پارٹی کا آغاز ہی تلخی سے ہوگا۔

"گھنگھرو؟" بیگم نورالہدیٰ نے پوچھا۔ "کہاں بج رہا ہے گھنگھرو؟"

"رب نواز کے گلے میں بج رہا ہے۔" شہید بولا۔ اور عرفان اور میں نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ بیگم نورالہدیٰ گھنگھرو بجانے لگیں اور شہید بولتا رہا۔ "کھانے سے پہلے وہسکی ملنا یقینی ہو اور وہسکی کے آنے میں ذراسی دیر ہو جائے تو رب نواز کے گلے میں موت کا گھنگھرو بجنے لگتا ہے۔ آپ سب ذرا سانس روک کر سنئے تو مسلسل بج رہا ہے۔"

سب مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئے تو رب نواز بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے"

"لیجیے" شہید بولا۔ "ہم گھنگھرو کو رو رہے تھے اور یہاں گھڑیال بجنے لگا۔"

ایک درجن قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ پھر سب لوگ صوفوں میں دھنس گئے۔ بیگم سیدہ اور بیگم نورالہدیٰ کے علاوہ دو خواتین اور بھی تھیں۔ ایک شیخ شفقت الٰہی مرحوم کی بیوہ اور دوسری ان کی لڑکی نشین۔ میں نے نشین کو لڑکی اس لئے کہا ہے کہ وہ ابھی تک کنواری تھی۔ اور خواتین میں اس لئے شامل کیا ہے کہ اس عمر کی کنواریوں کو خواتین نہ کہا جائے

تو کئی غلط فہمیوں کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اس لئے باہمی تعارف کی ضرورت نہ تھی کچھ دیر تک بیگم حمید کے ذوقِ آرائش کی تعریف ہوتی رہی اور وہ تالی بجا بجا کر ہنستی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے ڈرائنگ رُوموں میں رکھے ہوئے نوادرات کے شجرے سُنانے لگے۔

مسٹر رینلڈ مسیح نے بتایا کہ اس کے پاس والٹ وٹمین کے آٹو گراف ہیں۔ اس پر بیگم شفقت الٰہی بولیں۔ "بھئی حمید صاحب۔ آپ سے میں نے کتنی بار کہا ہے۔ کہ آپ اتنی اچھی اچھی گلٹرنگ قسم کی پارٹیاں دیتے رہتے ہیں مگر آپ سے یہ کبھی نہ ہوا کہ وہسکی کے ساتھ کسی ایک آدھ شاعر کا بھی انتظام کر دیتے۔ بیگم حمید تو ریڈیو پر عورتوں کے پروگرام میں غالب کی غزلیں پڑھتی ہیں۔ وہی حمید صاحب کو یاد دلا دیا کریں۔ اور آج تو آپ نے اپنے دوست کی شادی کی تقریب کی دعوت دی ہے۔ آج کوئی شاعر دا عر ہوتا تو کوئی سہرہ ویہرہ ہو جاتا"

"کیا کروں بیگم صاحبہ" حمید بولا۔ "کوئی شاعر میرا واقف ہی نہیں، مجھے تو داد دینا بھی نہیں آتا۔"

"لیجئے۔ آپ تو کمال کرتے ہیں حمید بھائی"۔ نشیمن لبلی۔ "شاعر سے واقفیت میں کیا لگتا ہے۔ رقعہ بھیج دیجئے کہ پارٹی ہے۔ شرب و نوش کا انتظام ہے تشریف لائیے گا۔ میں کہتی ہوں آپ کسی بھی شاعر کو ایسا رقعہ بھیج دیتے تو شہید صاحب اور نواز صاحب سے بھی پہلے آپ کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا آداب عرض کرتا ملتا۔"

سب کھلکھلا کر ہنسے۔ پھر بیگم نورالہدیٰ ساڑھی کے پلّو کو سینے پر کس کر پھیلاتی

بنی بولیں "مضراب صاحب کیسے رہتے ؟"

"سویٹ" خواتین و حضرات یک زبان ہو کر بولے۔

"ہائے سچ کہتی ہوں" نشمین نے کہا "مجھے تو کسی اردو میگزین میں مضراب کا کلام
نظر آجائے تو کیٹس اور ڈائلن ٹامس یاد آجاتے ہیں۔ دیکھئے انکل عارف اگر ان کے گھر
بھی فون ہو تو یہیں سے فون کر دیجئے"

"ہمارے ہاں کے شاعروں کے گھروں میں فون نہیں ہوتے" ایس محمد عارف بولے۔

"اور جب وہ فون لگوانے کے قابل ہو جاتے ہیں تو شاعر نہیں رہتے" شہید نے
وضاحت کی۔

"یہ سب کیا بکواس ہے" رب نواز نے احتجاج کیا "شاعروں کو مارو گولی بھئی حمید
کچھ منگانا ہے تو منگاؤ ورنہ اجازت دو"

"اجازت! اجازت کیسی" بیگم حمید چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ سب نے ایک ساتھ پلٹ کر
رب نواز کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اُٹھ کر جانے لگا ہے۔

"اجازت کا کیا مطلب نواز" حمید نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

اور رب نواز وہی مسمسی صورت بنائے، اسی منمناتی آواز میں بولا "یہی کہ اگر تم
وہسکی نہیں لاتے تو میں خود جا کر فریج سے نکال لاؤں"

قہقہوں سے ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی اور حمید پسلیوں کو دونوں ہاتھوں سے
دبائے اندر بھاگ گیا۔

چند ہی لمحوں میں تپائیوں پر وہسکی اور شیری کی بوتلیں سجادی گئیں۔ بیرے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لیے حاضر ہو گئے کاگ بلبلا کر اڑے اور آن کی آن میں وسیع ڈائننگ رُوم شراب کی بُو سے بھر گیا۔ سب تین تین چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کاروں کے نئے ماڈلوں، حصص کی قیمتوں، لندن اور نیویارک کے ٹرپوں اور بعض لوگوں کی شادیوں، بعض کی متوقع طلاقوں اور بعض غیر مصدقہ اسکینڈلوں پر یوں گفتگو ہونے لگی، جیسے بعد میں سب کو مل کر اپنی بحث کے نتائج پر غور کرنا اور ایک رپورٹ مرتب کرنا ہے۔

صرف رب نواز چپ چاپ بیٹھا پیتا رہا اور نشین کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا جو دوسری خواتین کے برعکس شیری کے بجائے وہسکی پی رہی تھی۔ اس کی ساڑی کا پلو شانے سے ڈھلک کر اس کی گود میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اور بہت اونچی اور بہت کسی ہوئی بلاؤز کے کنارے اس کے پیٹ، پیٹھ اور بازوؤں کے گوشت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ یہ اس کا پانچواں پیگ تھا اس لیے وہ کہہ رہی تھی "ممی۔ اے ممی جی اب اِس عمر میں تو شیری پر لعنت بھیجیے اور وہسکی بھی چکھیے۔ قسم سے آپ دو تین پیگوں کے بعد ایک دم میری ہم سن ہو جائیں گی"۔

"ماشاء اللہ کیا سن ہو گا آپ کا؟" بیگم نور الہدیٰ نے ایک باپ سے مسکرا کر پوچھا۔

مگر نشین سے پہلے بیگم شفقت الٰہی بول پڑیں "پچھلے سال اکتوبر میں اس کی بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ اکیسویں میں پاؤں ہے بچیسویں میں شادی بیاہ کا سوچیں گے"۔

"شادی کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں کی جا سکتی" رب نواز نے چھٹا پیگ ایک ہی

ڈیک میں پینے کے بعد کہا: "شادی کے لئے صرف بلوغت شرط ہے۔ اور اس کے بعد ہونے والے میاں بیوی کی افہام تفہیم یعنی میوچل انڈرسٹینڈنگ، یہ افہام تفہیم سولہ سترہ برس کی عمر میں بھی ہو جائے تو اس کے بعد شادی نہ کرنا غلط ہوگا، اور اگر تیس برس کی عمر میں بھی نہ ہو پائے تو شادی کرنا غلط ہوگا۔ کیا خیال ہے آپ خواتین و حضرات کا؟"

"نشہ ہو رہا ہے چندو کو۔" شہید بولا "مچھلی کی طرح پیتا ہے کمبخت۔" پھر وہ رب نواز سے براہِ راست مخاطب ہوا "تیرے فلسفے کی ایسی تیسی، ہم پئیں کہ تیری بک بک سنیں۔"

"پینا بجائے خود بے معنی ہے۔" رب نواز نے پروفیسروں کی سی سنجیدگی سے کہا "پینا تو ایک مقصد کا ذریعہ ہے اور مقصد یہ ہے کہ انسان زندگی کا جتنا رس نچوڑنا چاہے نچوڑ لے کیونکہ زندگی مختصر ہے۔ اِنسان فانی ہے۔ جوانی ایک اُڑتے ہوئے بادل کا سایہ ہے۔ اور خوشی کے لمحے ابابیلیں ہیں"

"ہائے نواز صاحب، کیا بات کہہ گئے آپ۔" نشیمن جوش میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے سانس لیتی ہوئی بولی۔ "آپ اِتنی دُور کیوں بیٹھے ہیں نواز جی؟"

"یہاں آجائیے۔" بیگم حمید نے نشیمن کے پہلو سے اُٹھ کر کہا۔

"نواز صاحب نے تو شاعروں کی کمی پوری کر دی۔" بیگم شفقت الٰہی نے داد دی۔

"آداب عرض کرتا ہوں۔" رب نواز ہاتھ میں گلاس لیے اُٹھا۔ وہ بے ڈھنگے قدم اٹھاتا اور ہونٹوں پر ایک بے ڈھنگی سی مسکراہٹ لیے نشیمن کے پاس آ بیٹھا اور پھر باہر ایک موٹر کے رُکنے کی آواز آئی۔

"خالد ہو گا۔" حمید بولا اور باہر لپکا۔ بیگم حمید بھی جلدی سے باہر چلی گئیں۔

"کیسی نبھ رہی ہے دونوں کی؟" بیگم نورالہدیٰ نے جیسے سب سے پوچھا "جانے کیسی کیسی باتیں سُننے میں آ رہی ہیں۔ پر مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"کیوں؟ کیوں یقین نہیں آتا؟" رب نواز بولا۔ "جن لوگوں نے محبت بھی کی ہے اور سوسائٹی کی عزت بھی کی ہے۔ انہیں تو فوراً یقین آجاتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ خالد کے متعلق جو باتیں اس کی شادی سے پہلے سُننے میں آتی رہیں اور اس کی شادی کے بعد سننے میں آ رہی ہیں وہ سب سچ ہیں۔ اور اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو دو باتوں میں ایک بات ضرور ہے یا آپ نے سوسائٹی کی عزت نہیں کی یا آپ نے محبت نہیں کی۔"

بیگم نورالہدیٰ کا رنگ فق ہو گیا اور وہ رونے کے قریب پہنچ گئیں مگر پھر شہید تڑپ کر بولا "خبردار رہیئے گا خواتین و حضرات۔ یہ چُغد ہیر پھیر سے ہمیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اس نے محبت کی ہے۔ حالانکہ میرا دعویٰ ہے کہ کسی عورت نے اس کے مُنہ پر جوتا بھی نہیں مارا۔"

"تمہارے مُنہ پر کتنی عورتوں نے کتنے جوتے مارے ہیں؟" رب نواز چہکا اور نشین کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا۔ بیگم نورالہدیٰ بھی گھنگھرو بجانے لگیں۔

"اس چُغد کو کیا معلوم کہ" شہید کو جیسے کوئی بات سُوجھ "چلئے۔ نواز یہی بتا دے کہ آنکھوں کا جو سفید حصّہ ہوتا ہے وہ جوان عورت کے معاملے میں ہلکا ہلکا نیلا رنگ کیوں اختیار کر لیتا ہے۔ مَیں اسے چیلنج کرتا ہوں۔ بتائے"

"یعنی مَیں یہ بتاؤں کہ سمندر کیوں نیلا ہوتا ہے؟" رب نواز فوراً بولا اور ساری محفل

کروٹ سی بدل کر رہ گئی۔ نشیمن تو تڑپ اُٹھی۔ اس نے اپنا لمبا ننگا بازو پھیلا کر رب نواز کے گلے میں سانپ کی طرح لپیٹ لیا اور سہما ہوا رب نواز اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

بیگم نورالہدیٰ کی آنکھ میں یکایک شاید ایک پلک گر گئی۔ قریب بیٹھے ہوئے شہید سے انہوں نے کہا: "ذرا دیکھئے تو میری آنکھ میں کیا ہے؟"

شہید نے بیگم نورالہدیٰ کی آنکھ میں جھانکا اور پھر بڑی متانت سے بولا: "آپ کی آنکھ میں سمندر ہے۔"

محفل چہک اٹھی اور بیگم نورالہدیٰ گھنگھرو بجانے لگیں۔

اِدھر سے خالد، اس کی دلہن ثریا اور ثریا کی چھوٹی بہن عطیہ اپنے میزبانوں کے ہمراہ اندر آ گئے۔ سب مرد اُٹھ کھڑے ہوئے مگر رب نواز نشیمن کے بازو میں جکڑا بیٹھا تھا اس لئے بیٹھا رہ گیا اور خالد بولا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کب سے پی رہے ہیں؟ یہ سوال مجھے ایک تو اس لئے پوچھنا پڑ رہا ہے کہ کہیں میرے حصے کی وہسکی کا صفایا تو نہیں ہو چکا؟ اور دوسرے اس لئے کہ آج مجھے نواز کے مزاج ناساز معلوم ہوتے ہیں اور نشیمن بی بی دکھائی دے رہی ہیں مگر معلوم نہیں ہو رہی ہیں۔"

"ارے ان کے ساتھ تو عطیہ بھی ہے!" بیگم نورالہدیٰ نے ایک بار پھر سے مسکرا کر شہید سے سرگوشی کی مگر شہید نے جواب میں اپنا کان کھجا لیا اور بیگم کی باچھ پھر سمٹ کر اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

"دیکھئے بھی خالد صاحب۔" نشیمن نے رب نواز پر سے بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے تازہ تازہ شادی کی ہے لیکن اس کے باوجود آپ کو مجھ پر ذاتی حملہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے آج تک ایک بھی ایسی ڈرنک پارٹی یاد نہیں ہے جس میں میں اپنے پاؤں سے چل کر اپنی کار تک نہ پہنچی ہوں۔ یہ وہسکی شروع کرنے سے بعد کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے مقابلے میں کیا حضور کو عرفان صاحب کے ہاں کی وہ پارٹی یاد ہے جو ابھی دس روز پہلے، آپ کی شادی سے بھی کوئی تین روز پہلے ہوئی تھی اور جس میں آپ نے ان کے دس ہزار کے ایرانی قالین کو اُگال دان بنا لیا تھا؟"

بیگم نورالہدیٰ نے اکٹھے بہت سے گھنگھرو چھنکا دیئے اور بیگم حمید نشیمن کو خاموش کرنے کے لیئے آگے بڑھیں مگر خالد نے اپنے تیور بدلے بغیر کہا "تو کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی بہت بُری بات ہے؟ وہ تو خیر گزری کہ بات وہیں متلی تک ختم ہو گئی ورنہ اس روز تو میں پی پی کر مر جانے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔"

ثریا نے سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹ کر خالد کو دیکھا اور عطیہ نشیمن کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی جو اپنے نئے پیگ میں دبے آواز سے سوڈا اُنڈلوا رہی تھی۔

"کیوں کیا بات تھی اس روز؟" بیگم نورالہدیٰ نے اپنی ایک باچھ کو پھیلا کر پوچھا۔ "خیریت تو تھی؟"

خالد بولا "جی ویسے تو بوجوہ درجہ بدرجہ خیریت ہی تھی لیکن بعض اوقات روز روز کی خیریت بھی تو بیزار کر دیتی ہے ——— کر دیتی ہے نا؟"

اس پر سوائے بیگم نورالہدیٰ اور چند دوسرے اصحاب کے سب ہنسنے لگے۔ یہ چند

دوسرے اصحاب وہ اصحاب تھے جو چند پیگ پینے کے بعد آدھے مرجاتے تھے - یا
بہت زیادہ رقیق القلب ہو جاتے تھے، اور دوسروں کی باتوں میں کسی ایسے اشارے کی تاک
میں رہتے تھے جس پہ وہ زار زار رو سکیں - ایس محمد عارف سیٹھ بھائی بھائی اور مسٹر رینلڈ مسیح
اسی نوعیت کے اصحاب سے تھے البتہ ہمارے دوست عرفان پر نیم غنودگی کا عالم طاری
ہو جاتا تھا - اور وہ کبھی کبھی جیسے نیند سے چونک کر اپنی زندگی کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا تھا۔

ہنسی رکی تو خالد بولا: "بھئی حمید دیر اس لئے ہوئی کہ ہم دونوں چلے آتے تو عطیہ اکیلی رہ
جاتی - آج کل ان کا سارا گھر پشاور گیا ہوا ہے - آدھا گھنٹہ عطیہ کو یہ سمجھانے میں گزرا کہ حمید
کے ہاں تکلف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر وہ برابر تکلف کرتی رہی - پوچھ لو اس سے۔"

"اب خدا کے لئے ہمیں شرمندہ تو نہ کیجئے۔" بیگم حمید شرما کر بولیں -

"شیم شیم" عرفان نے تپائی کو تھپتھپا کر کہا - وہ کسی زمانے میں اسمبلی کا رکن رہ چکا تھا۔

"اگر عطیہ نہ آتی تو ہماری لڑائی ہو جاتی۔" حمید بولا

"لڑائی ہی کے ڈر سے تو آ گئی ہوں۔" عطیہ ہنس کر بولی -

"لڑائی کا ذکر نہ کیجئے حمید بھائی" ثریا نے مسکرا کر کہا - "تیسری عالمی جنگ سر پر کھڑی
ہے - اللہ اللہ کیجئے۔"

"اللہ اللہ - اللہ اللہ - اللہ اللہ" عرفان ذکر کرنے لگا -

ثریا اور عطیہ خاص مہمانوں کے صوفے پر بیٹھیں اور رب نواز کے بالمقابل جا بیٹھیں -
خالد کے لئے بہت سی جگہیں خالی کر دی گئیں مگر وہ یہ کہتا ہوا خاص صوفے کے ایک سرے پ

ثریا کے پاس بیٹھ گیا کہ "حضرات شاید آپ نشے میں بھول رہے ہیں کہ دعوت میرے اعزاز میں دی جا رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عام مہمانوں کی طرح دو چار پیگ پر ٹرخا دیا جاؤں۔

میں تو اپنے حصے کی پوری بوتل پیوں گا اس لئے یہاں اپنی مسز کے پاس بیٹھوں گا۔"

سب ہنسے۔ پھر حمید نے وائٹ ہارس کی سچ مچ پوری بوتل اس کے سامنے رکھ دی۔ خالد نے اپنا دگنا پیگ بنایا اور دور سے آنے والے پیاسے مسافر کی طرح ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ ثریا کے گلاس میں شیری ڈالنے کے بعد حمید نے بوتل عطیہ کے گلاس پر جھکائی تو عطیہ نے گلاس پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر حمید کو دیکھنے لگی۔ حمید نے پوچھا "یہ شربتِ نیلوفر بھی چھوڑ دیا کیا؟" مگر عطیہ نے ثریا کی گود پر سے اپنا بازو گزار کر گلاس خالد کے سامنے بھیک کے پیالے کی طرح رکھ دیا۔ وہ اپنا دوسرا پیگ بناتے ہوئے رُک گیا اور بڑی وحشت سے عطیہ کو دیکھنے لگا۔ مگر عطیہ اپنی بہن کی گود میں آدھی لیٹی ہوئی مسکراتی رہی اور بولنے کے بجائے اپنا گلاس ہلاتی رہی۔ ثریا نے اسے ہٹانے کی بھی کوشش کی اور یہ کہہ کر ڈانٹا بھی کہ "پاگل ہوئی ہے کیا؟" مگر یکایک ساری محفل نے تالیاں بجا دیں۔ یہ تالیاں اس وقت تک بجتی رہیں جب تک دم بخود خالد نے عطیہ کو ایک پیگ تیار نہ کر دیا۔ عطیہ بڑے اطمینان سے وسکی سپ کرنے لگی اور ساری محفل نے اپنے جام بلند کر کے عطیہ کی مستقل مزاجی کی داد دی اور شراب نوشی کے معاملے میں اس کی استقامت کی دعا مانگی۔

خالد اور ثریا حیران بیٹھے سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہے۔ پھر یکایک خالد جیسے شعوری طور پر سنبھلا۔ دوسرا پیگ پیا۔ سگریٹ سلگایا اور جیسے ذہن کی دھول جھاڑنے کے لئے بولا

"ہاں تو رب نواز۔ تمہارے تیوروں سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم پانچ چھ پیگ چڑھا چکے ہو۔ اس لیے کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہو۔"

"جی ہاں۔" شہید بولا "قبلہ رب نواز صاحب محبت کے مسئلے پر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید اور مستفیض فرما رہے تھے۔"

"یہ تو بڑا نازک مسئلہ ہے نواز۔" خالد نے کہا

"یہ جو شہید ہے نا" رب نواز نے خالد کو بتایا "یہ از روئے نفسیات محبت کی دنیا کا یتیم ہے۔ اس لیے وہ صاف صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ بحث شادی کی عمر پر ہو رہی تھی لیکن اب اس نے کہا ہے کہ چلو محبت پر بحث کیے لیتے ہیں۔ اسی سے کہیے شروع کرے۔"

شہید بولا۔ "اپنے بائیں طرف سے شروع کرو۔"

رب نواز چونکا بھی اور مسکرایا بھی۔ "میرے بائیں طرف تو مس نشمین بیٹھی ہیں۔"

"میں کیا عرض کر دوں گی" نشمین بولی۔ "ان سے پوچھیے جنہوں نے شادیاں کر لی ہیں۔"

"محبت کرنے کے لیے شادی کرنا ضروری نہیں ہوتا۔" شہید نے رائے ظاہر کی۔ "نواز سے پوچھ لیجیے۔"

ہاں ہاں۔" نواز بولا۔ "میں شہید سے زندگی میں پہلی بار متفق ہو رہا ہوں۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان شادی کرنے کے لیے محبت کرے مگر شادی نہ کر سکے اور عمر بھر محبت ہی کرتا رہے۔ یوں بھی ہوتا ہے۔"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" عرفان نے بازو پھیلا کر مصرع پڑھا۔

شہید، رب نواز اور میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی صاحب محبت کے مسئلے پر کچھ بولیں مگر سب کتراتے اور ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے رہے اور اس دوران میں خالد نے چار اور عطیہ نے دو پیگ چڑھا لیے۔ عطیہ نے ثریا کی گود سے ہاتھ گزار کر خالد کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ بھی نکال لیا۔ حمید نے سگریٹ لائٹر جلایا اور تالیوں کے درمیان عطیہ لمبے لمبے کش لیتے، کھانستے اور ہنسنے لگی۔ یکایک ثریا نے عطیہ کی انگلیوں سے سگرٹ نوچ کر ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ مگر عطیہ اسی طرح کھانستی اور ہنستی رہی۔

اچانک نشمین بولی۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ محبت کے مسئلے پر تو خالد صاحب ہی بہتر رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ تازہ تازہ قصہ ہے کل شام ہی کو ہنی مون سے لوٹے ہیں۔ آپ بیتی کا معاملہ ہے۔ یا اگر آپ سب لوگ متفقہ طور پر قرار داد منظور کریں تو ثریا سے درخواست کی جائے کہ وہی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

"کیر یڈ۔ کیر یڈ" عرفان نے تائید کی ڈھیلی ڈھالی تالی بجائی۔

"جی مجھے تو بخشئے" ثریا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پھر خالد کے کندھے سے کندھا لگا کر بیٹھ گئی۔

"عطیہ تو خیر کیا بتائیں گی" نشمین مسکرائی۔

"عطیہ تو خیر ابھی بہت چھوٹی ہیں" بیگم نورالہدیٰ بھی مسکرائیں۔

مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے ہنسنے لگیں اور ہنستی چلی گئیں۔ پھر نشمین کو بھی

ہنسی چھوٹ گئی۔ دونوں ہنسی پر ضبط پانے کی کوشش ضرور کر رہی تھیں مگر ان کی ہنسی ضبط کے بند توڑ توڑ کر نکل رہی تھی۔ اس بے سبب ہنسی پر محمد عارف، جاتی بھائی اور رینالڈ مسیح تک چونک پڑے اور عرفان یوں گھبرایا گھبرایا سا دیکھنے لگا جیسے دونوں خواتین اسی پہ ہنس رہی تھیں۔ سب کو جیسے عطیہ کے چیخیں مار کر رو دینے کا انتظار تھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ دونوں کو بہت شوق ہے میری محبت کی کہانی سننے کا۔" عطیہ کے لہجے میں طنز تھا: "مگر آپ تو سننے سے پہلے ہی محظوظ ہو رہی ہیں۔"

بیگم نورالہدیٰ اور نشمین کی ہنسی ایک دم رک گئی اور کمرے کا ماحول سخت رقیق ہو گیا۔

"تو پھر سنائیے" نشمین نے ہمت کی۔

"شوق سے سنئے" عطیہ بولی: "اگر آپ ——"

"عطیہ بی بی، ہپ ہپ ہرا" عرفان نے گلاس والا ہاتھ اٹھا کر نعرہ مارا۔

عطیہ بولتی رہی: "اگر آپ سب ایمانداری کے ساتھ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی اپنی محبت کا حال سنانے کو تیار ہوں تو میں بھی حاضر ہوں" عطیہ نے بڑی متانت سے اتنے بہت سے لوگوں کو چیلنج کر دیا۔

"اور اگر کسی نے محبت کی ہی نہ ہو؟" نشمین نے پوچھا۔

"نان سنس" عرفان بڑبڑایا۔

عطیہ فوراً بولی: "اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تو اس کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ذرا زیادہ غور سے دیکھ لے۔ میں

مان ہی نہیں سکتی کہ کوئی شخص زندگی میں کم سے کم ایک بار بقائمی ہوش و حواس، محبت میں اپنے ہوش و حواس نہ گنوا بیٹھے۔"

"عطیہ کو ہماری ہنسی بُری لگی حالانکہ ہم سے کم میں تو اس پر نہیں ہنس رہی تھی۔" نشیمن نے کہا: "میں تو اس بات پر ہنس رہی تھی کہ جانے کیوں بعض لوگ ہنسنے پر آتے ہیں تو ان کی ہنسی رکتی ہی نہیں"۔

بیگم نور الہدیٰ بہت سنجیدہ ہو گئیں۔ پھر پرس میں سے آئینہ نکال کر ایک ننھے سے رومال سے اپنی پلکیں خشک کرنے لگیں۔

عطیہ نے نشیمن کی معذرت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ بولتی رہی: "محبت گناہ نہیں ہوتی۔ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ضرور ہوتی ہے۔ اور محفلوں میں کسی کی محبت کے بجائے کسی کی شادی کا اعلان زیادہ بھلا لگتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو دوسروں کی شخصیتوں کو بے لباس کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو معقولیت کا تقاضہ یہ ہے کہ خود پہل کیجئے ——————

—— دیکھئے آپ یہاں بیٹھی وہسکی بھی پی رہی ہیں اور غیر مردوں کے گلے میں باہیں بھی ڈال رہی ہیں۔ پھر اگر آپ کو اس میں کوئی جھجک نہیں تو یہ بتانے سے کیوں جھجک رہی ہیں۔ کہ آپ محبت کی بالکل نیچرل ارج کے ہاتھوں کہاں اور کیسے مجبور ہوئی تھیں"۔

جب تک عطیہ بولتی رہی، سب لوگ گم سم بیٹھے رہے نشیمن بھی سناٹے میں آگئی۔ پھر جب عطیہ بول چکی۔ تو سب کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی فرصت ملی۔ خاموشی کا لمحہ بہت مختصر تھا مگر بہت بھدا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ لمحہ ایک ٹھوس مرئی چیز بنکر

سب کے سینے میں گڑ گیا ہے۔

شہید نے ہمت کی شگفتہ سا لہجہ اختیار کر کے بولا "بسم اللہ رب نواز سے ہونی چاہیئے"۔ رب نواز دائیں بائیں دیکھنے لگا تو شہید بولا "نہیں بیٹا۔ آج تو بہت برے پھنسے۔ آج تو تمہیں اپنے فلسفے کا مرہم ہٹا کر اپنا زخم دکھانا ہوگا۔ آج تو میری جان کوئی نہ کوئی جھوٹ تراشنا ہی ہوگا۔ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر"۔

"ٹھہریئے حضرات، ٹھہریئے" بیگم حمید اُٹھ کھڑی ہوئیں "آپ لوگ ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ اس لیئے بحیثیت میزبان میرا فرض ہو جاتا ہے کہ ابتدا میری طرف سے ہو"۔

"مگر کیا سب لوگ اس اعتراف کے لیئے تیار بھی ہیں؟" خالد نے اعتراض کیا اور ثریا نے تائید میں یوں بے ساختہ سر ہلایا جیسے پہلی بار کسی نے اس کے دل کی بات کی ہے۔

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

نشیمن نے وسکی پی تو چند قطرے اس کی باچھوں سے بہہ کر اس کی ٹھوڑی پر جمع ہو گئے اور پھر گردن سے ہوتے ہوئے غائب ہو گئے۔

"میں تیار ہوں۔ میرا باپ تیار ہے۔ میرا دادا تیار ہے۔" عرفان یکایک کھڑا ہو گیا مگر پھر جھول کر صوفے پر گر گیا اور اسی گری ہوئی حالت میں مسکرانے لگا۔ اور ایک ہاتھ بلند کر کے یوں ہلانے لگا جیسے اس کی بات ابھی تک جاری ہے۔

خالد پھر بولا "سب لوگوں کے تیور بتا رہے ہیں۔ کہ سب تیار نہیں ہیں اس لیئے چلئے

باتوں کے لیے کوئی اور موضوع چُنیں۔"

"کھانا ہی کیوں نہ کھایا جائے۔" حمید نے تجویز پیش کی اور پھر کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر پکارا۔ "خانساماں۔ کھانا لگا دو۔"

خالد بولا۔ "مس نشمین ہی اس قصے کو ختم کرنے کا اعلان کریں اور نیا موضوع بھی تجویز کریں۔ مثلاً دنیا کا بدلتا ہوا موسم۔ کیوبا اور کانگو۔ خلا کا سفر۔ مریخ کی مخلوق۔"

"جی نہیں۔" عطیہ آگے کھسک کر صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ "نشمین نے بڑے طنز سے جو اشارہ کیا تھا اس کا مطلب میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں تو ان کی ہنسی کی زبان بھی سمجھ گئی تھی۔ میں مُصر ہوں کہ سب اپنی اپنی محبتوں کی کہانی سنائیں اور اگر کوئی جھوٹ بولے تو اسے ٹوک دیا جائے۔"

"ہوش میں تو ہو عطیہ؟" خالد نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

"پاگل ہے۔" ثریا بولی اور عطیہ کا تیسرا پیگ اس کے سامنے سے اُٹھا کر تپائی کے نیچے رکھ دیا۔

عطیہ نے جیسے اپنی بہن اور بہنوئی کی بات سنی ہی نہیں۔ بولی "ہاں تو نشمین صاحبہ۔ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی آپ بیتی شروع کیجیے۔ مگر یاد رکھئے کہ آپ جھوٹی قسم کھائیں گی تو آپ کی سب سے پیاری چیز مر جائے گی۔"

"ہائے اللہ یہ لڑکیوں نے کیسی فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔" بیگم شفقت الٰہی نے پہلی بار بالواسطہ طور پر اپنی بیٹی کے حق میں کچھ کہا۔

ربّ نواز ہاتھ میں بوتل لیے اٹھا۔ توازن قائم رکھنے کے لیے ٹانگیں پھیلا دیں اور بولا: "کیا پینے اور بولنے کے دونوں کام اکٹھے نہیں ہو سکتے؟ یہ بہت غلط بات ہے کہ باتوں باتوں میں پینے کا دور رُک گیا ہے۔"

پینے میں صرف نشین نے ربّ نواز کا ساتھ دیا۔

ربّ نواز نے آخری گھونٹ لیکر کہا: "خواتین و حضرات۔ سب سے پہلے مجھے فارغ ہو لینے دیجیے' ورنہ جب تک آپ لوگ بولیں گے' یہ اعتراف میرے سینے پہ ایک بوجھ بنا رہے گا۔"

سب ربّ نواز کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولا: "میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے محبت کی ہے۔ اور آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے کس سے محبت کی ہے میں نے بوتل سے محبت کی ہے۔"

"بڑا بوگس آدمی ہے۔ مگر سچ بولا ہے۔" شہید نے کہا اور لوگوں نے چند ہلکے پھلکے قہقہے لگائے۔ ربّ نواز دائیں بائیں آگے پیچھے جھومتا ہوا بیٹھ گیا اور مسکرا کر نشین کو دیکھنے لگا۔

پھر بیگم حمید اٹھیں: "میں حمید کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے حمید سے محبت کی اور اسی سے شادی کر لی۔"

"کھیل ختم پیسہ ہضم۔" شہید بولا۔

"آپ نے تو حمید کی زبان ہی کاٹ لی۔" میں نے کہا۔

سب ہنسنے لگے مگر سب کی ہنسی کھوکھلی اور مرجھائی ہوئی تھی

شہید نے اپنی ایک درجن محبتوں کے واقعات خوب کھل کر سنائے اس نے بتایا کہ "بھئی ہم یاروں نے تو مل کر محبت کا باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہے۔ کہ ایک لڑکی سے ایک دوست دوپہر تک محبت کرے تو اسی لڑکی سے دوسرے دوست کی محبت دوپہر سے شام تک ہو۔ اور تیسرے کی شام سے سینما کے آخری شو تک۔ اور یہ ٹائم ٹیبل اتنا مکمل ہے کہ میری زندگی کی پٹڑی پہ گاڑیوں کے تصادم کا ایک بھی حادثہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ متعلقہ لڑکیوں نے بھی یہی پروگرام بنا رکھا ہوتا ہے" آخر میں اس نے کہا "بس ایک محبت ذرا سی سیریس ہو گئی۔ میں معافی چاہتا ہوں مگر میں نے اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھائی ہے اس لئے یہ بتانا ہی پڑے گا کہ اسی محفل میں ایک ــــــ"

حمید تقریباً چلا اٹھا "نہیں شہید یہ غلط ہے۔ کلچرڈ لوگ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ بس اتنا ہی کافی ہے"

یتا ایٹ بیگم نورالہدیٰ نے ٹھنڈا سادہ پانی مانگا تو نواز بولا "سادہ پانی؟ اس محفل میں؟ آپ تو شیری پی رہی تھیں؟"

"مجھے پیاس لگی ہے" بیگم نورالہدیٰ کی آواز بدلی ہوئی تھی "سادہ پانی منگا دیجئے"

عرفان کی آواز آئی "سادہ پانی۔ ٹیپ واٹر۔ ایکوا پیورا"

بیگم شفقت الٰہی تک نے یہ اعتراف کر لیا کہ اُنہوں نے شادی سے پہلے نشمین کے تایا سے محبت کی مگر ان کی شادی نشمین کے ڈیڈی سے ہو گئی اس لیئے ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب وہ مر چکے ہیں لیکن اگر آج نشمین کے تایا زندہ ہوتے تو ان کی محبت میں تازگی آ جاتی مگر قسمت

لے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

میں نے اپنی محبت کا قصہ سُنایا تو سب بیحد محظوظ ہوئے اور محفل میں شگفتگی کی ا
لہر دوڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے ایک ہی محبت کی تھی اور میری محبت کے یہی کھنڈر اب
میری پناہ گاہیں تھے۔" ایک ہی محبت" کا یہ واقعہ سب کے لئے ایک لطیفہ ثابت ہوا
" محبت کا افلاطون" اور "مجنون سنہ ۱۹۶۰ء" کی قسم کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔

" ایک ہی محبت کی بات تو ایسی ہی ہے جیسے انسان زندگی میں صرف ایک بار
کھانے اور عُمر بھر ڈکاریں لیتا رہے۔" شہید بولا اور سب لوگ خوب ہنسے۔

اب بیگم نورالہدیٰ کی باری تھی وہ سادہ پانی ایک ایک گھونٹ پی رہی تھیں۔ ر
محفل ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے گلاس تپائی پر رکھ دیا اور بُت بن کر ا
کیں نشستیں نے ایک بار انہیں بُلایا تو جواب میں ان کے ہونٹ ہلے مگر کانپنے لگے۔ پ
رونے لگیں۔ خاصی بلند آواز سے رونے لگیں۔ مرد گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے مگر ان میں
بیشتر لڑکھڑا کر صوفوں پر گر پڑے۔ شہید مسکرانے لگا۔ بیگم شفقت الٰہی اور نشستیں تو ہنہ
مگر ثریا اور عطیہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ بیگم حمید نے لپک کر بیگم نورالہدیٰ کو اپنے بازو
میں لے لیا۔ پھر عطیہ بولی۔" کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ بیگم صاحبہ کو اعتراف سے معاف کر دیا جا
یہ تجویز آنکھوں ہی آنکھوں میں منظور کر لی گئی۔

" آپ لوگوں نے سب سے پیاری چیز کی قسم نہ دی ہوتی تو میں ضرور بتا دیتی۔" بیگم نورا
نے بچوں کی طرح سسکتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر باتھ رُوم میں چلی گئیں۔ بیگم حمید ان کے پیچھے دو

ان کے جانے کے بعد چند لوگ ہنسے۔

شہید نے چپکے احتجاج کیا: "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ذرا سا رو دینے سے خلاصی ہو جاتی ہے تو مجھے اپنے معاشقوں کی فہرست مرتب کرنے کی کونسی ضرورت مارے جا رہی تھی۔"

وہسکی اور شیری کا ایک اور دَور چلا۔ عطیہ نے تپائی کے نیچے سے اپنا گلاس اُٹھا لیا اور ثریا بے بسی سے دیکھتی رہی۔ بیگم نورالہدیٰ مُنہ دھو کر اور میک اپ درست کر کے بیگم حمید کے ساتھ واپس آ گئیں تو رب نواز صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بولا: "اب مس نشیمن کی باری ہے۔"

"نشیمن اچھا نام ہے" عرفان آنکھیں بند کیے بولا۔ "عرفان بھی اچھا نام ہے۔ تمہارا نام بھی اچھا نام ہے۔ ہمارا بھی اچھا نام ہے۔" پھر وہ گانے لگا۔ "نام منظور ہے تو پُل بنا، چاہ بنا، مسجد بنا، تالاب بنا۔"

نشیمن کی بڑی بڑی، باہر اُبلی پڑتی ہوئی آنکھوں کی پُتلیاں اُوپر پپوٹوں میں آدھی چھُپ گئی تھیں۔ اس کا رنگ انگارہ ہو رہا تھا۔ ناک کے بانسے، نچلے ہونٹ کے خم اور گردن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے آدھا بھرا ہوا گلاس یوں تھام رکھا تھا جیسے وہسکی کو ایک پتلی دھار میں گرانے کی سوچ رہی ہے۔ وہ اُٹھی۔ ذرا جھولی۔ پھر بولی۔

"جی ہاں۔ مَیں نے محبت کی ہے۔ عطیہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم سب نے محبت کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ مَیں ایک سے محبت کر رہی ہوتی ہوں کہ اس دوران مجھے دوسرے سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ پہلا مجھ سے بے وفائی کر جاتا ہے"

اور میں اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے تیسرے آدمی سے محبت کرنے لگتی ہوں مگر پھر کہیں سے چوتھا آجاتا ہے۔ اپنی اٹھائیس برس کی عمر میں ——— "

" اٹھائیس برس تو"، رب نواز بے ساختہ چیخا" ابھی ابھی تو آپ کی می ———"۔

" جی ہاں" نشیمن نے رب نواز کی طرف دیکھے بغیر کہا۔" اپنی اٹھائیس برس کی عمر میں اتنی محبتیں کی ہیں میں نے۔ کہ شمار کرنے بیٹھوں گی تو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہو جائیگی قصہ کوتاہ یہ کہ میں محبت کرتے کرتے بور ہو چکی ہوں اب میں نفرت کرنا چاہتی ہوں" اس نے رُک رُک کر ایک گھونٹ بھرا۔

" نفرت کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے"۔ رب نواز بولا" کہیں یہ نہ ہو کہ آپ چلی تو ہوں نفرت کرنے اور واپس آئیں تو آپ کو محبت ہو چکی ہو۔ دوستوفسکی کے ایک ناول میں ——— "

" آپ کیوں زیادہ فکر کرتے ہیں"؛ نشیمن نے رب نواز کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اطمینان رکھئیے کہ آپ سے میں نہ تو محبت کرتی ہوں نہ نفرت کرتی ہوں۔ نفرت بھی کسی سے کی جاتی ہے جس کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ وہ آخری آدمی جس سے میں نے محبت کی ہے میری نفرت کا سب سے زیادہ مستحق ہے"۔

اب نشیمن نے ان لوگوں کے نام، عہدے، سماجی مرتبے، پتے بلکہ ان کے بچوں کی تعداد تک بتا دی جن سے اس نے محبت کی تھی۔ آخر میں اس نے کہا" میں آخری آدمی کا نام نہیں لوں گی اور امید ہے عطیہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ دراصل اس آخری محبت نے میرا

بیلنس ذرا سا بگاڑ دیا ہے اور میں وہسکی کو بھی ہضم کر لیتی ہوں میرا ارادہ تھا کہ اس آخری آدمی سے محبت نبا ہوں گی یعنی شادی کروں گی، مگر اس دوران میں ہماری ممی کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔"

"بکومت نشیمن" بیگم شفقت الٰہی چیخ اٹھیں۔

"کھانا لگا دیا صاحب" خانساماں کی آواز آئی مگر اس کی طرف بیگم حمید تک متوجہ نہ ہوئیں۔

نشیمن اپنی ماں کی طرف دیکھے بغیر بولتی رہی "میں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ابھی تک پرانے قبائلی لوگوں کی طرح اپنی ماں کی عزت کرتی ہوں اس لئے میں نے اپنی آخری محبت کی قربانی دے ڈالی ہے اور ممی کی عنقریب شادی ہونے والی ہے"۔

بیگم شفقت الٰہی تڑپ کر کھڑی ہوئیں تو تپائی الٹ گئی اور بوتلیں اور گلاس ایک دوسرے سے بجتے ہوئے قالین پر لڑھک گئے۔ "بے شرم"۔ وہ کڑکیں۔

"نان سنس" عرفان نشے میں بکا۔

نشیمن وہسکی پینے لگی اور اس کی امی نے دھب سے بیٹھ کر شیری کا ایک گلاس جیسے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اپنے اندر انڈیل لیا۔

"خالد صاحب" نشیمن گلاس خالی کر کے پکاری۔

"جی" خالد یوں بولا جیسے اسے پکارے جانے کی توقع نہ تھی۔

"بسم اللہ" نشیمن بولی۔

"میرا قصہ تو مختصر سا ہے" خالد نے پہلو بدل کر وہسکی کا گلاس اٹھا لیا اور اسے انڈیلا

میں گھمانے لگا۔

"اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر بتایئے۔" نشیمن نے مشورہ دیا۔

"جی عرض کرتا ہوں" خالد نے ذرا سا ناگواری سے کہا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر مسکرایا اور بولا "میری محبت کا نتیجہ تو آپ کے سامنے ہے۔ میں تو مہنی مون بھی منا چکا ہوں۔"

اس نے ثریا کی طرف دیکھا اور وہ ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے لگی۔

"یہی بات ہے؟" نشیمن نے پوچھا۔

"تو اور کیا بات ہے؟" خالد بولا "میری شادی میں تو یہ سب حضرات شریک تھے۔ ان سے پوچھ لیجئے۔ اخباروں میں ہم دونوں کی تصویر بھی چھپی تھی۔"

"یعنی آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائیں گے؟" نشیمن بولی۔

"اس سے زیادہ کا مطلب کیا ہوا؟" خالد نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے" اچانک عطیہ بولنے لگی "کہ کیا آپ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر بس اتنا ہی بتائیں گے؟"

خالد اور ثریا نے عطیہ کو ایک ساتھ دیکھا۔

نشیمن بولی "اب فرمایئے"

"آپ تو حد کرتی ہیں" خالد ہنسنے لگا۔

عطیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالد کو دیکھنے لگی۔

"اور ثریا صاحبہ ——— آپ؟" نشیمن نے پوچھا۔

"جی میں تو پہلے سے عرض کر چکی ہوں کہ مجھے بخشئے"۔ ثریا بولی۔

"ہاں ہاں" عرفان بولا "ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے واقعی کہہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔"

"اور عطیہ۔ آپ؟" نشیمن بولی

"کھانا لگا دیا صاحب" خانساماں کی آواز آئی۔

"آپ بھی کیا یہی بہانہ کریں گی؟" نشیمن نے پوچھا

"جی نہیں" عطیہ بولی۔ اس کا سنہرا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی انگلیوں میں کپکپی تھی "میں عرض کرتی ہوں۔ میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی خالد بھائی کی طرح"۔

ثریا نے یوں تیزی سے پلٹ کر عطیہ کو دیکھا جیسے اسے مار ڈالے گی۔ پھر اس نے خالد کی طرف دیکھا اور خالد عطیہ کو دیکھنے لگا۔

"تو کیا آپ نے محبت کی ہے؟" نشیمن وکیلوں کے سے لہجے میں بولی۔

"جی ہاں" عطیہ جیسے عدالت میں کھڑی تھی۔

"کس سے؟" نشیمن نے پوچھا۔

یکایک حمید بول اٹھا "دیکھئے مس نشیمن۔ طے پا چکا ہے کہ اس قسم کے پرسنل سوال کا جواب کوئی دینا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا"۔

"خالد بھائی سے" عطیہ بولی "میں نے خالد بھائی سے محبت کی ہے۔ پوچھ لیجئے آپ"

ساری محفل کے سینے پر جیسے کسی نے گھونسا دے مارا۔

"بکومت عطیہ" ثریا چیخ اٹھی۔" شرم نہیں آتی کمینی کو کہ ———"

خالد نے ثریا کے منہ پر بڑی سختی سے ہاتھ رکھ دیا اور بولا: "یہ کیا بک بک ہے ثریا؟"

"خالد بھائی اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ بول گئے۔"

عطیہ سحر زدوں کی طرح بول رہی تھی۔" وہ میری قسم کھا کر جھوٹ بول گئے مگر میں انکی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ جگ جگ جئیں۔ میں ان کی جھوٹی قسم کیوں کھاؤں؟"

"پوائنٹ آف آرڈر۔ پوائنٹ آف آرڈر" عرفان پکارا۔

محمد عارف، بھائی بھائی اور رینلڈ مسیح اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

"خالد بھائی" عطیہ بولتی رہی۔" ثریا باجی سے شادی کرنے کے بعد آپ نے مجھ سے یہ دوسری بے وفائی کی"

"میں تمہارا منہ نوچ لوں گی عطیہ" ثریا، عطیہ پر جھپٹی مگر خالد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

عطیہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر آئے اور تیزی سے اسکی گود میں گر گئے۔

بیگم نورالہدیٰ اونچی اونچی رونے لگیں۔

"میں بارہ برس کی تھی جب میں نے خالد بھائی کو چاہا" عطیہ کی آواز بھرائی اور

گھٹی ہوئی تھی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ عمر کی کوئی قید نہیں۔" رب نواز خوش ہو کر بولا۔

"بکو مت۔" شہید نے اسے ڈانٹ دیا۔

"اب میں بیس برس کی ہوں۔" عطیہ کہہ رہی تھی۔ "میں آٹھ برس سے محبت کر رہی ہوں مگر باجی نے آٹھ دن کی محبت کے بعد انہیں مجھ سے جیت لیا۔"

"عطیہ" ثریا نے عطیہ کو جیسے گالی دی۔

بیگم نورالہدیٰ لپک کر باتھ روم میں چلی گئیں۔

عطیہ بولے جا رہی تھی۔ "مجھے ابا اور امی نے بتایا کہ شادی پہلے بڑی بیٹیوں کی ہوتی ہے اور بڑوں کو محبت کرنے کا بڑا حق حاصل ہوتا ہے۔ مجھے خالد بھائی نے بتایا کہ تمہیں حاصل نہ کر سکنے کے باوجود تمہارے قریب رہنے کا یہی تو ایک بہانہ باقی رہ گیا ہے کہ میں تمہاری باجی سے شادی کر لوں۔"

اچانک ثریا نے خالد کی گرفت سے چھٹ کر عطیہ کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ دے مارا ساری محفل ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تو الٹتی ہوئی تپائیوں پر سے لڑھک کر بوتلیں اور گلاس چٹاخ پٹاخ ہو کر ٹوٹ گئے۔ خالد نے آگے بڑھ کر ثریا کا دوبارہ اٹھتا ہوا ہاتھ بڑی سختی سے پکڑا اور اسے ایک جھٹکے سے یوں ہٹایا کہ وہ نشین کے صوفے کے بازو پہ جا گری۔

"سپورٹسمین سپرٹ کا تو تم میں ایک ذرہ تک نہیں۔" خالد نے ملامت کی۔

اس دوران میں نشین نے عطیہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے

سر پہ گال رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ بیگم حمید اپنے سینے پر ہاتھ باندھے، عطیہ کے پیچھے گم سم کھڑی تھیں اور روتی ہوئی بیگم نورالہدیٰ باتھ روم کے دروازے میں سے جھانک رہی تھیں۔ بیگم شفقت الٰہی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

رب نواز نے سگریٹ کا جلتا ہوا حصہ ہونٹوں میں رکھ لیا۔ اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ نوچ کر بیٹھ گیا۔

خالد عطیہ کے قریب گیا تو نیشن اُٹھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ ایک لمحے کے بعد خالد عطیہ کے پاس بیٹھ گیا مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ثریا کا رنگ مٹی ہو رہا تھا۔ وہ جس صوفے کے بازو پر گری تھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ اور خالد کو گھورے جا رہی تھی۔ یکایک خالد ایک دم عطیہ کے پاس بیٹھ گیا اور اسے ایک بازو میں سمیٹ کر اپنے پہلو سے دباتے ہوئے بولا: "رو مت عطیہ۔ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں تم سے اگلی پچھلی ساری غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں"۔

ثریا لپک کر آئی اور خالد کے سر پہ چیخی: "تم میری ہتک کر رہے ہو خالد۔ اور میں تم سے اس ہتک کا بدلہ لوں گی"۔

خالد بولا: "پہلے میں تم سے عطیہ کی ہتک کا بدلہ تو لے لوں"۔

ساری محفل نے ثریا کی چیخ کے انتظار میں سانس روک لی۔

"کیا ہوا؟ طلاق ہو گئی؟" بیگم نورالہدیٰ باتھ روم سے حواس باختہ باہر آ گئیں۔

"نان سنس" عرفان بڑبڑایا۔

یکایک خانساماں کی آواز آئی: "کھانا لگا دیا صاحب"

(۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

پہاڑوں کی برف

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی: "بے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے"۔

مَیں نے قلم کو واپس قلمدان میں رکھ دیا۔ اگر اس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اسے یقیناً پٹخ دیتا۔

صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا ایک فقرہ سوجھا تھا، مگر بھکارن کی آواز نے اِسے یُوں نوچ لیا تھا جیسے پھُونک مارنے سے چراغ کی لَو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا! میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل میں تھا۔ بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی۔ ورنہ میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو، اس کی طرف سے، دفع ہو جانے کا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن بھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چل دی تھی۔

یکایک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈمڈ صورت میں میرے ذہن میں اُبھرے۔

ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی ۔۔۔۔۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا ۔۔۔۔۔ مگر نہیں ۔ میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا ۔ لالۂ صحرائی کا رنگ ، یا شاید شفق شام کا رنگ ، یا ممکن ہے ۔۔۔۔۔

" ہے بی بی ۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے ۔ تیرا بچہ جیوے "۔

تو وہ کم بخت ابھی تک وہیں نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی !

دیا سلائی دھوئیں کی ایک منحنی لکیر چھوڑ کر بجھ گئی اور میں پکارا " بی بیاں گھر میں نہیں ہیں "۔

" بی بی نہیں تو بابو ، تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے ۔ ہے سخی تیرا بچہ جیوے "۔

میں خاموش رہا ۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں ۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی ہے ، اور مجھے اس دلیل کا کبھی کوئی جواب نہیں سوجھ سکا ۔

کچھ دیر بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا ۔۔۔۔۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح ۔۔۔۔۔

" دے دے ناسخی ۔ تو ہی دے دے نا "۔ اب کے بھکارن کی آواز جیسے عین میرے سر پر گونجی ۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا ۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا ۔ اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا ۔ چمکتا ہوا سفید ۔ مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہوا ۔ یہ شاید مس بی . گوں کا رنگ تھا ۔ مگر اس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی ۔ یہ ناخن میل سے اٹے ہوئے تھے اور کٹے پھٹے اور دندانے دار تھے ۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیاں

میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی ——— تو یہ ایسی بے فکری بھکارن ہے کہ بھیک ملنے تک کا وقت گذارنے کے لیے کواڑ پر ڈھولک بجانے لگی ہے! ——— کیا ایسوں کو بھیک دینا جائز ہے؟ ——— مگر کیا اتنے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا جائز ہے؟ ——— لیکن کیا ہر مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟ ———

میں نے تکیے کے نیچے سے ایک آنہ اُٹھایا اور بولا "یہ لے"

وہ بولی "اِدھر پھینک دے بابو"

رہا نہ مجھے اس بھکارن کے طرزِ عمل پر غصہ سا کیوں آنے لگا تھا۔ میں نے آنہ پھینکنے کی بجائے پٹخ دیا۔ یہ آنہ کواڑ پر جا کر کمرے کے اندر، دہلیز سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر رکا۔ بھکارن نے سیڑھی پر سے ہی جھک کر ہاتھ بڑھایا۔ یوں اس کے چہرے کا ایک رُخ بھی میرے سامنے آ گیا۔ مگر یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے تیسرے حصے میں ہوا۔ یوں لگا جیسے بجلی سی میرے کمرے پر کوند کر اُڑ گئی ہے۔ مجھے دروازے تک پہنچنے میں کُل دو سیکنڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں پلٹ کر تیزی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر جا رہی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ میلے سُرخ رنگ کی شلوار پر اسی سیاہ رنگ کی گھیرے دار قمیص پہن رکھی تھی، اور اس کے سَر اور پیٹھ پر شلوار ہی کے رنگ کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

بھکارن کے چہرے کی ایک رُخی جھلک نے مجھے اپنے افسانے سے ہٹا کر رُومانی صنمیات کی دُنیا میں لا ڈالا۔ وینس اور سائیکی اور افروڈائیٹ ——— ہر اساطیری خاتون کے ساتھ یہ چہرہ مماثل ہو جاتا تھا۔ یہ چہرہ، جو صرف ایک رُخ سے میرے سامنے آیا تھا، اور جتنی دیر میں سامنے

کا لفظ بو دیا جا سکتا ہے، غائب ہو گیا تھا۔ اس اُڑتے ہوئے ثانیے میں میرے ذہن نے اس چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں۔ پتلی اور بے حد سیاہ بھویں۔ موٹی اور بے حد سیاہ آنکھیں لمبی اور بے حد سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف اُبھار۔ بے حد سُرخ ہونٹ، بے حد نکیلی ٹھوڑی، بے حد سفید گال، بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ اس ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے! لاحول ولاقوۃ۔ میں قلم اُٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لو پہلے کسی کو ملی ہے جو مجھے ملتی! ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا پہلا فقرہ نہ لکھ سکا تو ایک ہی افسانہ کیا، میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا۔ جیسے یہی ایک کھونٹی تھی جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا پشتارا ٹانگنا تھا، اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردی خریدنے والے نے گلی میں، ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کراری آواز میں ادا کیا اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ ردی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک بار اس گلی میں سے گزرتا تھا اور میرے مکان کے سامنے ضرور رُکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں، اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردی بہت عام مل جاتی ہے۔ میں اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی بار سُنی تھی۔ اور میرے افسانے کی روانی

میں اس نے بھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی مگر آج مجھے ردّی والے پر اتنا غصّہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اُٹھا۔ کھڑکی میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا۔ مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکّڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ تعفّن ٹھوس بھی ہو سکتا ہے ــــــ بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

مَیں جیسے اِس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا نہ جانے مَیں نے کتنے سگریٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے۔ پھر جب مَیں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سُرخ بتّی دیکھ کر رُکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟

"کیوں بھئی، مَیں کہاں جا رہا ہوں؟" مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

مَیں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ مَیں ذرا ذرا سی بات پر رو بھی دیا ہوں اور بڑے بڑے دُکھوں کو پی بھی گیا ہوں۔ مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بدبُودار اور اُجڈ بھکارن کی صرف ایک نیم رُخی جھلک نے میرے خُون کو کھولاؤ کے نقطے پر پہنچا دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے اگر واپس نہ آ سکوں تو شہر کے بچّے مجھ پر پتھراؤ کریں۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنُون ضرور ہوتا ہے۔ مگر میرا یہی جنُون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں۔ اور جب میرے احباب شراب پی رہے ہوتے ہیں تو مَیں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے رن پڑ رہے ہوں گے۔ مجھے جنون کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیے۔

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصّہ اپنے لئے ہوئے افسانے کا پہلا فقرہ سوچنے میں کاٹا مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی۔ وہیں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر آنہ اٹھایا اور کشت خیال میں یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں اُمڈ پڑیں۔

میں صبح کریوں بروقت اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آبیٹھا جیسے سورج کے نکلتے ہی دوپہر ہوگئی ہے اور بھکارن اب آتی ہی ہوگی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی میں کہتا تھا کہ دیکھو تو۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں، مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں۔ تم جھوٹے ہو۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو۔ اُس وقت تو میں نے اُلٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ مگر جب دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی: "ہے سخی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے۔"

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟

عجیب بات ہے کہ نہ تو میں پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور نہ میں نے قلم کو قلمدان میں رکھا۔ میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا: "ارے تو آج پھر آگئی ہے۔"

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت سُریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے کے دروازے پر سے بولی۔ "بابو تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکایک میں ڈرا کہ کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے۔ کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی۔ بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آ کر مانگنی چاہیئے۔ طوائفوں تک نے اپنے لیئے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ بھکارنوں کو کم سے کم بھیک مانگنے کا تو سلیقہ آنا چاہیئے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لیئے، یا گذشتہ آٹھ پہر کی بھڑکتی آگ کو بجھانے کے لیئے۔ یا یونہی بے ارادہ میرے منہ سے نکلا "لے۔ لے جا"

"لا" وہ بولی" اللہ تجھے بہت دیوے سخی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے سخی"

ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آگئی۔ میں اپنے حکم کی اتنی بھرپور تعمیل کے لیئے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کود جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر بھی اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیلف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ایک لمحے میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ کر پھینکنے میں آسانی ہو۔ مگر یکایک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا "حیران ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ ہرنی ہے"

وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔

میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو بچوں کی طرح اچھالتی اور جھپٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

عورت فطرت کی نہایت خوبصورت تخلیق ہے۔ مگر حسنِ تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نوشگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لئے ہمیں آسمانوں سے اترا ہوا سازینہ معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں۔ میں نے خوبصورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اس قرینے سے دیکھا ہے۔ حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجئے تو پھر آپ کسی اور طرف ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔ مگر جب کوئی حسن زبردستی پر اتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو حسن سے نفرت کرنے لگو اور بھیڑیئے کی طرح مار مار کر کھاتے ہوئے مر جاؤ۔ یا پھر دنیا کے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گزار دو کہ وہ فقط

ایک کام کرتا ہے۔ وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حسن کے لئے اپنا آغوش ہر لمحہ کھولے رکھتا ہے۔ کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں۔ مگر پھر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ لے جاتی ہے۔ اِس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس یک طرفہ کاروبار میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کہ حسن کی یہ موج مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لئے جا رہی ہے، مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آئی۔ مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر بھی ہنسی آجاتی ہے کہ اس کی ناک ننھی سی تھی۔ اِتنی بڑی ملکہ اِتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوگی۔ اور میں تو سپاڈیا اور رڑاسے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلین کی جوانی ڈھل گئی ہوگی تو اسے دیکھ کر طرفین اپنی اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے۔ ہنستے ہوئے میں نے قلم اٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا، آخری فقرہ بھی لکھ کر اٹھوں گا۔

"اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا ——— "اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا، جن پر ——— "اس کا رنگ پہاڑوں کی اس برف کی طرح صاف تھا جو ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ ———"

اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں۔

ایک موج آئی اور ساحل کو اپنی یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی۔

اِتنی گلابی، اِس قدر گلابی، اِس حد تک گلابی ہتھیلی پر صرف ایک آنہ چمکا اور میں نے

اپنے آپ کو گالی دے دی ——— کمینہ، بڑا حسن کار بنتا ہے۔ فطرت کے اس شہ کار کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت صرف ایک آنہ ہے؟ تف ہے تجھ پر اور تیری حسن کاری پر ——— !

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے ——— ان دنوں تو ایک آنے میں ایک چپاتی بھی نہیں آتی!

مگر سارے لاہور میں صرف میں ہی تو نہیں ہوں جس سے اس نے ایک آنہ لیا ہوگا۔ نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؛ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؛ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا ——— اچھا تو ذہن میں ہراجیت یوں پیدا ہوتی ہے!

کل رات میری کشت خیال میں صرف یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں امڈ رہی تھیں مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، ادھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا۔ پھر دھواں سا چھا جاتا۔ پھر پتھر سے برستے۔ پھر ایسی آوازیں سی آتیں جیسے کوئی شیشے کی کرچیاں پیس رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا۔ کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی۔ اوپر ہی کی منزل میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک

پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آکر کہا کہ پڑوسی چند منٹ کے لیے اخبار مانگ رہا ہے، تو مَیں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر اچھل کر مجھے کمرے سے باہر دے مارا اور میں سیڑھیوں پر سے اِتنی تیزی سے اُترا کہ بچّے بھی یُوں نہیں اُترتے ہوں گے۔ اپنا کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ دو بچّے سگرٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے اور گلی میں سے ایک بڑھیا گذر رہی تھی جو ہَوا سے بھرے ہُوئے بُرقعے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

مَیں پھر اوپر کے کمرے کی طرف لپکا اور مُلازم سے پوچھا: "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟"

وہ بولا۔ "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، کہ کوئی آتا تو میں نہ بتاتا۔"

مزید کریدنے کے لیے مجھے کوئی دُوسرا قرینے کا سوال نہ سُوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا: "بس صُبح صُبح ایک سبزی والا آیا تھا، یا اخبار والا، یا پھر ابھی ابھی وہ منگتی آئی تھی"—— مجھے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر وہ بولا "کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب۔ کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟"

مَیں جواب دیئے بغیر پلٹ آیا۔ تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجُود کوئی نہیں آیا تھا!

کیا فرشتوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دِن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں!

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اُترتا ہُوا میں گلی میں آ گیا۔ پھر دوسری گلی میں سے ہوتا

ہوا سڑک پر آیا اور دُور دُور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہگیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید وہ کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں سے کوئی کم سڑی ہوئی چیز چُن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کہ آج اس کی لگی بندھی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی اندر چلتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آ جائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے۔

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگرٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا اور میرے ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی، ردی والے کے ہاتھ اپنی اولاد کی پرانی کلبیاں بیچ رہی تھی۔

اور وہ میرے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی ——— تو میری خیرات اس کے لیے اتنی اہم ہے؟ ——— وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔ اس کے پاؤں اتنے میلے تھے جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے۔ البتہ آج اس کے ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے!

"آج تو تمہارے ناخن کٹے ہوئے ہیں۔" میں نے یوں فاتحانہ انداز میں کہا جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لیے جیسے وہ کہیں سے چرا لائی ہے اور اب پکڑی گئی ہے۔ پھر چینی کی پیالی سے چینی کی پیالی چھو گئی اور میں اُوپر لپکا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اسے بلانا چاہا مگر پھر رُک گیا جیسے میرے مُنہ سے ایک بھی لفظ نکلا تو سارے شہر میں گونج جائے گا۔ پھر میں نے اشارتاً اسے اُوپر آنے کو کہا اور وہ ادھر آنے لگی۔ مگر مجھے دروازے میں کھڑا دیکھا تو وہ دو سیڑھیاں چھوڑ کر رُک گئی۔ اس نے بھویں اُٹھا کر اُوپر میری طرف دیکھا اور میں یوں ایک طرف ہٹ گیا جیسے نہ ہٹا تو کہیں نیچے ڈوب جاؤں گا۔

میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اٹھنی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی

اس نے ہاتھ پھیلایا مگر اٹھنی دیکھ کر کھینچ لیا "نہیں بابو میرے پاس بھان نہیں"۔

"تم اٹھنی لے لو" میں نے اس کے بھولپن سے خوش ہو کر کہا۔

"پوری؟" اس نے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا "ہاں تمہارے پاس بھان جو نہیں ہے"۔

ایک آنہ لینے والی بھکارن کے لئے اٹھنی ایسی ہی ہے جیسے ایک افسانہ نگار کی ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئے۔ سو میں نے طے کر لیا کہ اس نے اٹھنی کے لئے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑ لوں گا، اور ظاہر ہے جائز طور سے پکڑ دوں گا کیونکہ میرے پورے اٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے۔ پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا تو اس سے کہوں گا ــــــ میں اس سے کہوں گا ــــــ میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پہاڑوں کی برف پر شفق برس پڑی۔

مگر قبل اس کے کہ میرا ذہن پورے فقرے کو سنبھالتا، میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔
"اٹھنی تو لیتی جاؤ" میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے کوئی ننگا عشقیہ شعر پڑھ رہا ہوں۔
وہ پلٹ کر اور دروازے میں سے جھانک کر بولی۔ "لے تو لی تھی۔"
یہ میں نے بہت بعد میں سوچا کہ میرے اٹھنی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک لمحہ کب وارد ہوا تھا جب میں نے اسے اٹھنی دی تھی، اور جب میں نے یہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا، تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ مجھے کیوں یاد نہیں آیا تھا۔
پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اٹھنی کے علاوہ وہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ مجھے صرف اپنا چہرہ دے گئی تھی، جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دینے لگا۔ پھر دھندلا گیا۔ پانچویں دن تو وہ بالکل غائب ہو گیا۔
میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریوں میں یونانی سنگ تراشی پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں چھان ماریں مگر مجھے وینس، سائیکی اور افروڈائیٹ کے چہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا جو ان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا۔ شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف ابھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب قوسیں پیدا کر دی تھیں۔ یا شاید سائیکی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کوتاہ بھی تھی اور میلی بھی۔ یا ممکن ہے افروڈائیٹ کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے، زیادہ جذباتی تھے۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنے مجموعی تاثر

کی صورت میں مجھے ضرور یاد تھا مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ برف کی طرح پگھلنے لگتا۔

ساتویں دن شام کے قریب مجھ پر یکایک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ چہرے غالب کے شعر نہیں ہوتے کہ جب چاہا اٹھا کر پڑھ لو۔ یہ تو سامنے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ چہرے تو ملتے ہیں اور ملے کب واپس آئے ہیں۔ تم نے ایک چہرہ دیکھا۔ مانا کہ یہ بے حد حسین، بے حد عجیب چہرہ تھا، لیکن جیسے یہ چہرہ، جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی عورت کا ایسا چہرہ بھی ہوگا۔ یکایک تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا، اسی طرح کئی اور چہرے آتے رہیں گے اور گزرتے رہیں گے۔ اور اگر تم ہر چہرے پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے تو آخر کار ایک روز تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے ہمدردوں نے تمہیں پاگل خانے بھجوا دیا ہے۔

ہفتے میں یہ پہلی رات تھی جب میں سکون سے سویا۔ جب میں اٹھا تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا جلتی ہوئی ایک دیا سلائی، بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے جن میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے۔ پھر خیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ ابھرا اور آواز آئی۔

"سنیے سخی"

میں پلنگ پر سے کود کر اترا اور دروازے میں سے جھانکا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے

سیڑھیاں اُتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا۔ پھر سڑک پر آگیا۔ وہاں معمول کی زندگی
رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ محلے کے ایک تانگے والے
نے میرے پاس آکر حیرت سے پوچھا "کیوں بابوجی۔ خیریت تو ہے؟ آپ ننگے پاؤں
کیوں کھڑے ہیں؟"

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لیے تھے، مگر میرے ذہن کو جو زخم زخم ہو رہا
تھا۔ ایک تانگے والا کیا کسی نے بھی نہ دیکھا کہ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لیے
کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں، یا شاید اس لیے کہ سب کے اپنے اپنے زخم
ہوتے ہیں۔

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے، کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے
تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر ذرا سا رولوں۔ انسان آخر زخموں کے ہاتھوں
ناطوں کو کیوں چھپاتے پھرتے ہیں جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیار سے ایک
دوسرے کو پٹا لیں۔

تانگے والے کو کوئی جواب دیئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر سر
پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر لیٹ گیا جیسے کڑے کوسوں کا سفر طے کر کے آرہا ہوں
میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا، مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی
تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت ڈراؤنا سناٹا مسلط تھا۔ آج زندگی

بھی کہیں مر گیا تھا۔

مَیں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے : "خدا کی راہ میں ایک آنہ دیدے سخی، تیرا بچہ جیوے"۔

مَیں نے چادر نوچ کر پھینک دی۔ وہ دروازے پر سچ مچ کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی "خدا کی راہ میں ایک آنہ دیدے سخی، تیرا بچہ جیوے"۔

مَیں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ باقاعدہ میرے نکاح میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں۔ "تم اتنے دِنوں کہاں تھیں؟" مَیں نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج تم پُورے ایک ہفتے بعد میرے پاس آئی ہو؟"

میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو آج کسی گلابی دوا کے حلقے میں سجی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ چمک جو انتہائی پیار، یا انتہائی غصّے، یا اِنتہائی ڈر کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔

"بولو۔ کہاں تھیں تم؟" مَیں کڑکا۔

"مَیں یہیں تھی بابو۔ اور کہاں تھی" وہ بچّے کی طرح بولی۔

"تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟" میں نے اُسی لہجے میں پُوچھا۔

اور وہ بولی۔ "مَیں اٹھنّی جو لے گئی تھی سخی۔ ایک آنہ اُس دِن کا۔ باقی سات آنے سات دنوں کے۔ آج آٹھواں دن تھا تو آگئی"۔

بھکارن کا چہرہ پھرکی کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ پڑاخ

کر کے چیختی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے۔ وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے، انہیں مٹھی میں لیکر بھکارن کی طرف بڑھا۔ اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیئے اور چیخا "اِن روپوں میں جتنے بھی آتے ہیں اتنے دِنوں سے اگر تم ایک بھی دن پہلے یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا، دفع ہو جا۔"

گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں" چن لی تھیں "پڑ کوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کے بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ اُنہوں نے رنگین لنگوٹیں باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھندنے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے، وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اُتری تھیں، یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اِس شدت سے تیل چپڑوا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا، پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آ گئے، اُنہوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے سامنے ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی۔ "مولا کہاں ہے؟"۔

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھنچے چلے آئے تھے۔

"مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!" دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پُوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتے بڑھنے لگے، "جما ہوا" "پڑ" ٹوٹ گیا۔ منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طُوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا۔ مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہو لئے ـــــ اور پھر اتنے میں جیسے میدان میں سیروں بارُود سے بھرا ہوا گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکوروں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آگیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھُو کر 'یا علی' کا نعرہ لگانے کے لئے ہاتھ ہوا میں بُلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی۔ "مولے، اے مولے میرے بیٹے۔ تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے۔ "رنگے نے تیرے باپ کو اُدھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رُک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اُڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی

سینہ سے لگائے بھاگا آرہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوفزدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا۔ اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے "رُک جا مولے!"

مولا لپکا چلا گیا، مگر پھر ایک دم جیسے اِس کے قدم جکڑ لیے گئے، اور وہ بُت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نُور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے "تو آگے نہیں جائے گا مولے۔"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر بولا "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"

"مَیں کہہ رہا ہوں" — پیر جی 'مَیں' پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔

مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیئے اور ناک بھی کاٹ ڈالیئے میری۔ مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی، بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو مَیں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔"

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے، رنگے کا بڑا لڑکا بولا "آ بیٹے آ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیاں

کانوجیرنہ ائل ڈالوں تو قادر انام نہیں۔ میرا اگنت ڈا سا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے۔ روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا، پھر پکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار کنڈلے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کیے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے "اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ ورنہ بدبختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا۔ جاؤ، تمہیں خدا اور رسولؐ کا واسطہ قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ چلے جاؤ"۔

لوگ سر جھکا کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگا۔ مولا نے جلدی سے تلچے سے پٹکا لے کے ادب سے اپنے گھٹنے چھپا لیے اور سیڑھیوں پر سے اُتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لیے اس کے پاس آئے اور بولے "اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے"۔

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے!" تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا۔ "تو کیا اب رونا بھی نہیں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

"ہاں تاجے!" مولا نے دوسری بار بازو کو آنکھوں پر رگڑا۔ "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے، میرے باپ کے خون پر مکھیاں اُڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کُتّے کی طرح دُم دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لئے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اُس کے باپ کی لاش کو تھانے اُٹھا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مُنہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اُس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر مُنہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اُس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اُتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا۔ کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر اُبل کر اُس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لئے گاؤں سے نکلے۔ مگر جب وہ تھانہ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود

رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قل ھو اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانیدار سے انہوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا۔ مگر تھانیدار نے انہیں سمجھایا کہ "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قتل کو ضائع کر بیٹھو گے۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ ادھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے ادھر تمہارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھونک آیا ہے؟"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے لیکن دونوں قتلوں کا وافر چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرنے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا اور کہا "اس روز تم اور تمہارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا۔ تمہاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا ہے تو ایسا لگا جیسے گھوڑے کو بھی قتل کا پتہ چل گیا ہے۔ آندھی بن گیا خدا کی قسم۔ اسی لئے تو لاش ابھی تھانے میں نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر واپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولے کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ ——— پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادرے کے گنڈاسے مرا تھا۔ رنگا تو صرف شکار رہا تھا بیٹوں کو۔ رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح

کویت چلا گیا، قادر اپنے کوٹھے کی چھت پر مُردہ پایا گیا ہے اور وہ بھی یُوں کہ جب اُس کے بھائیوں پھلے اور گُلّے نے اسے اُٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی اور مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا۔ تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پہ کھڑا رہا۔ کتنی راتیں اسے اُونگھنے تک نہ دیا گیا۔ مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آ نکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی، اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "ابھی دو ا باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی۔ میرے دُودھ میں تیرے باپ کا خُون تھا مولے، اور تیرے خون میں میرا دُودھ ہے' اور یہ سے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اُس کی مونچھوں میں ڈوڈو بل آ گئے تھے کانوں میں بڑی بڑی مُرکیں جھجھانے لگی تھیں۔ آنکھوں میں سُرمے کی دھار کو کبھی کسی نے مٹا ہوا نہ دیکھا۔ خوشبودار تیل اس کے لہریے بالوں میں آگ کی قلمیں سی جلاتے رکھتا۔ ہاتھی دانت کا بلالی کنگھا اُتر کر اس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔ وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہبند کا کم سے کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا۔ باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا۔ اور اس کا ایک سرا گر کر زمین پر گھسٹنے لگتا اور گھسٹتا چلا جاتا۔ مولے کے ہاتھ میں ہمیشہ اُس کے قد سے بھی کہیں لمبی تیل پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوپال پہ بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے لگتی اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو

اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ ہَولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔ اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تنی ہوئی تو لوگ آتے، ہَولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں ہَولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہَولا کی لٹھ پر سے اُلانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا۔ ہَولا اس وقت ایک دیوار سے لگا، لٹھ سے دُوسری دیوار کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے اُلانگ گیا۔ ایکا ایکی ہَولا نے پھر کر ڈَیب میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا "ٹھہر جاؤ چھوکرے، جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ اُلانگی ہے؟ یہ ہَولا کی لٹھ ہے۔ ہَولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان ہَولا کا نام سُنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا "مجھے پتہ نہیں تھا مولے۔"

ہَولا نے گنڈاسا اُتار کر ڈَیب میں اُڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا "تو پھر جا اپنا کام کر" اور پھر وہ لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

ہَولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور مُرکیں اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن ہَولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی۔ تیل پلی، پیتل کے کوکوں سے اَٹی ہوئی۔ لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی۔ گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے

وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ۔ اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ٹینک تھی۔ اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے پھلے اور رنگے کی راہ تکتا رہتا ہے۔ قادرے کے قتل اور مولے کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا۔ اور رنگے نے علاقہ کے مشہور رسّہ گیر چودھری مظفر الٰہی کے ہاں پناہ لی تھی، جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کر کے لاتا۔ چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں، وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سُراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری مظفر کے قصبے کے قریب پہنچتے تو جی میں کہتے "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!" انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سُراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک جا پہنچے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کی بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چودھری کے خوف کے مارے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر اور تھلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے "کھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!"

مولا نے چودھری مظفر اور اُس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں صرف یہ چودھری ہی ہے جو اس کی لٹھ اُلانگ سکتا ہے، لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ پھنسے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے " کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!

تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا " اور کچھ نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر، یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میراسیوں نائیوں سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے لے کر ڈرانے لگی ہیں۔ لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں۔ کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے تجھے مولا بیاہ لے جائے۔ سنتے ہو مولے ؟"

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کود اتھا اس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا " ابے تاجے، اپنا کام کر۔ گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پٹھے۔ تیرا جی چھوٹ گیا ہے۔ تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے، جا اپنا کام کر۔ میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی ——— جا" اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراسی کو ہانک لگائی "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا اُلو کے پٹھے! جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا کیا! چلم لا۔"

تاجا پلٹ گیا، مگر گلی کے موڑ پر جا کر رک گیا۔ اور مڑ کے مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جوانمرگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا تاجے کے پاس آ کر بولا " دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔ اس لیے کہ کسی زمانے

میں تیری میری یاری تھی، پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے۔ تلبے، تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر ایسی یاری کو لیکر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ تیرے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چُک جائے، میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں تک پہنچے گا۔ اس لیے جا اپنا کام کر۔ تیری میری یاری ختم، اس لیے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پر ترس کھائے تو آج میرے گنڈاسے پر جا پہنچتی ہے۔ جا۔"

واپس آکر مولا نے میراسی سے چلم لے کر کش لگایا تو شعلہ اُبھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لمحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراسی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراسی بل کھا کے رہ گیا اور ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا "ترس کھاتا ہے حرامزادہ۔"

اس نے چلم اُٹھا کر سامنے دیوار پر پٹخ دی اور لٹھ اُٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں بس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دُور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اُسے کھنکرون پر لٹھ بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اُٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی لانبی سُرخ مرچوں کو چن رہی ہے جو جھکتے ہوئے اُس کے سر پر رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے گر گئی تھیں۔

مولا سنانے میں آگیا، لٹھ کو الگن تو ایک طرف رہا، اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گنے کے چھیڑے کی طرح اٹھا کر ڈال دیا ہے اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے، اور جب مولا نے کڑک کر کہا "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے، جانتی ہو میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھری میں ٹھونستے ہوئے کہا "کوئی سڑی لگتے ہو!"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی "اسی لیے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تو تم پر ترس آگیا تھا"

"ترس آگیا تھا تمہیں، مجھ پر؟ مولا پر؟" مولا دھاڑا۔

"مولا!" لڑکی نے گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا سی چونک گئی۔

"ہاں، مولا گنڈاسے والا" مولا نے بڑے طنطنے سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سی مسکرا کے گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی، مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا "آجاؤ ماسی، آجاؤ، میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا"

جو اس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی "کیسا جھوٹ

بکتے ہیں لوگ، کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے،
پر تو نے تو میرے لیے اپنی لٹھ ——"

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے، ابھی ابھی کنوئیں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں۔
پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش ——"

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔
وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی، وہ بھاگنے لگا۔
آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آ گئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا
گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے ہی کا پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں
کی چاپ سن لی۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، چند مرچیں دہکتے
ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" مولا پکارا "کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔"

لڑکی بولی "میں ڈر کے نہیں رکی۔ ڈریں میرے دشمن۔"

مولا رک گیا، پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا "بس اتنا بتا دو
تم ہو کون —— کون ہو تم؟"

لڑکی ذرا سا مسکرا دی۔

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی "یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر راجو ہے مولا بخش۔

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹیبک تک گیا اور پھر رسّے کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا "ٹھہرو راجو، یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ"

راجو رُک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک مرچ چُن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انہیں راجو کی گٹھری میں ٹھونستے ہوئے بولا "تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"۔

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہولی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔

کچھ ہی دُور گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش!"

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا "ماسی، یہ لڑکی [illegible] یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا"

"یہیں کی ہے بھی بیٹا اور نہیں بھی" بڑھیا بولی "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اُٹھا کر اتنی دُور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اُکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کر کوئی دو ڈھائی کوس دُور ایک ڈھوک بنا لی۔ وہیں راجو اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے، تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے آجاتی ہے اور بس"

مولا جواب میں صرف "ہُوں" کہہ کر واپس چلا گیا، لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام

آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا، اور رابو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی —— اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی!

اس واقعے کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی کبھار باہر جاتا بھی تو کھیتوں چراگاہوں میں پھر پھرا کے واپس آ جاتا۔ ماں اس کے رویے پر چونکی، مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں، وہ بھی جو بہائے گئے اور وہ بھی جو بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پیٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پُراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولہا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً اٹھ کر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اُتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آ رہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر، جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے، بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں سے ہنکائے لیے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انہیں ٹوکا اور جواب میں انہوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے، یہ گلی تو خیر ایک ذیل سے گاؤں کی گلی ہے، چودھری مظفر الٰہی کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک سے بھی گزرے تو کوئی اُف تک نہ کرے!

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چودھری مظفر خود بنفس نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا

اِس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے، کڑک کر بولا چودھری کا مال میرے گاؤں میں سے نہیں گزرے گا چاہے یہ چودھری مظفر کا ہو چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو! اس نے لٹھ کو جھکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا: جاؤ۔

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا: "جاکر کہہ دو اپنے چودھری سے کہ مولے گنڈاسے والے نے تمہیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا کہ "یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں۔ اِن کے مالک پرسوں تک آ نکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزت میری ہی عزت ہے ماں!"

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافتیں طے کر کے کھوجیوں کی نازبرداریاں کرتے یہاں تک پہنچے تھے اور یہ سمجھتے آرہے تھے کہ ان کا مال چودھری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اور جب مولا اُن کا مال ان کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں باہر گلی میں جمع ہو گیا تھا اور اِس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا "آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو؟"

"کیوں؟" اُس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا

کرنا چاہتی ہے۔" میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور ترسوں بھی۔ ترسوں تھوم پیاز خریدنے آئی، پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی، کل ویسے ہی آ گئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔"

"کل ویسے ہی کیوں آ گئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی، بس جی چاہا آ گئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں؟"

"ویسے ہی ——" مولا نے جھجک کر کہا، پھر ایک دم اسے خیال آیا —— "یہ گھی بیچو گی؟" ——

"ہاں بیچنا تو ہے، پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔"

"کیوں؟"

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لیے مڑی تو مولا ایک دم بولا "دیکھو راجو میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا، پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے، میرے ہاتھ نہ بیچو میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔"

راجو کچھ سوچ کر بولی "چلو —— آؤ۔"

مولا اس کے آگے چلنے لگا۔ جاتے جاتے جانے اسے وہم سا گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ

اور پٹوں کو گھورے جا رہی ہے۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں پھدکتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ فوراً بولا "یہ چوزے میرے ہیں"

"ہوں گے" راجو بولی

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا، بولا "ماں یہ سب گھی خرید لو، میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں"

راجو نے برتن اُتار کر اس کے ڈھلنے پر سے کپڑا کھولا تاکہ بڑھیا گھی سونگھ لے۔ مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے، اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پہ سنہرے رُوئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مُڑی ہوئی ہیں جیسے اُٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مَس کریں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرّے ہیں۔ اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سُوئی کی نوک سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گُلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اُوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تِل ہے، جو کچھ یوں اُچٹا ہوا سا الگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اُڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لَس لَس کرتے گچھے لرز رہے ہیں، اور ان بُندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا ——

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی "پہلے دیکھ لے ماسی، رگڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر سونگھ لے پہلے!"

"نہ بیٹی میں تو نہ سونگھوں گی" ماں نے کہا "میرا تو روز روز کا مکر دہو تا ہے!" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

"تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں"

"تو پھر جا ——" ماں نے ترازو اٹھا کر ایک طرف پھینک دی "تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا۔ رشتہ قتلوں کا اور سودے گھی کے —— جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی "جن پر گنڈاسے چلاتے ہیں ان سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان۔ یہ گلے کی منگیتر ہے، گلے کی —— رنگے کے بیٹے کی!"

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اٹھی اور بولی "تمہارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے؟"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپیڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور نورا بولا " تو کیا اب روؤں بھی نہیں ؟ "

ماں چپکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی ۔

اب نورا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا ۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا ۔ نورے نے وہاں چائے کی دکان کھول رکھی تھی ۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا ۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیور سے شہروں کی خبریں پوچھتے اور نورا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا ۔ لوگ اب نورا کے عادی ہو چکے تھے ۔ وہ اس کے پاس سے حقّہ تک اٹھا لاتے تھے مگر کسی کو اس کی لٹھ کو چھونے یا اُلانگنے کی جرأت نہ ہوتی جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی ۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے لاری آ کر رُکی اور اس میں سے مسافر اترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر اُلّو بول گیا ۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گلا اترا ، اس کے پیچھے چار بڑے قدآور گھبرو اترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے ۔

نورا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اُس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ اُس نے تیزی سے چارپائی پر سے پاؤں لٹکائے اور ٹرنک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا ۔ " حقّہ لانا نورے " وہ پکارا ۔ اور زرد زرد نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقّہ رکھ کر غڑاپ سے

دکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نوواردو لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اُڑا دیا۔

"مولے"۔ گلّے نے اسے للکارا۔

"کہو"۔ مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلّے کی طرف اڑا دیا۔

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں"۔

"کہو کہو"——

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو، ہم بھی خالی ہاتھ ہیں"۔

"لو"۔ مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چپٹ کر رہ گیا۔ بچّے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلّے سے پوچھا۔

گلّا جو اب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا "تم نے چودھری مظفر کا مال روکا تھا؟"

"ہاں"۔ مولا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "پھر؟"

گلّے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کرکے بولا "چودھری نے تمہیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمہارے

حوالے کردیں۔"

"انعام"! مولا چونکا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

گلّے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے مُنہ پر دے مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ بات ہے۔"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اُٹھائی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نووارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے مگر گلّا لاری کی پرلی طرف کنکروں پہ پھسل کر گر گیا۔ لپکتا ہوا مولا رُک گیا، اُٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس زاویے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا ——

دم بخود ہجوم دیوار سے اُچٹ اُچٹ کر آگے آرہا تھا، بچّے آوے کی راکھ اُڑاتے بھاگتے ہوئے اُتر آئے، تورا دکان میں سے باہر آگیا۔

گلّے نے اپنی اُنگلیوں اور پنجوں کو یوں زمین میں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے سینہ میں اُتر جانا چاہتا ہے۔

اور پھر مولا، جو معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لئے سکتے میں آگیا ہے، ایک قدم آگے بڑھا۔ لٹھ کو دُور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دیا اور گلّے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اُٹھاتے ہوئے بولا۔ "چودھری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے، رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔"

اُس نے ہولے ہولے گلّے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرّے کو سیدھا

کیا اور بولا" رسید تم ہی کر دے دینا پر تمہیں تو دُولہا بننا ہے ابھی —— اس لیئے جاؤ اپنا کام کرو۔"

گلا سر جھکائے ہولے ہولے چلتا گلی میں مُڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اور جب اُس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آکر نہایت وحشت سے بولنے لگی "تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چُپکے سے! ارے تُو تو میرا جلالی بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اُٹھا، تو نے ——!" وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رُک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دُور سے بولی "تو تو رو رہا ہے مولے؟"

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا:

"تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یُوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہُوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اُٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا" کسی نے کہہ دیا "ہزاروں کا تو قافلہ ہے" اور اختر کی ماں اِس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا" وہ سوچتی۔ "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا۔ اور پھر ماں کو نہ پاکر رو دیا ہوگا اور پھر ——— پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے۔ پانچ سال سے کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ———"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل اُدھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنے توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال وہ جب روتا چلا آ ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا۔ "میں نعرۂ تکبیر مار دُوں گا" اور

یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے اُلجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا، وہ بولا "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔ "ذرا ٹھہر پرمیشرے، کرپان اپنا دھرم پورا کرلے پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں۔ اتنا ذرا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے، جس نے ——"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جاکر کہا "بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لیکر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے منہ میں گھلے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ "پتہ نہیں۔"

"لو اور سنو" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دیکر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی

کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے۔ اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا "سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کر بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا "لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا، مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بھاگتا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں

چمک تھی، اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو!"

اختر ذرا سا جُھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ "آہا" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا "تتلی"

"لوگے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں" اختر نے اپنے ہاتھوں کو مَلا۔

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اُڑ گئی۔ اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرّے چھوڑ گئی۔ اختر اُداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اُڑ جاتی تھی تو یوں ہی مُنہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے

سکو گئے تھے تو اختر پھر ٹک پھر ٹک کر رونے لگا "ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس جائیں گے" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اُٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے اسے یہ کہا کہ "ہاں ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لئے چلتا ہوں" تو اختر چُپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لُٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں تھیں۔ اور وہ بڑی پُراسرار سرگوشی میں بولا تھا "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے"۔

گرنتھی جی اور گاؤں کے دُوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔" جانے کیا ہو گیا ہے اسے"! اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے۔ تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا۔ کہتا تھا "بیٹی کو بُرا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری۔ ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے۔

وقت آئیگا تو چلی جائے گی" ۔ ——— اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سُنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سُنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اُٹھ جاتے ہیں" ۔

وہ ایک مہینے سے اِس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اُٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں۔ بیوی سے کہتا۔ "سُنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" ——— بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا۔ اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اُجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سُنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب اِن کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔

"ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے نکمّی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلافِ معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے۔"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے، اور پھر یار دو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے۔ اور اختر کے کانوں کی لوئیں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یار دو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی

کرکرتارے کے کانوں کی لَویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں یہ ذرا پتلی ہیں، اور ——"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کیئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اُٹھا" ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔" اری لو۔ یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

" تو جائے" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آگیا تھا جسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔" ڈاکہ مارنے گیا تھا سُورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اُٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سَو میں تو بِک جاتی۔ اس اُجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر —— پگلے —— تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟ جہاں سے اُٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔" کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟"

" نہیں" اب کے بیوی چیخ اُٹھی۔" مَیں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ مَیں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اُٹھا لایا ہے وہاں سے، لے جا اسے، پھینک دے باہر۔"

"نہیں ۔ مہینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا ۔ اور بیوی اپنے سینے کو دوہتڑوں سے پیٹتی، چیختی چلاتی بھاگی ۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی ۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی ۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں ۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا ۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی ۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا ۔

"ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر ۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو اختر — اختر!" وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا ۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے ۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں ۔ اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا ۔ "ارے میں تو لٹ گیا ۔ پاس بے چلتا یارو ۔ ارے وہ گیا کہاں ۔ اختر ۔ ارے اختر ۔"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا ۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے، روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا ۔ "تم تو سکھ ہو ۔"

"ہاں بیٹے سکھ تو ہوں" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعترافِ جرم کر لیا ۔ "تو پھر ہم نہیں آئیں گے ۔" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا ۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا ۔

"نہیں"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ "چلو" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے۔ پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ "نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں کے پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور اب جیسے پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا: "مجھے معاف کر دے اختر مجھے تمہارے خدا کی قسم۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا۔ تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا"

"اچھا!" اختر نے اُلٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رُک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے، ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا: "روتے کیوں ہو پرمیشرے۔ بس ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رُک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا: "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو اور اگر ادھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا۔" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی: "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ مَیں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال منڈاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مُرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا: "پرمیشر سنگھ۔"

"جی" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالا آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں مُسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سُنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرمشالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے، مرا اکٹا۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"واہگورو جی کا لحاظ کون نہیں کرتا گدھی" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آگیا ——— "اچھا جی۔ اچھا۔" اُس نے کہا۔ اور کچھ یُوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لَووں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آکر پگڑی اُتارتا تھا۔ تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھُو کر بہت خوش ہوتی "ذرا ادھر تو آ امر کور! یہ دیکھ، کیسے بڑھ رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا

جائیگا کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں" امر کور دھیں سے جواب دیتی "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتار بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی "میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں ماں یہ مُسلا ہے اور جو کرتار ہوتا ہے وہ مُسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتار ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں، اختر چند روز اپنی اماں کے لئے روتا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لیکر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا "میرے سر پہ گپڑی باندھ دو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا "یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائیگا۔ پر ایک بات کبھی نہیں ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ وہ نہیں ہوگا مجھ سے۔ بچے یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے

ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا۔ اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا" الو کی پٹھی" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا" سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ " پانی" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف پھینک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھنویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔" پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ میں ماروں گا۔"

امرکور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی "مار تو سہی۔ تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بُری حالت بنالی تھی۔ اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امرکور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے"۔ پرمیشر سنگھ نے امرکور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی اماں سے کہہ رہی تھی "کیوں پانی پلاؤں کرتارا بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر۔ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے"۔

"نہیں" اختر بڑے غصے سے بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے۔ اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے"۔

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا "تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے"۔

"یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے"! امرکور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے" اختر بولا "تمہیں اس سے کیا"۔

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شلم کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اُٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔

اُری سُنتی ہو؟ سُن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی "بیٹی"۔

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اُٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ "سُنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے"۔

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ "کوئی چیز چیخی تھی"۔

"امر کور چیخی تھی" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن

پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا!" اختر بولا

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا۔ اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر نکل جائیگا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی "میں جن ہوں میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھوکی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

"ہاں ہاں" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔ اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں" اختر بولا۔ "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو نیند آ جائے گی، اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کے سوجاؤ" پرمیشر سنگھ نے کہا "روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سوجاؤ" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری "نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے"

"ڈر لگتا ہے؟" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ "پگلیاں" وہ بولا "گدھیاں"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خرّاٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سوگیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے۔ اور ابھی وہ پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائیگا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں"

"کرتارا؟"

"نہیں" پھر کچھ سوچ کر بولا "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جاکر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جاکر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کے فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے۔ مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا "کیوں بے کرتارو۔ تو نے میرے منہ پہ گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا؟" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔
اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مسلا" لڑکے نے اسے گالی دی

"سکھڑا" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا "سنو بیٹے میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں گے نا، تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولہ دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے پھیلتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا "فوجیوں کی لاری آ گئی۔" ــــــــ وہ مینڈھ پر سے کود پڑا۔ اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ "گیانے۔ او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔

اُسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کرکے بولا "آؤ بھئی کرتارے، تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیا نے آئے ہیں۔ ہونہہ!" ——— پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی: "جاؤں" ———

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پاکر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔

گھر جاکر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کرکے اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرمشالہ سے اُدھر کھیت میں رُک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیرِ لب مسکرانے لگے، پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی جس نے مامتا پر بڑا زور دیا جو، ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیسیں بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیا لی گئیں تھیں" اور مذہب کا کیا ہے دوستو" اس نے کہا تھا۔

دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے جُدا کرتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا، ان سے ہاتھ ملایا۔ اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارکباد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد لُٹا لُٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لِٹا کر کچھ یوں تھپکا کر اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر اُدھر دیکھ کر پھر سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے اتنا بڑا کانٹا اُتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا۔ اور پھر اس کی ماں ننگے سر اُوپر بھاگی۔ اسے گود میں بٹھا لیا پھر نیچے بیٹھی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔ "ارے میرا دوپٹہ تو اُوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد جھنک کر بیوی سے پوچھا۔ "سنو۔ کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو۔" بیوی بولی۔ اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔ "کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے!"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔

"آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آکر وہ بولا۔ "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے، جب یہ ہمارے سر پہ پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہو گا۔ تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہو گا۔"

اب کے اختر بولا۔ "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند

کو دیکھ رہی ہو گی؟"

"ہاں" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "چلو گے اماں کے پاس؟"

"ہاں" اختر بولا۔ "پر تم تو جاتے نہیں، تم بہت بُرے ہو۔ تم سِکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا "نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لیے جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرمو ہمیں اماں پاس لے جائیگا۔ ہم وہاں سے پرمو کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔ "گانا سنو گے؟"

"ہاں"

"پہلے تم قرآن سناؤ"

"اچھا" اور اختر قل ھو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر پھونکی اور بولا "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

رُک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر

اس کے سینے پر چھوڑ کر دی اور بولا: "اب تم سناؤ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا جے

بنتو دا منہ چن ورگا جے

بنتو دا لک چترا جے

لکو

بنتو دا لک چترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بنتو ہے، امر کور کا نام بھی بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے!"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ

سے پوچھا "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ ہو؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آگئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر ؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا۔ اور کہانی ابھی جاری تھی، جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آگیا !"

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "جاؤ بیٹے تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ——"

"شش !" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور سرگوشی میں بولا۔ "اذان کے وقت نہیں بولتے۔"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا۔

"شش !" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم ——"

"کیوں؟ کیوں نہیں آؤ گے"؟ اختر نے پوچھا

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے"۔ پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا"۔ بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتار ا نہیں۔ اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو۔ مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا"۔

"لکھوں گا" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور وہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا تو اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا"؟

"اچھا"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔"جاؤ"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔"تم بھی آجاؤ نا"

"نہیں بھئی" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا"۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" اختر بولا

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا" بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو افق کے دائرے پہ اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دُور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پہ نظریں گاڑے ٹیلے پہ بیٹھا رہا۔ اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہاں سے

اُتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے۔ "کون ہو تم؟"

"اختر۔"

وہ یُوں بولا جیسے ساری دُنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اُتار لی تو اختر کے کیس کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنّا کر پگڑی چھین لی اور پھر ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا "میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو، ورنہ مَیں تمہیں ماروں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی دھپ سے زمین پر گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔

"ہالٹ"

ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا اُن کے

پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رُکے تو پریشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پٹی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا "مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آ رہا تھا۔ اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

الحمد للہ

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیض جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا، اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ پر گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ابل ماہیے کی لے الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کیے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آگرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس

ں روپے گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا تھا اور اُن سے کہتا "مجھے دعائیں نہ دو
ں شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے
ن نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، بے فکری۔ مجھے تو اس کی رحمتوں
زمانے سے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی
ابل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد
ں تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے
ئیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا، جیسے
رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی آبل
بان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت
۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشنما لنگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے
ڑوں کے روپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی۔ اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چولے نے
لی تھی جو کئی بار دُھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اُسے بُنتے وقت جُلاہے نے
ت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بُن ڈالی ہے۔ مطلاً کلاہ کی داڑھی مونچھیں
آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بُندوں، جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا
خ سُرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح اُوپر اُٹھ گئی تھیں کہ مولوی آبل ہر وقت
ع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔

تابڑ توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی ابلؔ نے اپنی پہلوٹھی کی بیٹی مہرالنساء کے لیے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی عمدۃ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا اور جب مولوی ابلؔ نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اَور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے قیمتیں یوں ایک دم زن سے اوپر ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے دُنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیجدی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے، ایک چونّی کما رہا ہوں، چلیئے آپ چونّی کو بھی جانے دیجیے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں، جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اُترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابلؔ خدا سے اپنی عمدہ کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولوی ابلؔ کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دکان سے اُٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہ کو حاضر و ناظر جان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی اور اولاد کے ساتھ مولوی ابلؔ کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہرالنساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا۔ ادھر مولوی ابلؔ کی

یہ حالت ہوگئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اُٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل سجدے ہی میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوئی۔ مگر وہ مولوی البرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا، کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا۔ چوہدری فتح داد کرسی نشین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چوہدری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہوگئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھاتا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے" لیکن چوہدری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چوہدری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہوگیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چوہدری فتح داد بنفس نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہوگا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور کھانا نائن نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہوگا"

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے۔ اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں [illegible]

تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔ مولوی آبل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آجاتی تھیں۔ اِدھر زیب النسار نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ سے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے "وظیفوں" پر ذرا ذرا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النسار کو دو چنگیریں ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اِس روز دونوں وقت سب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی بچتے انہیں دھوپ میں سکھایا جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں ابال کر میٹھے ٹکڑے تیار کیے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اِنسان کو پیٹ بھرنے کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی تو چاہیے۔ چودھری فتح داد ہر نئی فصل پر مولوی آبل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب یہ پوشاک گھر میں آئی ایکا ایکی درزی کی دکان سج گئی۔ زیب النسار، مہرن اور زبدہ اور شمن کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہبند کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں ننھوں کے بہت سے جوڑے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لیے مولوی آبل کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اِس دَوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آ نکلتے تو وہ مہر النسار کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا۔ زیب النسا کے کنگن جو کبھی اس کی سانولی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے اب ذرا سے جھٹکے سے پہنچے پر آجاتے تھے اور اس کی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا ہمہ جمل سر اٹھا چکا تھا۔ اور جب وہ پلکیں جھکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی آبل زندگی کے

ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل بیچ ہو کر رہ گیا تھا۔ اِنہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات
کی بجائے مولوی آبل کہا جانے لگا تھا کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں
پر مسوڑھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں سی
بج اٹھتی تھیں مگر آواز کا ٹھاٹھ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے
پیتل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں ایک لرزش سی ضرور آ گئی
تھی جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی، لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا
سبب معلوم تھا، کیونکہ مولوی آبل اس سے مہرالنساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے
میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔
رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا، اور کئی نوجوان اسے جچے بھی تھے۔
مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی آبل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہرالنساء سوکھے ٹکڑوں
پر پلی ہے اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ۔ اور پھر یہ
بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی آبل کو عیدین پر دس بیس پیسے ملتے ہیں جن سے
مہرالنساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہوگا۔ دوسرے نوبچوں کے لیے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے
ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات کی مگر مخاطب کچھ یوں تیوراکر دیکھ رہے جیسے پھولوں کی
پتیوں میں سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی آبل اور زیب النساء کی دعائیں رائیگاں نہ گئیں۔ انہی دنوں سلیقہ خدا یار
اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔ خدا یار

ایک حافظِ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی ابل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب بیس بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے۔ اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بُلا لیا۔ پھر جب اس نے کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی ابل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز مولوی ابل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا۔ "عارف کی ماں شمیم احمد کہتا ہے وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا تم کہو تو جہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں۔ جہیز کے لیے ضرورت تو ہے ہی۔ ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی، اس لیے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائیگا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے، دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نورِ نظر ہے، تیسرے ـــــ" مولوی ابل نے رُک کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں، اللہ جل شانہٗ کی قسم مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے جہرن ہی کے لیے آسمان سے اُتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بھوبھل میں بدل گئی۔ "تمہارے مُنہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی۔

صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی آبل کے سامنے رکھ دیا۔ "خدا تیری زبان مبارک کرے میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پراٹھا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا ہے۔" وہ رونے لگی، ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی اور جب مہرالنسار کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھی" بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا اُلٹ کر رکھ دو، ورنہ سب ٹکڑے کوّوں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی"۔ ——— اور مہرالنسار کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں شمیم احمد کی دکان پر ابّا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنسار باہر چلی گئی تو مولوی آبل نے ڈبے کی کل متاع تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اُٹھتے ہوئے بولا: "دعا کرنا، مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں"۔

زیب النسار آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی آبل شمیم احمد کی دکان کو چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ برنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی آبل دکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں پر بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی آبل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھول تھے اور نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے۔

"ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو۔" مولوی ابل نے معمول سے زیادہ بلند آواز میں کہا، اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی ابل کے سامنے یوں رکھ دیا، جیسے مفت میں ـــــــ محض تحفتہً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی ابل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا، صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا، کھنکارا اور بولا، چھ روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی ابل کے دماغ پر دھب دھب کرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جم کر رہ گئیں۔ مولوی ابل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ لو بہنی فرمائی ہے اس لیے میں نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر تلافی کر دوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔"

مولوی ابل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد کو کہہ دے "اللہ جل شانہٗ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد، اس لیے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے۔" لیکن یہ تو ایک جیب سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا،

س پر اُٹھتے ہی اُٹھتے اس نے قابو پالیا اور وہ بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد' یہ بھی کوئی کہنے
ہ بات تھی! اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے"۔

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النسار نے کپڑے کی نرمی اور بے قراری اور پھبن کو دیکھ کر مولوی ابل
کے ان الفاظ کے جواب میں کہا" اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری تہمن کا سہاگ مہکے"۔

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی ابل کے دروازے کی زنجیر بجی۔ اس وقت آنے
الے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر لاتے تھے۔ اس لئے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے سے بچے
یوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی ابل کو کیا سوجھی' خلافِ معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو"۔
بچے رُک گئے، سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النسار تو رو دی، مگر مولوی ابل ان کو
ماسہ دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک
ارہ سا اُمڈا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ"۔

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لئے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہبند ٹین کی طرح بج اُٹھا۔ اور جب
س نے رُک رُک کر کہا" آپ کی خدمت میں ایک درخواست لیکر آیا ہوں قبلہ۔ اسی لئے
پ کو بے وقت زحمت دی"۔ مولوی ابل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اُمڈتی ہوئی مہک کچھ
ملتانی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سُنی جاسکتی تھی، لیکن مولوی ابل گردن
مڑ کر پکارا "ابھی میں آیا عارف کی ماں" اور پھر وہ شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی
سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہبند کا شور و غوغا روکنے کے لئے اسے دوسرے ہاتھ

سے گھٹنوں تک اُٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے۔ دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی آبل پہلے حجرے سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لایا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس آیا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے نشمشی بالوں پر عطر سنا دیے کی روشنی میں پکنے لگا تھا۔

"کہو" مولوی آبل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لیے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی لو بے پناہ دھواں دے رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں۔"

"کہو کہو" مولوی آبل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں!

"کہو نا عزیزم۔"

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کیے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی

چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا "اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے تھا، مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پہ رو دیتی ہیں اور بُرا بھلا کہنے لگتی ہیں۔ سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں"۔

"تم نے اچھا کیا" مولوی آبل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پُرانا خادم ہوں" شمیم احمد نے سمٹتے، پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا "میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لیئے ————" اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اُڑا دیا ———— "حضور مجھے ہمیشہ کے لیئے اپنی غُلامی میں لے لیں"۔ شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی آبل کا جی چاہا کہ چٹکی بجا دے، رسماً ذرا ہنستے ہوئے بولا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد"۔

شمیم احمد نے بڑی حیرت اور دُکھ سے مولوی آبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآنِ مجید کے کئی مشکل مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غُلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دبی دبی آواز میں اس نے جیسے نزع کی آخری ہچکی لی۔ "جی میرا مطلب ہے کہ حضور ———— حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیں"۔

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی آبل کی تسلّی ہو گئی۔ اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا، اور

جب مولوی آبل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اُوپر اٹھا کر بے انتہا جھک سے اُوپر دیکھا۔ مولوی آبل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے رُک گئے تھے۔ شمیم احمد کی داڑھی پر عطرِ حنا چمک رہا تھا اور مولوی آبل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرا رہے تھے۔ اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں دُھواں اگلنے لگی تھی۔ مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بیتاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔

مولوی آبل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جلّ شانہٗ ـــــــ کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انہیں پرو لیا۔

"دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے ـــــــ آؤ، ادھر آؤ" ـــــــ اور مولوی آبل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النسا نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا "کہاں سے آ رہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آنے لگی ہیں۔"

مہرالنسا توے پر آخری روٹی ڈالے بیٹھی تھی، بولی "سچ ابا جی سارا گھر مہک اٹھا ہے۔"

"کیا بات ہے" زیب النسا نے پوچھا۔

مولوی آبل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا۔ اس لیے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے۔ سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا

"آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا۔" لٹکے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہرالنساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

"بات سنو عارف کی ماں۔" مولوی ابل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا۔ "میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہو۔"

مولوی ابل چہکا۔ "اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو اللہ جل شانہٗ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی!" اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے ٹانو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی۔ وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی داڑھی رکھ دی۔

"دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں" مولوی ابل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا "الحمدللہ! یوں سنتا ہے سننے والا۔ یوں دیتا ہے چھپر پھاڑ کے۔ سنتی ہو زیبن؟" آج مولوی ابل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کی بجائے زیبن کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "جب شمیم احمد خدا آیا تھا، جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس بیٹھتا تھا تو یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا مجھ کو جیسے ـــــ کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو ـــــ اللہ قسم۔"

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

"ٹھہرو" اب کے مولوی آبل کی آواز میں ڈانٹ نہیں۔" میں خود جاؤں گا۔" پھر بچوں کے پاس آکر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا" ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے سمجھے؟ ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں سے آنکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ" پھر ذرا بلند آواز میں بولا" انہیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی، یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔"

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی آبل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا، اور چھاتی سے لگا کر بولا۔" مبارک ہو قبلہ! ہزار ہا مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں۔"

اس وقت مولوی آبل کی نظروں میں چودھری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی۔" اللہ جل شانہٗ کا شکر اور آپ کا احسان ہے۔" اس نے چودھری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

"خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا۔" چودھری فتح داد بولا" اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجئے۔ شمیر احمد اچھا لڑکا ہے، پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دکاندار ہے دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دوکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ کیسا شنگا زمانہ آلگا ہے لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب پڑے پڑے بھک سے

ہو جائیں شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے، کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں تو م ڈالتی ہے کمبخت۔ ابھی ابھی شمیم نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی سے شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجیے۔ سو میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجیے اور یہ —— یہ ——"

چودھری نستج داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی —— "یہ میری بیٹی کو دے دیجیے گا"

مولوی ...ل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا :

"اللہ قبول فرمائے۔"

"آمین" مولوی آبل کے مُنہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی آبل نے اندر آکر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے، جن کی بڑے سے بُلبلے جتنی کٹوریوں میں جانے نگینے جڑے تھے یا میناکاری کا کام تھا۔

زیب النسا کسی اور چیز کی اُمید میں رُومال کو جھاڑ کر چیخی "شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟"

اور ابھی مولوی ابل جواب دینے نہیں پایا تھا کہ مہر النسا بھاگ کر باہر نکل گئی۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النسا کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشتِ شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔

"تم نے بھی تو منہ بھر کر کہہ دیا ۔۔۔ شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟ ۔۔۔"

مولوی آبل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اُتاری، اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھمکوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چودھری فتح داد دے گیا ہے۔ قمر ان کے لئے" مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور رواداری میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے پیروں پر مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی، کیونکہ شادی کا گھر سہی پر آخر مولوی ابوالبرکات کا گھر تھا، جس نے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دف بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا، اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ ۔۔۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اُٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا" مولوی آبل نے میراثنوں کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہر النساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور

ڈھولک کے بغیر ہی اپنی سُریلی الاپوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی، بچھڑنوں اور بچھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بُنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گولے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی آبل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی آبل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی آبل اور زیب النسا نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے گھسٹنے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں بھی گونجتی رہیں، اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کا گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

"مولوی کے پاس دستِ غیب کا تعویذ ہے۔" کسی نے رائے دی

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلّی میں اُنگلی ڈبو کر کہا "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لیے ہیں۔ کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النسا کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ نُگھڑ ہے اس لیے اولاد کے لیے رکھ چھوڑے۔ یہ کنگن اور یہ ناک کی کیل، یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟"

اور اس نے اپنی اُنگلی کو ٹھوڑی کی جھلّی سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہر النسا کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو لڑکیوں اور عورتوں کی ایک لہر سی اس پر جھپٹے نچھاور

ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے۔ مولوی آبل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے۔ ایک دم اپنی جگہ سے یوں اُچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچکدار کمانیاں اُبھر آئی ہیں۔ "ٹھہرو" ۔ مولوی آبل گرجا۔ کمانیاں دھرتی میں اُتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا، اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی آبل کچھ دُور تک ڈولی کے ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سُرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی آبل کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دُکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہروں کے لئے بانٹ لیا ہے۔ ایک موڑ پر جا کر وہ رُک گیا اور دُور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لیکر اس نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخایا اور پلٹ کر گھر کو جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈھ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں شہزادوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی آبل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور کھجلی ہو رہی تھی، وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی آبل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار و زار

رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے دائرے بنا کر بولی "ہمارے لیے تو بس یہ قبرستان کا سا سناٹا چھوڑ گئی ہماری مہرن"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" مولوی ابل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا "مہرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا شمن بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟" پھر ذرا سا رُک کر بولا،

"عارف میاں! زبدہ کیا کر رہی ہے؟"

"جی رو رہی ہے" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی ابل نے پوچھا۔

"جی جہاں مہرن آپا مایوں بیٹھی رہیں"۔ عارف بولا۔

"زبدہ!" مولوی ابل پکارا۔ زیب النسا مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سے سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا اور زبدہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چمکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اُجڑ رہی تھیں اور ——
مگر مولوی ابل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آگیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آ کر رُک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی ابل نے زیب النساء کے ہاتھ کو ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع

دے رہا ہے۔" عارف کی ماں! سنو، یہ زُبدہ تو جوان ہو گئی ہے!"

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہران کے عقب میں بیٹھی پلتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی آبل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔" فکر نہ کرو بیوی! اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

زیب النساء نے مولوی آبل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر سے گرا دیا۔" شرم کرو، پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے، اب کندھا سہلا رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے۔" زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا وہی کندھا اُچکا دیا۔

مولوی آبل کے ذہن میں ایک خیال آیا، پکارا "شمس!"

شمس النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی آبل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پاکر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی، پھر تلوے کا خم جھکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لپک لپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں، جاؤ" مولوی آبل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوتے بولا۔

شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النساء زار زار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمس اس کی طرف لپکیں۔

مولوی آبل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا اور پھر دیا کے قریب سے چمکتی ہوئی انگنی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قرآن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے نقشوں کی طرح کی گڑیاں پڑی ہوتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ اور اسی لئے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد اُبالے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی بعض وقت تو مولوی آبل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اُٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین کی خدمت کی برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا "تمہیں یاد ہو گا کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی! کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟

اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہرِ الٰہی ہے۔ یہ آثارِ قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اُتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ! ——"

اِس قسم کے جذباتی خُطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے۔ مگر پھر وُہی سنّاٹا عود کر آتا جس میں زبدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمسن کا جسم لچکتا، ٹین کے خالی بکسوں میں سُوکھے ٹکڑے اور بچّوں کے بلوری بنٹے بجتے، اور تالیاں بجاتے، اور قسمرن کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دُوسرے میں گھُسی پڑتیں۔

مولوی آبل کے صرف دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ جلّ شانۂ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جلّ شانۂ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی آبل اور زیب النسا اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور مہرن النسا کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہُوا تھا کہ زبدہ اور شمسن کے لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہرن النسا کے بَر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت سے وہ زبدۃ النسا اور شمس النسا کے لیے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ "ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمسن نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی ٹوٹی الیسی بچیوں کو کس دل سے اُٹھا کر پرائے گھر میں پٹخ آؤں؟ زبان وبان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا" وہ زیب النسا سے زبدہ اور شمس النسا پر بے تحاشا اُمڈتی جوانی

کی اطلاعیں پاکر کہتا " اللہ جلّ شانہٗ رحم فرمائے گا۔ توکّل بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جلّ شانہٗ پر توکّل کرتا ہے۔ توکّل نہ کرے تو بیج دیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکّل بیج کو چٹخاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے اور سبز پتّیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹّوں کو پروان چڑھاتا ہے سمجھیں عارف کی ماں ؟"۔

" پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النسار بحث کرتی " تم نے کیا کیا ہے ؟"

" الحمدللہ " مولوی ابل کہتا ۔ " میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دُعائیں مانگی ہیں!"

اور زیب النسار لاجواب ہو جاتی ۔

دُعاؤں کے بعد مولوی ابل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خداترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پوشاک پہنائی تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ دُوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جرّاحی کا کام کرتا تھا، چودھری کی ریڑھ کی ہڈّی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سُوج کر پھوٹ پڑا اور بہنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری کو لرزے کے بخار نے آلیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ اِن دنوں مولوی ابل کے گھر پر مُردنی چھائی رہتی۔ ایک تو مہرالنسار سے کسی کی ساس کا برتاؤ سوہانِ رُوح تھا، اس پر چودھری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی ابل چیخ اُٹھتا چُپ رہو

نامرادو! ادھر چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل رہے ہو ناشکرو! یہ چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے۔ اللہ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"۔

مولوی ابل ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا۔ لیکن وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہوتا کہ مولوی ابل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا۔ "دعا فرمایئے قبلہ" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی ابل آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا، "وہی شافیِ مطلق آپ کو کلی صحت عطا فرمائے گا" ——— لیکن ایک روز جب مولوی ابل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلافِ معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسبِ عادت تعظیماً کچھ اٹھا لیکن کراہا نہیں۔ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ"؟

"الحمدللہ۔ اچھی ہیں۔ دعا گو ہیں" مولوی ابل نے جواب دیا۔

"سنا ہے بہت پیغام آ رہے ہیں؟" چودھری نے پوچھا۔

مولوی ابل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آ رہے ہیں"

"پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چودھری مسلسل مولوی ابل کو دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی ابل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے لیے ہونٹ کھلے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو،
زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ ٹل کر بولا " جی فیصلہ میں کیا کروں - یہ تو اللہ جل شانہ،
ہی کرے گا جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لیے تنکا تک نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے
کون طے کرتا پھرے "

" تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں ؟ " چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی بھراہٹ تھی۔

" آپ کے دشمن مریں " مولوی ابل فوراً بول اٹھا " آپ اللہ جل شانہ کے فضل سے تندرست
ہو جائیں تو پھر بیٹھ کے طے کریں گے "

" جی ہاں " چودھری نے ہمدردانہ آواز میں کہا " فوراً طے ہونا چاہیئے۔ گھر میں جوان
لڑکی بیٹی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سب سامان کر دیگا۔
وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا ؟ "

" جی ہاں " مولوی ابل نے جواب دیا " باقاعدہ "

" اللہ قبول فرمائے " چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

" آمین " مولوی ابل نے عادتاً اس دعا کی تائید کر دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا " سنا ہے بیٹی مہرالنساء اور
شمیم احمد کی خوب نبھ رہی ہے۔ پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی "

" جی ہاں " مولوی ابل نے بڑے دکھ سے کہا " لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔
بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے "

" پر کس سے کیوں نہیں بنتی ؟ "

" بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے، تو سؤکے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بُو آتی ہے۔ تو اپنے ساتھ کیا لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

" ہوں " چودھری فتح داد کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر بولا " بیٹی پرائی نہیں ہوجاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہرن النسار کو کنگلی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجیے اور پھر دیکھیے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟ "

ٹھیک ہے، مولوی ابل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ اس نے تو زیب النسار سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا، اور زیب النسار نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی ابل ڈیوڑھی ہی سے پکارا " عارف کی ماں! "

زیب النساء بھاگی آئی " خدا خیر کرے . کیا ہوا ؟ چودھری کیسا ہے ؟"

" اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا " مولوی ابل بولا " عارف کی ماں ! سنو، مہرن بیٹی کیسی ہے ؟ "

زیب النساء چونکی " تمہیں کس نے بتایا ؟ "

" کب تک ہو گا ؟ " مولوی ابل آج تو آپے سے باہر ہو رہا تھا ۔

" بس اللہ چاہے گا تو آج کل میں " زیب النساء جھینپ کر بولی " پر تمہیں کس نے بتایا ؟ "

مولوی ابل تقریر کے سے انداز میں بولا " بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو ساس کے طعنوں تشنعوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں ۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لیے بہت سا ۔"

" اللہ کرے نواسہ ہو " زیب النساء نے مولوی ابل کی بات کاٹ دی ۔

" جو کچھ بھی ہو " مولوی ابل نے ٹوٹے تار کو جوڑا " ہم بچے کے لیے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ۔ ہمیشہ کے لیے ۔ ٹھیک ہے نا ؟ "

" کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے ؟ " زیب النساء نے پوچھا ۔

" توکل عارف کی ماں ، توکل " مولوی ابل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا ۔ " اللہ جل شانہ پر تکیہ کرو " خود مولوی ابل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا ۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقع اوڑھا ، عارف کو ساتھ لیا اور مہرن النساء کے

ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی "جاگ رہے ہو عارف کے ابّا!"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟" مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی۔ شمیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک ہو جائیگا"

زیب النسا نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ امّاں؟" زبدہ تڑپ کر بستر پہ اُٹھ بیٹھی۔

"ارے؟" مولوی ابل اور زیب النسا حیران رہ گئے، اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر جاگ اُٹھا۔ اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النسا کے پاس آیا "اب کیا ہوگا؟"

"چودھری کیسا ہے؟" زیب النسا نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہٗ ہی رحم فرمائے" مولوی ابل نے کہا۔

زیب النسا اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی ٹوپیاں اور سونے کے کنگنوں کو تو

جھونکو بھاڑ میں۔ میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چولا چھنی ہی بنوا لیں تو ناک رہ جائے۔ کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل؟" مولوی آبل سوچ میں پڑ گیا، اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا۔ "تمہاری عقل بھی تو ایڑی میں ہے۔ اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے سے لتے اور گہنے پلتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلّے بھی جہیز میں دے ڈالے آخر ایک بھو کے مرچھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا، وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لئے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں، اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا۔"

"بکنے کیوں لگے؟" زیب النساء بھی غصے میں بولی۔ "کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ مٹکاتی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آ جاؤں، لعنتوں کی گٹھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا۔ جینا اجیرن ہو جائیگا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی، آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زبدہ اور شمسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائیگا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اُگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں" مولوی آبل طیش میں آ گیا۔ "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا

کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے ؟ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں ؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں "۔ مولوی ابل باہر چلا گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر واپس آجائے گا۔ مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی اور زبدۃ النساء اور شمس النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی۔ اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی، اور زبدہ اور شمس اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے انکا تعاقب کیا مگر مڈھ بھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا، فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا۔ "ادھر آؤ "

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب مولوی ابل موم ہو چکا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے ؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خالی ہاتھ؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو" زیب النساء بولی "کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا؟"

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے۔ تھکے ہوئے لہجے میں بولا "ابوالبرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں مجھے سب

لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سو کے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لیے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کالے بے کور رہوں گا۔"

زیب النسا بڑی مہارت سے اُمڈے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی "چودھری کیسا ہے؟"

"وہیں جاتا ہوں" مولوی آبل نے جماہی لے کر کہا "ذرا سا بھی اچھا ہوا تو جہرن کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہ کوئی سبیل پیدا کر دے"

مولوی آبل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النسا نے بُرقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا۔ اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبدہ اور شمس نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی۔ "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النسا یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار ــــ

انتظار ــــ

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے، اور ماں چڑیا کے اُڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی آبل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا ہوا ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا "عارف کی ماں، اے عارف کی ماں"

زیب النسا باہر لپکی اور اس کے پیچھے زبدہ، شمس، عارف، قمرن، عمدہ اور دوسرے بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انہیں اُٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی ابل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلّایا" مبارک ہو عارف کی ماں! تم ذرا سے کے چولے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہٗ نے چولے، بچھی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اُٹھے گا —— چودھری فتح داد مرگیا ہے نا۔"

زیب النسا نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دو ہتّڑ مارا کہ بچّے دہل کر رو دیئے۔ اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے۔ اس کی اُوپر اٹھی ہوئی پُتلیاں بہت اُوپر اُٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سنّاٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلّا چلّا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیا تھا۔ چلّا چلّا کر رونے لگا اور بچّوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔

حرف و حکایت

(پندرہ برس کے کالموں میں سے صرف پانچ مہینوں کے کالموں کا انتخاب)

(١)

ایک مقامی معاصر کی حالیہ اشاعت میں جناب نعیم صدیقی صاحب نے (جو غالباً مشہور نعیم صدیقی ہیں اور اس لیے خود بھی ایک اُمیدوار ہیں) ایک مضمون کی صورت میں امیدواروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ انتخابات میں کھڑے ہونے کا قدم اُٹھانے سے پہلے آپ ہی اپنا جائزہ لیں۔ اور تنہائی میں اپنے آپ سے مُلاقات کریں۔ ایک صاحب نے جو نعیم صدیقی صاحب کے مدّاح معلوم ہوتے ہیں اور انتخابات میں اُمیدوار ہیں نعیم صاحب کے مشورے پر فوراً عمل کیا ہے اور تنہائی میں اپنے آپ سے اپنی مُلاقات کی کارروائی قلم بند کر کے دوسرے اُمیدواروں (بشمول نعیم صدیقی صاحب) کو عبرت پکڑنے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ یہ کارروائی ذیل میں من و عن درج ہے۔

اِس زمانے میں تنہائی خالص اشیائے خوراک کی طرح ناپید ہو چکی ہے مگر میں نے بیوی کو بچوں سمیت میکے بھیج دیا۔ نوکر کو چھٹی دے دی۔ کتے کو گھر سے نکال دیا اور جب

رات کے ایک ڈیڑھ بجے سینما کا آخری شو دیکھ کر گھروں کو واپس جانے والے گھروں کو واپس چلے گئے۔ تو مجھے زندگی میں پہلی بار کامل تنہائی سے سابقہ پڑا۔ پہلے تو مجھے ڈر سا لگا۔ اپنا ہی گھر اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ کونوں کھدروں میں بھتنے آنکھ مارتے نظر آنے لگے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ میں سچ مچ کی تنہائی محسوس کرنے لگا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے آپ کو اپنے اندر سے نکالا۔

میں جب اپنے اندر سے نکلا تو قسم لے لیجئے، اپنے آپ کو پہچان ہی نہ سکا۔ میں خاصا خوش شکل اور خوش پوش آدمی ہوں۔ مگر جب میں نے اپنے آپ کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو ایسا لگا جیسے میرے گھر میں کا تنگا کا صدر شو تمبے گھس آیا ہے۔ اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہا ہے، جیسے میں لومبا ہوں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو بڑی نرمی کے ساتھ کرسی پہ تشریف فرمانے کو کہا تو میرا اپنا آپ آگے بڑھا اور مجھے کرسی پر سے اٹھا کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا میں نے جھجکتے ہوئے اپنے آپ سے کہا: "کمرے میں اور کرسیاں بھی تو رکھی ہیں" اور وہ یعنی میں بولا "کسی شخص سے کرسی خالی کرا کے اس کرسی پر قبضہ کرنے میں جو مزا ہے وہ کسی خالی کرسی پر بیٹھنے میں کہاں۔"

ناچار میں ایک خالی کرسی پر اپنے آپ کے مقابل بیٹھ گیا۔ اور عرض کیا "میں انتخابات میں کھڑا ہو رہا ہوں۔ بس لیے میں نے نعیم صدیقی صاحب کے مشورے کے مطابق آپکا جائزہ لینے اور آپ سے ملاقات کرنے کے لیے آپ کو اپنے آپ کے خلوت کدے میں سے نکلنے کی تکلیف دی ہے۔ آپ کی صورت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ غالباً گزشتہ کئی برس سے سو رہے تھے۔

اور آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ میں آپ کو کہاں کہاں لیے پھرتا رہا۔ بہرحال، یہ بتایئے کہ مزاج اچھے ہیں آپ کے؟" سامنے کی کرسی پر میرا اپنا آپ مجھ پر مسکرایا اور بولا "معاف کیجئے گا، سوتو آپ رہے تھے اور اس دوران میں آپ کی نکیل میرے ہاتھ میں رہی۔ اب آپ الکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ تو بتایئے آپ، کو کس نے کھڑا کیا ہے۔ میں نے ہی تو کھڑا کیا ہے۔ دوسروں کو تو یہی بتایئے گا کہ قوم نے مجبور کیا ہے تو کھڑا ہوا ہوں لیکن یاد رکھئے کہ ان معنوں میں صرف میں ہی آپ کی "قوم" ہوں"۔

میں نے چند لمحوں کے لئے غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا اپنا آپ مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ بہرحال اس سلسلہ عمل کو مکمل کرنے کے لئے میں نے عرض کیا "مجھے کوئی مشورہ دیجئے"۔ میرا اپنا آپ بولا "میں نے ہی آپ کو کھڑا کیا تھا۔ اب آپ نے مجھے اپنے آپ میں سے نکالا اور مجھے روشنی دکھائی ہے تو اب میں ہی آپ سے کہتا ہوں کہ بیٹھ جایئے۔ اس لئے کہ آپ بجائے اپنے وطن پاکستان اور اپنے ہم وطن پاکستانیوں کے مفاد کے، اپنی برادری اور اپنے دھڑے کے مفاد کی باتیں کرنے لگے ہیں اور یہ باتیں نئی نہیں ہیں بلکہ پاکستان کے ابتدائی گیارہ برس کی سیاسی تاریخ انہی باتوں نے بنائی ہے۔" میں نے عرض کیا "یہ تو آپ نے بڑی مایوس کن بات کی۔ میرا تو مصمم ارادہ ہے کہ کھڑا رہوں"۔ اس پر میرا اپنا آپ بولا "کھڑے رہنا ہے تو کھڑے رہیئے۔ لیکن خدا را مجھے نہ چھیڑیئے۔ کیوں کہ اگر آپ کا انتخابی منشور ایک خاص برادری اور ایک خاص دھڑا ہے تو آپ میں اور آپ کے اپنے آپ میں شدید اختلافات ہیں۔ آپ الکشن لڑیئے اور

مجھے جو آپ کا ضمیر ہوں۔ آرام سے سونے دیجئے"۔ اس کے بعد میں اپنے آپ میں آگیا۔ اور مجھے اپنے اندر اپنے ضمیر کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔

۱۰۔ اپریل ۱۹۶۲ء

(۲)

اگر لاہور کا اوپن ایر تھیٹر "بس" ہوتا تو اندرانی رحمان کے رقص کی رات کو ٹریفک پولیس اس کا چالان کر چکی ہوتی۔ تماشائی ایک دوسرے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں یوں ٹھنسے ہوئے تھے کہ اگر اس انداز سے بھیڑ بکریوں کو ٹھونس دیا جائے تو انہیں حرام ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ ہی لگے۔ لوگ یہاں یک جان و ہزار قالب ہو کر رہ گئے تھے کہ سب سے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے راجہ غضنفر علی خاں کو چھینک آئی تو سب سے آخری صف میں بیٹھے ہوئے "عنقا" نے جیب سے رومال نکال لیا۔

بظاہر تو اندرانی رحمان نے میوزک کانفرنس کے زیر انتظام اہل لاہور کو محظوظ کیا لیکن دراصل انہوں نے اس کانفرنس کے "زیر بد انتظامی" محظوظ کرنے کی کوشش کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ بہت "بدحظ" ہوئے۔ حق بات یہ ہے کہ میوزک کانفرنس کے انتظامات میں "میوزک" کی شدید کمی تھی۔ ایسا بے سرا اور بے تالا انتظام تھا کہ جو لوگ بیٹھنے کے لئے "کوشن" لیکر آئے تھے وہ کھڑے رہ گئے تھے اور "کوشن" ان کی بغلوں میں سوار تھے یا سروں پر بیٹھے تھے۔ بیوی بچے کو اٹھائے اٹھائے تھک گئی، تو شوہر بولا۔ "لایئے

بچہ میں اٹھائے لیتا ہوں، آپ کوشن اُٹھا لیجئے۔"

اگر پچاس نشستوں والی بس کے لیے ایک سو ٹکٹ جاری کر دیئے جائیں تو ظاہر ہے کہ سواری کو سواری پر سواری کرنی پڑے گی۔ مگر اس روز ہم نے دیکھا کہ بڑے بڑے ثقہ لوگ اوپن ایئر تھیٹر کے نشیب و فراز میں یوں حواس باختہ گھوم رہے ہیں جیسے وہ باغِ جناح کے بجائے خانقاہ ڈوگراں میں پہنچ گئے ہیں۔

جو لوگ اینٹوں کی "سیٹوں" پر بیٹھ گئے تھے وہ تو بیٹھ ہی گئے تھے مگر اس کے بعد لوگ مٹی پر بیٹھے، گھاس پر بیٹھے۔ حد یہ ہے کہ پودوں اور پیڑوں تک پر بیٹھے۔ ایک صاحب تو بے خیالی میں اَدھ جلے سگرٹ پر بیٹھ گئے۔ پھر جب آگ نے ان کی پتلون کی فصیل چاٹ کر ان کے گوشت پوست پر حملہ کیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور کتھک انداز میں کودنے لگے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بڑی مشکل سے کوکا کولا کی ایک بوتل فراہم کر کے ان کی پتلون پر انڈیلی تو یہ آگ بجھی ورنہ تاثیر کے اس مصرعے کی سی کیفیت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ؎

بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

ہم میوزک کانفرنس کے قدرداں ہیں، مگر اس ذہنیت کے قطعی طور پر قدرداں نہیں ہیں کہ ٹکٹوں کی فروخت کے سلسلے میں ☆

کھیتوں کو دے لو پانی ، اب بہہ رہی ہے گنگا ،

پر عملدرآمد شروع کر دیں اور تماشائیوں کی بھیڑ کا یہ عالم ہو جائے کہ فوٹوگرافر اندرانی رحمان کی تصویر اتارنے لگے تو کسی کی کہنی لگنے سے میوزک کانفرنس کے مہتمم حیات محمّد خاں کی تصویر اتر آئے ، اور راجہ غضنفر علیخاں کو فوکس میں لایا جا چکا ہو اور بٹن دبنے والا ہو کہ اچانک ایک دھکا لگے اور کیمرے کے " پردہ فلم " پر راجہ صاحب کا صرف طرّہ ہی منعکس ہو کر رہ جائے ، اور سب سے بڑا ستم یہ کہ لوگ یہ کہتے ہوئے تماشاگاہ سے اٹھیں کہ اگر اندرانی رحمان کا رقص دیکھنے کی بجائے تکے کباب کھا لیئے جاتے تو کتنا اچھا رہتا ۔

۱۸-اپریل ۱۹۶۲ء

(۳)

قدیم لاہور کا سراغ لگانے کے لیئے یوں تو ماہرینِ آثارِ قدیمہ زمانۂ قدیم سے بے تاب ہیں- مگر فی الحال صرف اس امر پر اتفاق ہو سکا ہے کہ قدیم وقتوں میں بھی لاہور آباد تھا- البتہ اس نکتے پر زمانہ قدیم سے بحثیں ہو رہی ہیں کہ کہاں آباد تھا- کوئی کہتا ہے کہ قدیم لاہور بھی وہیں آباد تھا جہاں جدید لاہور آباد ہے- کوئی کہتا ہے کہ جدید لاہور میں تو مصری شاہ بھی شامل ہے اور آج جہاں لاہور کا محلہ مصری شاہ آباد ہے وہاں قدیم زمانے میں وہ راوی بہتا تھا جو جدید زمانے میں کامران کی بارہ دری کا محاصرہ کیئے ہوئے ہے -

---

ماہرین کا کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنا مہارت کے منافی ہے- اس لیئے یقین سے کوئی

نہیں کہہ سکتا کہ قدیم لاہور کہاں آباد تھا۔ اہستہ پچھلے دنوں خود لاہور کی قدامت کو غصہ آگیا تو اور جب شاہی قلعے میں قدیم لاہور کا کھوج لگانے کے لیۓ ایک ٹیلے کی کھدائی ہو رہی تھی تو یہ عجیب وغریب اتفاق ہوا کہ کدال کی چوٹ تو قلعہ لاہور کی زمین پر پڑی تھی مگر اس چوٹ کے زور سے مٹی کی ایک مورتی حویلی دھیان سنگھ کی زمین میں سے اُچھل پڑی تھی۔ بہرحال یہ مورتی ماہرین آثارِ قدیمہ کے اس یقین کو پختہ تر کر گئی کہ زمانۂ قدیم میں بھی قدیم لاہور آباد تھا اور یقین سے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہیں کہیں آباد تھا۔

اگر قلعہ کی کھدائی جاری رہتی تو حویلی دھیان سنگھ سے کچھ اور مُورتیاں بھی برآمد ہو سکتی تھیں۔ بلکہ اس زمانے میں تو یہ افواہ بھی گرم ہوئی تھی کہ قلعہ گوجر سنگھ میں کوئی خزانہ دفن ہے۔ کیونکہ جب شاہی قلعہ کی زمین پر کدال پڑتی تھی تو قلعہ گوجر سنگھ کے باشندوں کو اپنے قدموں تلے اشرفیوں کا چھنا کا سنائی دیتا ہے۔ مگر یہ کھدائی رُک گئی بلکہ ہمارے خیال میں تو طیش میں آکر روک دی گئی۔ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ کدال تو شاہی قلعے میں چلے اور مورتی صاحبہ حویلی دھیان سنگھ میں نمودار ہو پڑیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کھانا تو ہم کھائیں اور پیٹ ہمارے پڑوسی کا بھر جائے۔

یہ کھدائی کئی مہینے تک رُکی رہی حتیٰ کہ حال ہی میں اعلان ہوا ہے کہ قدیم لاہور کا کھوج لگانے کے لیۓ شاہی قلعہ میں جو چالیس فٹ گہری خندق کھودی گئی تھی اسے پاٹ دیا جائے گا اور اسے پاٹ دیئے جانے کے بعد بھی قدیم لاہور کی تلاش جاری رہے گی۔ بس ذرا سا سرمایہ

میسر آجاتے تو لاہور کارپوریشن کے حدود میں کسی اور ٹیلہ پر بلڈ بولا جائیگا۔ المختصر لاہور کا بو بھی مقام ذرا سا ابھرا ہوا ہے۔ اس کی کم بختی آگئی۔ ماہرین کو علم نہیں کہ کونسا ٹیلا لاہور کا صدر دروازہ ہے۔ اس سلئے ہر ٹیلے کی "ٹیل سے ٹیل" بجا دی جائے گی۔ البتہ شملہ پہاڑی کے آس پاس رہنے والوں کو متفکر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شملہ پہاڑی کے نیچے تو قدیم شملہ آباد ہے۔

چالیس فٹ گہری خندقوں کو پاٹنے کا فیصلہ کرنے والوں نے ڈیڑھ مہینے تک زمین کو کاٹنے کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ کھدائی بے کار نہیں رہی (اگرچہ کھدائی یہاں ہوئی اور مٹی کہیں اور سے نکلی مگر) اس کھدائی میں نصف درجن کے قریب تہیں مشاہدے میں آئیں۔ اور ان تہوں کو ماہرین آثار قدیمہ نے برطانوی، سکھی، مغل اور ان سے پہلے کی تہذیبی تاریخ کے اوراق کا نام دیا ہے ——— ماہرین کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ آپ چاہے تھل میں جا کر چالیس فٹ کی خندق کھودئیے، چاہے تھرپارکر میں، یہ تہیں ہر جگہ مشاہدے میں آئیں گی۔ یعنی آپ ان تہوں کو وہاں بھی دیکھ سکیں گے جہاں سے قدیم لاہور سیکڑوں کوس کے فاصلے پر آباد تھا۔ یہ تہیں تاریخ کے اوراق نہیں ہیں، جغرافیے کے اوراق ہیں۔

ماہرین نے تہوں کے مشاہدے کا ذکر ان معنوں میں کیا ہے کہ انہوں نے کچھ بھی مشاہدہ نہیں کیا۔ اپنے فیصلے کی غلطی کو چھپانے کے لئے انہوں نے تہوں کے مشاہدے کی بات چلائی ہے اور یہ بات بالکل حلوا بورہ کی کھوپڑی کے مشابہ ہے۔ آثارِ قدیمہ کا ایک دکان

میں ایک کھوپڑی رکھی تھی۔ ایک شخص نے دکان دار سے اس کے بارے میں پوچھا تو دکان دار بولا "یہ قلوپطرہ ملکہ مصر کی کھوپڑی ہے" پوچھنے والا دم بخود رہ گیا کیونکہ کھوپڑی بالکل چھوٹی سی تھی۔ آخر اس نے پھر پوچھا۔ "مگر یہ کھوپڑی تو بہت چھوٹی ہے"۔ دکاندار کوئی ماہر آثارِ قدیمہ تھا۔ فوراً بولا۔ "جی ہاں چھوٹی تو ہے اور اسی لئے چھوٹی ہے کہ یہ قلوپطرہ کے بچپن کی کھوپڑی ہے"۔

۲۹۔ اپریل ۱۹۶۲ء

(۳)

ہمیں پان سے یا پان کھانے والوں سے کوئی کد نہیں۔ ہمیں صرف پان کھانے کے سلیقے اور پان کی پیک تھوکنے کے طریقے سے غرض ہے جو انسان چاند پر جھپٹ رہا ہے اسے اگر اب تک تھوکنے کی تہذیب نہیں آئی۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ چاند پر تھوک رہا ہے اور کاش چاند ہمیشہ لوگوں کے سر پر رہتا، تاکہ چاند کا تھوکا سیدھا ان کے منہ پر آتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ چاند زمین کی طرح گردش میں ہے وہ ہمیشہ سر پر نہیں رہتا۔ اسی لئے پان کھانے والوں کا تھوکا عموماً راہ چلتوں کے منہ پر آتا ہے۔

لاہور کی پندرہ لاکھ کی آبادی میں سے اگر صرف ایک لاکھ افراد ہی پان کھاتے ہوں تو یہ تعداد بھی اس لحاظ سے پتہ پانی کر دینے کے لئے کافی ہے کہ اگر آپ گھر سے اٹھ کر سڑک پر آ گئے ہیں تو پان کی ایک لاکھ پیکیں آپ کے تعاقب میں ہیں جس طرح موت کا کوئی اعتبار نہیں کہ آپ کو کب دبوچ لے۔ اسی طرح پان کی پیک کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ وہ

آپ پر کہاں سے جھپٹ پڑے بلکہ کہاں کہاں سے جھپٹ پڑے۔ بصداق یک نظم جدید ے

وہ سائیکل ہو کہ بس ہو کہ اُدھ کھُلی کھڑکی،

جو لوگ سڑکوں پر پیک نہیں تھوکتے بلکہ گھر سے تھوک تھاک کر نکلتے ہیں ان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہمت افزا نہیں ہے۔ دیوان خانے کے عین وسط میں رکھے ہوئے اُگالدان میں ہاتھ کی آڑ بنا کر تھوکنا تہذیب میں شامل سمجھا جاتا ہے لیکن جب مُنہ سے نکلتی ہوئی پیک کی پڑاچ اور اُگالدان میں گرتی ہوئی پیک کی پیڑ ایچ آس پاس بیٹھنے والوں کو سُنائی دیتی ہے تو طبیعت پر جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ کیا متلی کے لئے کافی نہیں ہے؟۔

ہمارا مقصد محض یہ ہے کہ پان کھانے کے اصُول و آداب مرتب کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے شراب پینے والوں کے لئے ضوابط مقرر ہیں جس طرح شراب پی کر برسرِعام گڑبڑ مچانے والے کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اسی طرح راہ چلتے پان کھانے یا کم سے کم راہ چلتوں پر تھوکنے ہی کو قابلِ دست اندازیِ پولیس جرم قرار دینا چاہئے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے کہ اگر ہم پٹری پر جارہے ہیں، تو ہمیں خطرہ دامنگیر ہے کہ ممکن ہے کوئی اوپر کھڑکی میں سے یا سامنے دروازے میں سے، آگے جانے والا پلٹ کر، پیچھے آنے والا جھک کر، بس کی کھڑکی میں سے کوئی سر نکال کر، سائیکل پر جانے والا گردن کو ذرا سا خم دے کر خوف ناک طول وعرض کی پیک تھوک دے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اسی کو تو کہتے ہیں۔

ہندوستان کا ایک صوبہ راجستھان ہے۔ پچھلے دنوں وہاں کی اسمبلی میں نائب وزیرِتعلیم تقریر کر رہے تھے تو ایک جن سنگھی ممبر نے اعتراض کیا کہ وزیرِ صاحب کی تقریر ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے اس لئے کہ وہ بول بھی رہے ہیں، اور پان بھی کھا رہے ہیں اور پیک کو بھی سنبھال رہے ہیں اور ڈلی کو بھی چبا رہے ہیں۔ اس پر اسمبلی کے اسپیکر نے ایک رولنگ دیا کہ پان کھانے سے ایوان کی ہتک نہیں ہوتی۔ البتہ اگر دوسرے ممبر محسوس کریں کہ اس طرح ان کی ہتک کی جارہی ہے تو وہ معترض ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے اپنے منہ میں گلوری نہ ہو۔ اس پر ہمیں اپنے ہی ایک شاعر یاد آگئے جو مشاعرے میں شعر پڑھنے آئے تھے مگر شعر پڑھنے کی بجائے پان کھانے لگے۔ البتہ جب شعر پڑھنے کا وقت آیا تو وہ مائیکروفون کے سامنے آکر پان چبانے لگے۔ حاضرین نے غزل کا مطالبہ کیا تو دائیں کلے کا پان بائیں کلے میں اور بائیں کا دائیں میں منتقل کر کے مطلع کا پہلا مصرعہ پڑھا ؏

ہم تیری گلی میں آ گئے ہیں،

دوسرا مصرع پڑھنے سے پہلے وہ پھر سے پان چبانے لگے تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے سارے مشاعرے کو مطلع کیا کہ ؏

یہ پان زیادہ کھا گئے ہیں

۲۴۔ مئی ۱۹۶۲ء

(۵)

لاؤس بہت دنوں سے عالمی سیاسیات کا اعصابی مرکز بن رہا تھا۔ لیکن امریکہ نے

جب سے تھائی لینڈ میں اپنے فوجی اتارے ہیں ۔ یہ ملک مغربی سیاست کے نقطۂ نظر سے یکایک مسئلہ برلن کی سی اہمیت اختیار کر گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کم سے کم امریکنوں کو تو لاؤس کے محل وقوع سے باخبر ہونا چاہئیے ۔ کیونکہ ایک تو امریکہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ۹۹ ½ فی صد بتائی جاتی ہے ۔ دوسرے امریکہ ایک جمہوری ملک ہے جس کی تمام حکمت عملیاں جمہور کے ذہن کی آئینہ دار ہوتی ہیں ۔ مگر تین چار روز پہلے امریکی اخبارات نے جب امریکہ کے بعض جمہور سے لاؤس کے بارے میں پوچھا تو ان کا جواب کچھ اس قسم کا تھا ؏

نام کیا لوں ، کوئی اللہ کا بندہ ہو گا ،

اخبارات کی اس پوچھ گچھ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امریکہ کے بیشتر شہری یہ بھی نہیں جانتے کہ لاؤس نام کا کوئی ملک ہے بھی یا نہیں ۔ اور اگر ہے تو کہاں ہے اور اگر نہیں ہے تو امریکن فوجیں اس کے پڑوس میں کیسے اتر سکتی ہیں ۔ البتہ ایک صاحب نے تھائی لینڈ کے بارے میں یہ ضرور بتایا کہ جس زمانے میں اس ملک کا نام سیام تھا تو وہاں مشہور فلم "اینا اینڈ دی کنگ آف سیام" فلمائی گئی تھی ۔ یہ جواب بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک طالب علم نے کتابیں کم پڑھی تھیں اور فلمیں زیادہ دیکھی تھیں ۔ ایک بار جب ممتحن نے اس سے پوچھا کہ شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ کا نام کیا تھا تو طالب علم نے سہراب مودی کی مشہور فلم "پکار" کے حوالے سے فوراً جواب دیا تھا "پری چہرہ نسیم"

ایک امریکی نے تو حد کر دی ، جب اس سے لاؤس کا پوچھا گیا تو وہ بولا " میں کیا جانوں ، وغیرہ"

غیر جانب دار ہوں" لیکن شاید دنیا کے سب غیر جانبدار عالمی جغرافیے سے بے خبر ہوتے ہیں۔
مدراس کے ایک لالہ جی سے پُوچھا گیا تھا کہ ناگالینڈ کہاں واقع ہے تو انہوں نے نقشے میں امرتسر پر انگلی رکھ دی تھی اور ماسٹر تارا سنگھ کو دنیا کا سب سے بڑا ناگا قرار دے ڈالا تھا۔ ان غیر جانب داروں کو اس غیر جانب دار سے سبق حاصل کرنا چاہیئے جس نے دو افراد کی اس بحث میں حصّہ لیکر کہ درخت پر گُگھی (مادہ فاختہ) بیٹھی ہے یا گُگھا (نر فاختہ) بیٹھا ہے، یہ کہہ کر اپنا غیر جانبدارانہ کردار کمال دُور اندیشی سے ادا کیا تھا کہ" اس کے سامنے دانے ڈال دیجئے چُگنے لگی تو گُگھی ہے اور چُگنے لگا تو گُگھا ہے"۔

ایک اور امریکی نے لاؤس کے بارے میں اپنی بے خبری کا جواز پیش کرتے ہُوئے کہا کہ آخر مجھے کیا معلوم جبکہ میں نہ اخبار پڑھتا ہوں، نہ ریڈیو سنتا ہُوں اور نہ ٹیلیویژن دیکھتا ہُوں۔ ایک لحاظ سے یہ امریکی دُور اندیش ثابت ہوا کیونکہ اگر وہ اپنے تعلیمیافتہ ہونے کا بھرم رکھنے کے لئے یہ کہہ بیٹھتا کہ لاؤس کیوبا کا دارالحکومت ہے تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ یہ امریکی ہمارے ہاں کے ان میٹرک، ایف اے اور بی اے پاس نوجوانوں سے کہیں زیادہ تیز نکلا جنہوں نے پچھلے دنوں کشتیا کے سپرنٹنڈنٹ ٹیلی گراف کے دفتر میں چند اسامیاں پُر کرنے کے لئے انٹرویو دیئے۔ اور ایسی ایسی معلومات فراہم کیں کہ اگر معلومات جاندار ہوتیں تو مارے غصّے کے سنکھیا پھانک لیتیں۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ (پاکستان کے وزیرِ محنت) جنرل ببکی ایران کے بادشاہ

ں۔ دوسرے نے نامور برطانوی ڈرامہ نگار برنارڈ شا کو آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم کا کپتان قرار دیا۔
ےرے نے "بی بی سی" کا مطلب "ببل کیشن" بتایا۔ چوتھے نے عالمی فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن
بف اے او" کی وضاحت فرنچ آرمی آرگنائزیشن کے الفاظ سے کی اور پانچویں نے ایسوسی
ڈ پریس آف پاکستان "اے پی پی" کو پھیلایا تو نتیجہ "آرمی پے ایبل پوسٹ" کی صورت میں نکلا۔
مد کی اطلاعات ہیں کہ ایک امیدوار نے حفیظ جالندھری کو ایک نئے "بل ڈوزر" کا نام بتایا اور
رے نے اسکندر مرزا کے بارے میں انکشاف کیا کہ وہ راجہ پورس کا دوست تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ ان امیدواران کرام نے اپنے سمندِ تخیل کو مزید ایڑ نہیں لگائی ورنہ
ہمیں یہ کہنے سے کون روک سکتا تھا کہ جنرل برکی ایک مشہور برقی کمپنی سے تعلق رکھتے ہیں -
رنارڈ شا دراصل "سید برلا شاہ" کا انگریزی تلفظ ہے۔ اور کومیلا میں سید صاحب کا مقبرہ آج بھی
رجع خواص و عام ہے۔ "بی بی سی" پنجابی کا ایک کلمہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ایک
بی بی تھی" (کل کے ایک مقامی معاصر نے بی بی سی کی "سی" کھا لی اور ایک خبر کی سرخی یوں
جمائی "بی بی کرکٹ کومنٹری نشر کرے گی"۔) "ایف اے او" بھی پنجابی کلمہ ہے اور اس کا
مطلب یہ ہے کہ کیوں بھئی تم ایف اے پاس بھی ہو کہ نہیں؟ رہی "اے پی پی" تو یہ "اے پبلک
پراسیکیوٹر" کا مخفف ہے جس کا مطلب ایک سرکاری وکیل ہے۔ حفیظ جالندھری کا مطلب
جالندھر کا حفیظ ہے اور اسکندر مرزا "مرزا صاحباں" کا فارسی ترجمہ ہے۔

---

۲۶ مئی ۱۹۶۲ء

(۶)

محکمۂ تعلیم طالب علموں کو گرمیوں میں چھٹیاں دینے کی بجائے گرمیوں کی یاد میں چھٹیاں دیتا رہا ہے ۔ گرمیوں کی چھٹیوں کو اس وقت شروع ہونا چاہئے جب گرمیوں کا عروج شروع ہوتا ہے۔ مگر چھٹیاں اس وقت شروع ہوتی رہی ہیں جب گرمیوں کا زوال شروع ہوتا ہے ۔ بجائے اس کے کہ بچے گرمیوں میں چھٹیاں منائیں اور برسات میں اسکول کھل جائیں ۔ اسکول گرمیوں میں کھلے رہتے ہیں اور بچے برسات کی چھٹیاں مناتے ہیں ۔

گذشتہ سال محکمے نے گرمیوں کی چھٹیوں کا آغاز گرمیوں کے آغاز سے کر دیا تھا ۔ اور جب اس سے پوچھا گیا تھا کہ آپ خلافِ عادت چھٹیاں دس جون سے کیوں شروع کر رہے ہیں ۔ تو جواب ملا تھا کہ بچوں کے والدین نے یہی مطالبہ کیا ہے ۔ ہمارا خیال تھا کہ اب یہ سلسلہ چل نکلا ہے کیونکہ بچوں کے والدین صرف ایک سال کے لیے بچوں کے والدین نہیں ہوتے ۔ مگر اب کے چھٹیاں ایک مہینے کے لیے ملتوی کر دی گئی ہیں ۔ حالانکہ گرمیاں ملتوی نہیں ہوئی ہیں ۔

نہ جانے وہ کون خاص الخاص والدین تھے جن کی درخواست کو ۱۹۶۱ء میں شرفِ قبولیت بخشا گیا تھا اور نہ جانے ۱۹۶۲ء میں وہ والدین اپنے بچوں سمیت مری کوئٹہ اور ایبٹ آباد جا بسے ہیں یا ان کے گھروں میں فی الحال جون شروع نہیں ہوا ۔ لکھنؤ سے ایک بزرگ نے لاہور میں اپنے

عزیزوں کو لکھا تھا کہ لکھنؤ میں تو مئی کا مہینہ نذرِ تپش ہو گیا ہے۔ وہاں لاہور کا کیا حال ہے؟) عام بچوں کے والدین کا مطالبہ تو اب بھی یہی ہے مگر عام بچے خاص الخاص والدین کہاں سے لائیں؟

گذشتہ سال جب گرمیوں کی چھٹیاں گرمیوں میں کر دی گئی تھیں تو بعض سرپھرے یہ کہتے پائے گئے تھے کہ ایسا کر کے محکمۂ تعلیم نے والدین کا مطالبہ منظور نہیں کیا بلکہ اِنہی کی ایک ضرورت پوری کی ہے۔ وہ اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کرتے تھے کہ محکمے نے نئے تعلیمی سال کے لیے نئی نصابی کتابوں کا وعدہ کیا تھا جو دس جولائی تک بھی پورا ہوتا نظر نہ آیا تو دس جون کو چھٹیاں شروع کر دی گئیں تاکہ دس اگست تک وعدہ پورا کرنے کا اہتمام کر لیا جائے۔

ہم نے اس افواہ پر کان نہیں دھرے تھے اور محکمے کے بیان کردہ سبب پر یقین کر لیا تھا۔ مگر اب کے چھٹیاں پھر سے حسبِ معمول ہونے لگی ہیں تو خیال آیا ہے کہ وہ سرپھرے سچے تھے بصورتِ دیگر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس سال والدین کے مطالبے کو نظرانداز کر دیا جائے جبکہ سوائے اِس کے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی کہ گزشتہ سال کے مقابلے میں محکمے، والدین اور بچوں کی عمروں میں ایک ایک سال کا اضافہ ہو گیا ہے اور ایک سال کے اضافے سے بھی محکمہ محکمہ، والدین والدین اور بچے بچے ہی رہتے ہیں۔

جون کی اس چلچلاتی گرمی میں جب درجۂ حرارت نقطۂ اوج پر ہوتا ہے۔ بچے اسکولوں

سے گھروں کی طرف یوں آتے ہیں جیسے غالبؔ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

انجمن انسدادِ بے رحمی جانوراں نہ جانے کہاں ہے ورنہ ہم اس سے التجا کرتے کہ کچھ دنوں کے لئے بچوں کو بھی جانوروں میں شامل فرما لیجئے تاکہ ان کے خلاف بے رحمی کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ مئی کے شروع میں انجمن انسدادِ بے رحمی جانوراں کی جنرل سیکرٹری بیگم جلیل اصغر صاحبہ کو ان کے اپنے پالتو کتے نے بڑی بے رحمی سے کاٹ لیا تھا۔ خدا کرے وہ اب تک تندرست ہو چکی ہوں اور بچوں کو عارضی طور پر جانور قرار دیکر کچھ کر دکھائیں۔

۱۳- جون ۱۹۶۲ء

(۷)

کچھ عرصہ پہلے خبر آئی تھی کہ سکھر میں گزشتہ کئی سال سے کئی لاکھ روپے کی مشینیں بیکار پڑی ہیں۔ یہ مشینیں برطانیہ نے ٹیکسٹائل کی تربیت کے لئے پاکستان کو مہیا کی تھیں مگر استعمال میں نہیں لائی جا سکیں اس لئے پڑی زنگ کھا رہی ہیں۔ ہم نے اس خبر کو سچ ماننے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ جس ملک کے اخبارات کے نامہ نگاروں سے مرغی کے ایک انڈے میں سے تین چوزے پیدا ہونے کی خبریں نہیں بچ سکتیں۔ ان کی نظر سکھر میں کئی سال سے رکھی ہوئی لاکھوں کی مشینری سے کیسے چوک سکتی ہیں۔

پھر ہم نے یہ بھی سوچا تھا کہ ممکن ہے مشینیں جو بظاہر بے کار پڑی ہیں، بباطن ٹیکسٹائل

کی تربیت ہی کے کام آرہی ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے انسانوں کی بجائے مکڑیاں فائدہ اٹھارہی ہیں ۔ آخر مکڑیوں کی بھی تو اپنی ٹیکسٹائل انڈسٹری ہے بلکہ اس ضمن میں مکڑی انسان سے بھی اشرف ہے کہ اس کا ہر فرد جہاں چاہتا ہے اپنا ٹیکسٹائل کا کارخانہ قائم کر دیتا ہے ۔ ممکن ہے ان مشینوں پر مکڑیاں جالے تاننے کی مشق کر رہی ہوں اور اس وقت تک کسی خاص نتیجے تک نہ پہنچیں جب تک زنگ مشینوں کو اس حد تک نہ چاٹ لے کہ مشین پر کوئی چڑیا بھی آکر بیٹھے تو سارا ڈھانچہ چٹاخ پٹاخ ہو کر ٹوٹ جائے ۔

مگر گزشتہ دو تین دنوں کے اندر قومی اسمبلی کے چند معزز اراکین نے اسی نوع کی کچھ ایسی خبریں سنائی ہیں کہ ان کے مقابلے میں سکھر میں پڑی ہوئی مشینیں کھلونے معلوم ہونے لگی ہیں ۔ مثلاً لس بیلہ کے میر غلام قادر خاں نے بتایا ہے کہ آج سے دس برس پہلے لس بیلہ کے لیئے ٹریکٹر، بل ڈوزر اور تعمیرات میں کام آنے والی دوسری کئی مشینیں خریدی گئیں ۔ مگر لس بیلہ میں لائی گئیں اور قصہ ختم ہو گیا ۔ انہیں اب تک استعمال میں نہیں لایا گیا ۔ کسی کو یقین نہ آئے تو لس بیلہ میں حب ندی کے کنارے کنارے چلا جائے ۔ اسے ایک جگہ مشینری کے یہ کھنڈر پڑے ملیں گے جو زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں گے کہ :

.... دیکھ کے چل راہ بے خبر
ہم بھی کبھو کسو کے سرِ پُر غرور تھے ،

ادھر چودھری لیسال نے مطلع کیا ہے کہ پچالیہ میں (گجرات میں گجرات، کھاریاں، پچالیہ) پچھلے نو سال سے نو میل لمبی سڑک تعمیر ہو رہی ہے۔ مگر یہ سڑک جس طرح نو سال پہلے محتاج تعمیر تھی۔ اسی طرح آج بھی شرمندہ تعمیر نہیں ہو سکی۔ اسے تعمیر کرنے کے لیے ہر سال بجری اور اینٹوں کو کچی سڑک کے دونوں طرف بچھا دیا جاتا ہے مگر ہر سال سیلاب آتا ہے اور بجری اور اینٹوں کو بہا لے جاتا ہے اگلے سال پھر بجری کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں اور پھر سے سیلاب آجاتا ہے۔ رہا بجری بچھانے اور سیلاب آنے کا درمیانی وقفہ تو شاید اس وقفے کو اگلے سال کی بجری پر غور و فکر کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ اگلا سال آجاتا ہے۔

اب خان سیف اللہ خان نے قومی اسمبلی کو بتایا ہے کہ ان کے علاقے میں ایک کنوئیں کی رسم افتتاح ادا کی گئی تو اس رسم پر اتنی رقم صرف ہو گئی جتنی کنوئیں کی کھدائی پر صرف ہو چکی تھی۔ انہیں دو کنوؤں کے خرچ پر ایک کنواں بھی قبول تھا کیونکہ ان کے علاقے میں بھی "عنقا" کے علاقے کی طرح پینے کے پانی کی شدید قلت ہے۔ یہ کنواں آج بھی موجود ہے مگر اس میں اس نام کی کوئی چیز موجود نہیں جسے عرف عام میں پانی کہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب کنوئیں میں پانی ہی موجود نہیں تو رسم افتتاح کس کھاتے میں ادا ہو گئی، تو خود خان سیف اللہ خان راوی ہیں کہ محض رسم افتتاح کی خاطر اور کنوئیں میں پانی دکھانے کے لیے منتظمین کرام نے کسی دوسری جگہ سے چار گیلن پانی منگایا اور کنوئیں میں ڈال دیا تاکہ کنوئیں

میں ڈال ، رسم افتتاح ادا کرنے والوں کو کنوئیں کی تہ پر پانی کا تار نظر آیا تو انہوں نے تالی بجا دی۔ مگر جب وہ تشریف لے گئے تو پانی بھی تشریف لے گیا اور اب اس کنوئیں میں صرف کنواں باقی رہ گیا ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا :

کنواں بیچا ہے ، کنوئیں کا پانی نہیں بیچا

۲۷ - جون ۱۹۶۳ء

(۸)

پچھلے دنوں ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو دفتر خارجہ میں ایک لفٹ کے ذریعے اُوپر جا رہے تھے تو راستے میں ہی بجلی فیل ہو گئی۔ لفٹ لٹک کر رہ گئی اور اس کے ساتھ پنڈت نہرو بھی لٹک کر رہ گئے۔ بجلی بھی خاصی دیر تک لٹکی رہی۔ مگر جب آ گئی اور پنڈت نہرو اُوپر پہنچے تو بولے "بجلی کے فیل ہونے اور لفٹ کے معلق ہو جانے کی صورت میں بوریت سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ لفٹ میں کتابوں کی ایک الماری رکھی رہے"۔

لفٹ میں معلق ہو کر رہ جانے کا حادثہ پنڈت نہرو پر اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔ چند برس قبل وہ اپنی قیام گاہ کی لفٹ میں لٹکے رہ گئے تھے اور اس وقت بھی اُنہوں نے لفٹ میں لائبریری کھولنے کی تجویز پیش کی تھی۔ تجویز بُری نہیں لیکن اگر وہ بجلی کا نظام بہتر بنانے کی بجائے لائبریری کھولنے کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں تو اقوام متحدہ کی عمارت میں دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری قائم کی جانی چاہیئے۔ دہلی کی لفٹوں سے زیادہ اقوام متحدہ کی عمارت اِس اعزاز کی مستحق ہے ۔

اقوامِ متحدہ کا کردار بھی راستے میں بجلی فیل کر دینے اور مسائل کو لٹکائے رکھنے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ کشمیر کو لیجئے کہ گزشتہ چودہ سال سے اقوامِ متحدہ کی لفٹ میں کھڑا عام رائے شماری کی منزل تک پہنچنے کا منتظر ہے۔ جب بھی اس لفٹ میں حرکت کا احتمال پیدا ہوتا ہے اقوامِ متحدہ کے منشور کی بجلی کے تار کاٹ دیئے جاتے ہیں اور مسئلہ وہیں کا وہیں معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں کیا اقوامِ متحدہ عالمی لائبریری میں بدل دیئے جانے کی زیادہ مستحق نہیں ہے؟

رہا یہ سوال کہ بجلی اسی وقت کیوں فیل ہوتی ہے جب پنڈت نہرو لفٹ سے کام لے رہے ہوں تو عرض یہ ہے کہ ہر شخص کے ماتھے کا ایک اپنا ستارہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما ہیں بس میں بیٹھیں تو بس کا ٹائی راڈ ٹوٹ جاتا ہے۔ ریل گاڑی میں بیٹھیں تو ان کا ڈبہ پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کراچی جائیں تو ہوائی جہاز کو انجن کی خرابی کے باعث وہاڑی میں اترنا پڑ جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ پیدل بھی چلتے ہیں تو ان کا گھٹنا اتر جاتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ "السفر سقر" زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔

پنڈت نہرو کا بھی قریب قریب یہی عالم ہے۔ اوپر جانے کے لئے عمر بھر وہ لفٹ سے کام لیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے وہ مہاتما گاندھی سے لفٹ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہے مگر جب بھی انہیں لفٹ ملی بجلی فیل ہو گئی یعنی سبھاش بابو آدھمکے اور وہ جہاں تک پہنچے تھے وہیں ٹھک کر رہ گئے سیاسی سلسلہ میں انہوں نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں تاکہ وقت گزاری

کا کوئی مشغلہ تو اپنا سکیں اور لفٹ میں لائبریری قائم کر سکیں ۔

آزادی کے بعد بھی انہوں نے بڑی بڑی لفٹیں استعمال کی ہیں ۔ برنارڈ شا اور برٹرینڈرسل سے لے کر اسٹالن اور ماؤزے تنگ تک انہوں نے کس کس کو اپنی لفٹ کے لئے استعمال نہیں کیا ۔ مگر بجلی ہمیشہ فیل ہوئی اور ہمیشہ وہ درمیان ہی میں لٹکے رہ گئے ۔ درمیان میں لٹکنے کی انہیں عادت سی پڑ گئی اور یہیں سے ان کے خاص فلسفۂ غیر جانب داری کا آغاز ہوا کہ نہ ادھر کے ہیں نہ اُدھر کے ہیں ۔ اُوپر بھی دیکھ رہے ہیں ، نیچے بھی جھانک رہے ہیں اور دُنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے ، ان کی لفٹ میں بجلی آ ہی نہیں چکتی اور وہ کوئی فیصلہ کر ہی نہیں پاتے ۔ اسی لئے ہمارا خیال ہے کہ " نیمے دروں نیمے بروں " کا کلمہ لکھنے والے کی بھی شاید بجلی ہی فیل ہوئی تھی ۔

——— ۵ جولائی ۱۹۶۲ء

(۹)

ایک مقامی معاصر نے ریلوے کے وزیر مسٹر عبدالوحید خاں کا اس زمانے کا فوٹو شائع کیا ہے " جب آتش جواں تھا " یعنی جب وحید صاحب دیکھنے سے میلے ہوتے تھے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے یہ فوٹوگراف بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُتروایا تھا ۔ مگر یونہی رکھا رہا ۔ البتہ اب جا کر اس کا نصیب جاگا ہے ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس میں ریلوے کے وزیر صاحب کچھ ایسے معصوم سے نظر آتے ہیں کہ انہیں ریلوے کا آدھا ٹکٹ دینے کو جی چاہنے لگتا ہے

مگر ممکن ہے وحید صاحب کا یہ فوٹو گراف تازہ ہی ہو اور اس میں ان کے چہرے پر جو دمک نظر آتی ہے وہ عمر کی بجائے عہدے کی دمک ہو۔ عہدہ بھی تو بڑی مرغن غذا ہے۔ پھر دوسری غذاؤں کے مقابلے میں اس کا اثر یوں آناً فاناً ہوتا ہے کہ حلفِ وفاداری اُٹھانے کے بعد عہدے دار کو پہچانا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسی مکمل کایا کلپ ہوتی ہے کہ جھریوں پر استری پھر جاتی ہے لٹکی ہوئی جلد سکڑ جاتی ہے اور اچھا بھلا معتبر اور متین آدمی فلم کا ہیرو معلوم ہونے لگتا ہے۔

وحید صاحب کو ہمارا محبانہ مشورہ ہے کہ وہ محکمہ تعلقاتِ عامہ کو اپنا یہی فوٹو گراف بھجوائیں تا کہ جب بھی کسی اخبار میں ان کی تصویر چھاپنے کا محل پیدا ہو تو یہی تصویر چھپے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ شیخ خورشید احمد اور مسٹر عبدالقادر سنجرانی بھرپور جوان ہیں اور تصویروں میں ان کے قریب کھڑے ہوئے مسٹر عبدالوحید خاں ایسے لگتے ہیں جیسے تیز گام کے پاس ماڑی انڈس کھڑی ہو۔ اس صورت میں عنفوانِ شباب کی یہ تصویر بہت کام آ سکتی ہے۔ کیونکہ ان کی بالکل تازہ تصویروں میں ان کے چہرے پر امتدادِ زمانہ کے نقوش دیکھ کر لوگ یہی کہیں گے کہ تصویریں اُتارنے والے پریس فوٹو گرافر ہی نالائق ہیں۔

اِدھر ماڑی انڈس کا ذکر آیا ہے تو ہم نے سوچا کہ وزیرِ ریلوے مسٹر عبدالوحید خاں کی خدمت میں عوام کی ایک اتنی پرانی شکایت پہنچا دیں، جتنی پرانی خود ماڑی انڈس ہے۔ زمانہ قبل تاریخ سے اس گاڑی کا معمول یہ ہے کہ لاہور سے شام کو رینگتی ہے اور لائل پور، سرگودھا، جوہر آباد

وغیرہ مقامات پر مسافروں کو خوفناک راتوں کے سنّاٹے میں اُ آتی ماڑی کی طرف پھونک پھونک کر پہیے رکھتی ہوئی کچھ ایسے موڈ میں رواں رہتی ہے جیسے اسے کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔

۱۸۔ جولائی ۱۹۶۲ء

(۱۰)

ایک سیاسی جماعت کے چند کارکن کل اپنی جماعت کے نام کا ایک طویل و عریض اور حسین و جمیل بورڈ تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھے جماعت کے دفتر کی طرف جا رہے تھے۔ جب ساون کی ایک آوارہ بدلی کو شرارت سوجھی اور ٹوٹ کر برس پڑی۔ کارکنانِ کرام نے نئے نویلے بورڈ کو بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ انہوں نے اپنی قمیضیں اُتار کر بورڈ پر پھیلا دیں پھر خود بھی بورڈ پر پھیل گئے۔ مگر جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ بورڈ بھیگ گیا تھا۔ اور کارکنوں کے چہرے چھیچھڑے کی طرح لٹک پڑے تھے۔

بورڈ ہمیشہ دفتروں کی پیشانیوں پر لگائے جاتے ہیں اور یوں بارش میں بھیگتے، دھوپ میں تپتے اور آندھیوں میں آلودہ ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اس بورڈ کو کارکن حضرات یوں بچا رہے تھے جیسے بورڈ آٹے کا بنا ہوا ہے اور اس پر حروف شکر سے لکھے گئے ہیں۔ بظاہر یہ ایک بے ضرر سا واقعہ ہے لیکن دراصل اس میں ہماری سیاست کا پورا ذہن منعکس ہو رہا ہے۔ ہم جماعتوں کے بورڈوں کو بوندوں سے اور جماعتوں کو عوام سے بچاتے ہیں اور جب بورڈ بدرنگ ہو جاتے ہیں تو بورڈ نویسوں کی بجائے بوندوں کو، اور جب جماعتیں ناکام ہو جاتی ہیں تو لیڈروں کی بجائے عوام

کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔

پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت کو لے لیجئے، اِن کی تشکیل و تنظیم میں عوام کا اِتنا حصہ بھی نہیں ہے جتنا آٹے میں نمک کا حصہ ہوتا ہے۔ یُوں یہ جماعتیں بے نمک رہ جاتی ہیں۔ ان میں سے موٹر کاروں کے پٹرول کی بُو تو آتی ہے مگر ان سے بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نہیں اُٹھتی ان کے پروگراموں میں فیشن ایبل ریسٹورانوں کے چمچوں اور پلیٹوں کی آوازیں تو بلند ہوتی ہیں، مگر ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کی سرسراہٹ کہیں نہیں گونجتی۔ اِن میں مشینیں تو چلتی ہیں مگر ہل کہیں نہیں چلتا۔

آج یہ سب جماعتیں اپنے جھڑے ہوئے پروں کو اپنے جسم سے چپکانے کی کوشش کر رہی ہیں اور یہ نہیں سوچ رہی ہیں کہ گوند سے چپکے ہوئے پر تیز ہوا کے ایک ہی جھونکے سے جھڑ جائیں گے باقی لوتھڑا دھب سے زمین پر آ رہے گا اور اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہے گا جیسے گذشتہ ساڑھے تین سال میں پڑا رہا۔ سیاسی جماعتوں کو پر عوام مہیا کرتے ہیں اور جس جماعت کا تعلق عوام سے صرف اِتنا ہو جتنا لاہور کارپوریشن کا لاہور کی صفائی سے ہے۔ وہ اُڑتی بھی ہے تو اس طرح جیسے جنگ کے زمانے میں ہوائی چھتریوں کے ذریعے فضا سے اترنے والی فوجوں کی خبریں پڑھ کر بمبئی کے ایک سیٹھ نے اپنی چھتری کھول کر اپنے مکان کی ساتویں منزل سے چھلانگ لگا دی تھی اور جب وہ اُڑتا ہوا زمین پر آ رہا تھا تو اس کی روح اُس کے جسم میں سے کود کر ساتویں منزل

کو اُڑ گئی تھی۔

پاکستان کے عوام یقیناً بے حد شریف، نہایت نرم دل اور بلا کے سیدھے سادے ہیں مگر ان کی شرافت اور سادگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کے سابقہ کردار کو نہیں سمجھتے جب کوئی لیڈر پانچ دس ہزار حاضرین جلسہ سے اپنے حق میں نعرے لگوا لیتا ہے تو اسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ پاکستان میں ساڑھے نو کروڑ عوام بستے ہیں اور ایک کروڑ میں ہزاروں ہزار ہوتے ہیں۔ پاکستان کی قوت، اس کی عظمت، اس کی شوکت غرض پاکستان کا سب کچھ پاکستانی عوام سے ہے۔ مگر یہ کیسی سیاست ہے کہ اس کی رہنمائی صرف ایسے حضرات کے حصے میں آتی ہے جن کے پاس کروڑوں نہیں تو لاکھوں ضرور ہوں اور جو عوام کو سلام بھی کریں تو یوں کریں جیسے منہ پر سے مکھی اڑائی جاتی ہے۔

پاکستان کی سب سیاسی جماعتوں کی خدمت میں ہماری التجا ہے کہ وہ شخصیتوں کے پھیرے سے نکلیں شخصیتوں نے سیاسی جماعتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اب اگر کسی سیاسی جماعت کو زندہ رہنا ہے تو اسے براہِ راست عوام سے تعلق پیدا کرنا ہوگا اور اس تعلق کو حقیقی بنانا ہوگا کیونکہ غیر حقیقی تعلق کا تجربہ تو اس سے پہلے بھی بعض سیاسی حضرات کر چکے ہیں جب ان میں سے ایک نے کسی گاؤں کے قریب اپنی کار روکی تھی اور چند کسانوں کو بلا کر کہا تھا کہ آپ کے بچوں کو دھوپ میں کھیلتا دیکھ کر بڑا افسوس ہوا۔ میں لاہور جاتے ہی محکمہ جنگلات سے کہوں گا کہ وہ

آپکے گاؤں کے اردگرد گندم کے درخت لگا دیتے تاکہ بچے سائے میں کھیلیں۔

۲۴- جولائی ۱۹۶۲ء

(۱۱)

سُہروردی صاحب کی رہائی سے سارے ملک کو خوشی ہوئی ہے لیکن وہ لوگ بطورِ خاص مسرور ہوئے ہوں گے جو سہروردی صاحب کی طرح ایک نہ ایک دور میں قانونِ تحفظِ امنِ عامہ کے شکار ہوئے اور جن میں سے بیشتر کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر ان سے ایسا کونسا کام سرزد ہونے والا تھا جو اگر خدانخواستہ سرزد ہو جاتا تو امنِ عامہ کے منافی ہوتا۔ سابق نظربندوں کی اس خصوصی مسرت کی وجہ ظاہر ہے۔ دل کے درد کا اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے جس کے دل میں درد اُٹھ چکا ہو۔ بصورتِ دیگر لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ "سنا ہے آپکے دل میں درد اُٹھا ہے؟ آپ مونگ پھلی کیوں نہیں کھایا کرتے؟"

مگر سہروردی صاحب کی خصوصی نظربندی اور ہما شما عوام قسم کے لوگوں کی عوامی نظربندی میں بڑا فرق ہے۔ اور یہ فرق اتنا بڑا ہے جتنا لاہور اور چیچو کی ملیاں میں ہے۔ نظربندی کی یہ خصوصیت ہمیں سہروردی صاحب کی نظربندی ہی کے دوران میں نظر آگئی تھی مگر اس وقت دل لگی کا کوئی محل نہ تھا۔ اب کے سہروردی صاحب اپنے طوعاً اعیناً بیت جیل سے واپس آگئے ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں ان کی اور اپنی نظربندی کی داستانِ تفاوت پیش کرتے ہیں۔ اس کا مطالعہ سہروردی صاحب کے لیے اس لیے بھی مفید ہوگا کہ وہ زندگی میں شاید پہلی بار نظربندی کی بندشوں

سے گزرے ہیں۔ ہمارا وہ نہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ نظر بندی ایسی ہی ہوتی ہے حالانکہ نظر بندی ویسی بھی ہوتی ہے۔

سہروردی صاحب جیل کے جس کمرے میں نظر بند تھے وہ ایر کنڈیشنڈ تھا۔ ہم مانتے ہیں کہ ہم بھی جیل کے جن کمروں کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ وہ بھی ایر کنڈیشنڈ ہی تھے۔ فرق صرف اتنا سا تھا کہ اگر باہر گرمی تھی تو سہروردی صاحب کا کمرہ سرد تھا۔ مگر ہماری کوٹھڑی کی ایر کنڈیشنگ کا معیار یہ تھا کہ اندر کی "کنڈیشن" ویسی ہی ہوتی تھی جیسی باہر کی "ایر" ہوتی تھی۔ یعنی اگر باہر گرمی ہے تو اندر اُبال ہے اور اگر باہر سردی ہے تو اندر یخ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سہروردی صاحب کو اس انداز کی ایر کنڈیشنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سہروردی صاحب نے جیل میں "پالتو پرندے" پال رکھے تھے، ہمیں بھی بے شمار پلے پلائے "پرندے" مہیا کئے گئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ سہروردی صاحب کے پرندے طوطا مینا تھے، اور ہمارے "پرندے" "مچھر" تھے۔ سہروردی صاحب کے پالتو طوطا مینا میاں مٹھو بولتے تھے اور چُوری کھاتے تھے۔ ہمارے پالتو مچھر بولنے کی بجائے گاتے تھے اور چُوری کھانے کی بجائے خون پیتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ سہروردی صاحب نے غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک کا وہ مسلسل شور نہیں سُنا جو ان ایک ایک انچ لمبے قد آور مچھروں کے پروں سے برآمد ہوتا تھا، جیسے مچھروں کے لشکر نے اسکوٹروں پر سوار ہو کر یلغار بول دی ہے۔

سہروردی صاحب کے پاس ٹائپ رائٹر بھی تھا اور ریڈیو بھی تھا۔ ہم اپنی انگلیاں چٹخا کر ٹائپ رائٹر کا شوق پورا کر لیتے تھے اور اپنی خوفناک آواز میں حضرت قتیل شفائی کا یہ شعر گا کر ریڈیو بھی "سُن" لیتے تھے کہ :

اپنے حالات میں ہر کوئی مقید ہے یہاں
اب ضرورت نہیں اس دور کو زندانوں کی ،

ہمارا تو قلم بھی رکھوا لیا گیا تھا ہماری تو گھڑی بھی اُتروا لی گئی تھی راولپنڈی جیل میں منتقل ہونے سے پہلے پسنجر گاڑی کے انتظار میں ہمیں جب چھ سات گھنٹے کے لیے تھانہ نولکھا کی حوالات میں رکھا گیا تھا تو ہمارے جوتے بھی اتروا لئے گئے تھے اور ہماری عینک مال خانے میں داخل کر لی گئی تھی۔ ہم تو دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہن کر تھرڈ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوئے تھے اور یہ وہی ہاتھ تھے جنہوں نے پاکستان اور پاکستانی پرچم پہ کتنے ہی نغمے لکھے تھے اور جنہوں نے اُس نگری میں پاکستان کا پرچم بلند کیا تھا اور بلند رکھا تھا، جہاں ٹوانوں کا راج تھا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سہروردی صاحب ایک سیاسی لیڈر تھے۔ ایک شاعر نہیں تھے، ایک ادیب نہیں تھے۔ ایک اخبار نویس نہیں تھے۔ اگر خدانخواستہ وہ شاعر یا ادیب یا اخبار نویس ہوتے تو انہیں ہماری طرح چھوٹتے ہی "سی" کلاس ملتی اور یہ وہ کلاس ہے جس میں تکیے کے طور پر سر کے نیچے اینٹ کا ٹکڑا تک رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے شدت کی گرمیوں میں بھی ایک گندی مچھروں بھری کوٹھڑی کے اندر مونج کی دو ہاتھ تپڑی پر سونا ہوتا تھا

اور جب نظر بند صبح کو اٹھتا تھا تو مارے گرمی کے اَدھ بُھنا پلپلا سا کباب بن چکا ہوتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سہروردی صاحب اس قسم کی آزمائش میں سے نہیں گزرے، اور وہ جیسے گئے تھے ویسے ہی صحیح و سلامت واپس گھر آگئے ہیں۔ انہیں الزامات کی ایک عدد فہرست بھی مل گئی ہے، جس سے ہم محروم رہے۔ وہ کم سے کم الزامات کے متعلق سوچ تو سکتے تھے ہم تو الزامات "نا پیپر" بھی مرتب نہ کر سکے۔

۱۴- اگست ۱۹۶۲ء

جماعت اسلامی کے انتخابی منشور نے اور کوئی تیر مارا ہو یا نہ مارا ہو لیکن اس نے ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کو یہ ضرور بتا دیا ہے کہ منشور یوں چھاپے جاتے ہیں کتنا دبیز سفید کاغذ ہے! کتنا خوبصورت ٹائپ ہے! سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کی کتنی نفیس ترتیب ہے! ہم نے بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے منشور دیکھے ہیں، مگر ان میں جماعت اسلامی کے انتخابی منشور کا سا حسنِ جہاں سوز کہاں۔ دوسری جماعتیں کیا کھا کر ایسا منشور جاری کریں گی۔ وہ تو بازار سے ایسا کاغذ خریدنے جائیں تو خون تھوکتی ہوئی واپس آئیں۔

اگر آپ منشور کے صوری حسن پر یہ مصرع گنگنا دیں کہ ؏

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا

تو ہم آپ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ منشور کا یہ خانہ بھی خالی نہیں۔ مثلاً کیا منشور کا یہ ارشاد آپ کے نزدیک ایک انکشاف کی حیثیت نہیں رکھتا کہ معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا تصور غیر ملکی، غیر اسلامی اور درآمد شدہ ہے۔ یقین نہ آئے تو منشور کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

(موجودہ اربابِ حکومت کی طرف سے) جس مقصد کی نشان دہی کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔ مگر یہ ایک درآمد شدہ مقصد ہے، جو بیرونی ممالک کے لوگوں سے سن کر یہاں لے آیا گیا ہے یہ ہماری روایات اور

ہمارے نظامِ فکر کی پیداوار نہیں ہے"

یہ بات بھی نہیں کہ عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کو گناہ قرار دے کر جماعت اسلامی الگ ہو گئی ہو۔ جی نہیں۔ وہ مخاطبین کو اُوپر لے جا کر خلا میں نہیں چھوڑ دیتی بلکہ انہیں واپس زمین پر پٹخ دینے کی قائل ہے۔ اِس کے منشور کا کہنا ہے کہ "ہمارے نزدیک حکومت کو معیارِ زندگی سے پہلے' اور اس سے بڑھ کر معیارِ آدمیت بلند کرنے کی فکر ہونی چاہیئے"۔۔۔۔۔۔ خدارا جماعتِ اسلامی کو یہ سمجھانے نہ بیٹھ جایئے گا کہ معیارِ زندگی کی اجتماعی بلندی ہی آدمیت کو بلند کر سکتی ہے اور عزّت مندانہ زندگی بسر کرنا بھی آدمیت ہی کی ایک شاخ ہے۔ یہ بھی نہ کہیے گا کہ "پیٹ نہ پئیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں"۔ اسے یہ بھی نہ یاد دلایئے گا کہ دمشق میں قحط پڑا تھا تو یار لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔ یہ عرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ جن صاحب نے یہ منشور لکھا ہے اُنہوں نے روٹی کھا کر اور "معیارِ زندگی بلند" کر کے ہی قلم ہاتھ میں لیا ہوگا۔ یہ سب کچھ اس لیے نہ کہیئے گا کہ ؏

چاندنی لگ جائے گی میلا بدن ہو جائے گا

منشور کے "سیرتی" پہلو کی کہاں تک نقاب کشائی کی جائے ؏
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

لیکن مشتے نمونہ از خروارے۔ عرض یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے "عام معاشی اصلاحات" کی ذیل میں "پرانی سڑکوں کی مرمت" کو بھی اپنے منشور میں شامل کیا ہے۔ یعنی اگر آئندہ انتخابات میں جماعت برسرِ اقتدار آگئی تو پرانی سڑکوں کی مرمت شروع کرے گی۔ مگر خیر عوام کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دردِ سر محکمہ تعمیرات عامہ کا ہے۔ وہ جانے اور جماعت اسلامی جانے۔

"صنعتی پالیسی" کے تحت منشور میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ کارخانوں میں مردوں اور عورتوں سے یکجا کام لینے کی ممانعت کر دی جائے گی۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی حکومت میں جو شخص ایک کارخانہ کھولنے کا ارادہ کرے گا اسے دو کارخانے کھولنا ہوں گے۔ ایک مردوں کے لیے ایک عورتوں کے لیے۔ دوسرا ممکن مطلب یہ ہے عورتوں کو مزدوری کرنے کی بجائے فاقوں مرنے کا مشورہ دیا جائے گا تاکہ منشور کی پابندی کی جاسکے۔

چلتے چلتے منشور کے اس حصے کی بھی ایک جھلکی ملاحظہ فرمالیجئے۔ جہاں خارجہ پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے کہ پانچ بڑی طاقتیں ہر مسئلے کو سامراجی مفاد اور استعماری حوالوں کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہیں" اور "کشمیر، الجزائر، فلسطین اور ہنگری کے معاملے میں ان کے متضاد ردعمل نے اس حقیقت کو عالم آشکارہ کر دیا ہے۔"

ٹھیک ہے، کر دیا ہے۔ مگر منشور میں مصر اور یمن اور عمان کے معاملے میں کون سی حقیقت کو "عالمِ اخفا" میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور سے مصر پر حملے کی گونج تو آج بھی بین الاقوامی سیاست کے ضمیر میں دندناتی پھر رہی ہے۔ پھر جماعت اسلامی کو اس کا نام لینے کی توفیق کیوں نہ ہوئی؟ منشور میں پانی ایک تو یہاں مر رہا ہے اور ایک زرعی اصلاحات کے گڑھے میں ——— مگر اس ذکر کو کسی آیندہ صحبت پر اُٹھا رکھیے۔

(۱۲ جولائی ۱۹۵۸ء)

○

شاید کوئی بڑے سے بڑا جوتشی بھی نہیں بتا سکے گا کہ پاکستان کی ہتھیلی پر عام انتخابات کی لکیر ہے یا نہیں ہے۔ اس سے پہلے جوتشیوں نے عام انتخابات کی جس اُبھرتی ہوئی لکیر کا مژدہ سنایا تھا، وہ "خاص" انتخابات کی لکیر ثابت ہوئی۔ یعنی "ڈائرکٹ الیکشن"، "انڈائرکٹ الیکشن" میں بدل کر رہ گئے۔ وہ تو خُدا کا شکر کیجیے کہ بات انڈائرکٹ الیکشن پر ہی ٹل گئی۔ ورنہ اس وقت کے وزیرِ قانون اور اس وقت کے "قائدِ پاکستان" مسٹر سہروردی تو سارے مُلک پر مارشل لا مسلط کرنے کی اسکیم سوچے بیٹھے تھے۔ بہرحال ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

ہم چوہدری محمد علی، مسٹر سہروردی اور مسٹر چندریگر ایسی شخصیتوں کی نیتوں پر شبہ

نہیں کرتے۔ بلا شبہ یہ حضرات اپنے اپنے زمانہ وزارتِ عظمیٰ میں عام انتخابات کی خاطر لختِ دل کھاتے رہے اور خونِ جگر پیتے رہے۔ مگر آخر وہ انسان ہیں اور انسان ترقی کر کے وزیرِ اعظم بھی بن جائے تو جب بھی وہ عناصرِ اربعہ پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اِدھر چودھری محمد علی نے عام انتخابات منعقد کرنے کا وعدہ کیا اُدھر ساون کی جھڑی لگ گئی اور چودھری صاحب کے کیے کرائے پر پانی پھیر گئی۔ مسٹر سہروردی نے ٹوکیو سے واشنگٹن تک پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے ڈنکے بجائے مگر جب واپس پاکستان تشریف لائے تو بادل گرجا، بجلی چمکی، جل تھل ایک ہو گئے۔ اور انتخابات کا وعدہ بھی کراچی کی کسی گندی نالی میں بہتا ہوا بحیرہ عرب میں جا گرا۔ رہے مسٹر چندریگر تو وہ وزیرِ اعظم بنے۔ حیدرآباد میں سامان ڈھونے والے ٹرک کی چھت پر بیٹھ کر اپنا جلوس نکلوایا۔ انتخابات کا وعدہ کیا۔ پھر کیا ہوا کہ یکایک ایک بگولا اٹھا اور مسٹر چندریگر نے پلٹ کر کراچی کی طرف دیکھا تو ان کا استعفیٰ منظور ہو چکا تھا۔ اب بتایئے کیا انتخابات کے سلسلے میں ان معصوموں پر کوئی الزام عاید ہو سکتا ہے؟

ملک نون کا زمانہ آیا تو نومبر نومبر کی رٹ یوں لگی جیسے نومبر آیا تو یا نومبر نہیں ہو گا یا انتخابات نہیں ہوں گے اور ہوا بھی یہی۔ ملک نون نے ایک کُل جماعتی کانفرنس بُلائی جس نے طے کیا کہ نومبر تو آئے گا مگر انتخابات کی نوبت نہیں آئے

گی۔ اِس لیے بات فروری پر ٹال دی گئی اور یُوں ٹالی گئی ۔ جیسے فروری آیا تو یا فروری نہیں ہوگا یا انتخابات نہیں ہوں گے ۔ یعنی ؏

یا آج سر نہیں یا آستانِ یار نہیں

اِس کل جماعتی کانفرنس کے سلسلے میں جس قومی اِتحاد کا مظاہرہ ہوا تھا، اِس کی مثال تاریخِ پاکستان میں مشکل ہی سے ملے گی ۔ وہ لیڈر جو نہ طریقِ اِنتخاب پر متفق ہو سکتے ہیں نہ زرعی اصلاحات پر، جو نہ گرانی کو دُور کرنے کے لیے متحد ہو سکتے ہیں، نہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف، اِنتخابات کو ٹالنے کے سلسلے میں یوں یک جان دو قالب ہو گئے کہ اِن دنوں اگر ملک نون کے چُٹکی لی جاتی، تو مولانا مودودی اپنی ٹانگ کھُجانے لگتے ۔ اور اگر محمود الحق عثمانی سے السلام علیکم کہا جاتا، تو وعلیکم السلام کے الفاظ چودھری محمد علی ادا کرتے ۔ یعنی بالکل ع

تیری میری اِک جندڑی ،
تینوں تاپ چڑھے مَیں ہُونگاں

والا نقشہ پیدا ہو گیا تھا۔

(۱۸ اگست ۱۹۵۸ء)